امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کے بنیادی اصول وضوابط، متعلقہ احکام ومسائل

مقدمہ:

حضرت مولانا [illegible]

[illegible]

تاثرات:

حضرت مولانا [illegible] حقانی [illegible]

تالیف:

مفتی [illegible]



مکتبہ فریدیہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کے بنیادی اُصول وضوابط،
متعلقہ مسائل واحکام

مقدمہ

حضرت مولانا محمد سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم

صدر مدرس دار العلوم انوار القرآن نرشک، مردان

تاثرات

حضرت مولانا عبد الباقی حقانی صاحب دامت برکاتہم العالیۃ

تالیف

بندہ عبید الرحمن عفی عنہ

فہرست عنوانات

عنوان | صفحہ نمبر

مقدمہ

حضرت مولانا سجاد الحجابی صاحب (زید مجدہم ودامت برکاتہم)

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله ربّ العٰلمين، والصلاة والسلام على سيدنا محمد سيد الأولين والآخرين، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين: وبعد:

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [سوره آل عمران104]

"تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہونگے۔" (ترجمہ حضرت تھانوی صاحب)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"إن الله لا يعذب العامة بعمل الخاصة، حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم، وهم قادرون على أن ينكروه فلا ينكروه، فإذا فعلوا ذلك، عذب الله الخاصة والعامة۔"

"حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ بعض افراد کے (ناجائز) عمل کی وجہ سے تمام افراد کو عذاب نہیں دیتا، مگر جب کچھ لوگ (کوئی ایسی گناہ) کرنا شروع کرے جس کو (معاشرہ کے) دیگر لوگ ختم کر سکتے ہوں اور اس کے باوجود ختم نہ کریں تو (ایسے وقت میں) اللہ تعالیٰ عام وخاص سب لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔"[1]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"والذي نفسي بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليعمنكم الله بعقاب من عنده ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم"

"اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی طرف سے ایسی عذاب میں مبتلا کرے گا، پھر تم اس سے دعا مانگو تو وہ قبول نہیں فرمائیں گے۔"[2]

اور اِس تناظر میں رسول اللہ ﷺ کا ایک اور قیمتی ارشاد گرامی پیش کرتا چلوں جو ثلث الاسلام کی حیثیت رکھتا ہے، اور اپنی ذات میں ایک جامع ترین ارشاد ہے، یہی وجہ

---

[1] أخرجه الإمام أحمد في مسنده(192/4)والطبراني في الكبير(138/17)

[2] أخرجه ابو عمرالداني في "السنن الواردة في الفتن"(330) وانظر أيضا: الفتح المبين في شرح الأربعين لابن حجر الهيثمي، ص540، ناشر: دارالمنهاج جُدّة

ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب" الأربعين "میں اس کا ذکر کیاہے، چنانچہ صحابی جلیل حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا:

"من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان"

" کہ جو شخص تم میں سے کوئی بات شریعت کے خلاف دیکھے تو وہ ہاتھ سے اس کو بدل دے ،اگر ایسا ممکن نہ ہو تو زبان سے ایسا کرے ،اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے ہی اس کو برا جانے ،مگر یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔[1]

امام ابنِ حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے احکام ۶ قسم کے ہیں: ۱ واجب۔ ۲۔ حرام ۔ ۳۔ مندوب۔ ۴۔ مباح۔ ۵ مکروہ تحریمی۔ ۶۔ مکروہ تنزیہی۔

اور چونکہ اس حدیث سے پہلا حکم یعنی واجب (الامر بالمعروف) اور دوسرا حکم یعنی حرام (ما يجب النهى عنه) ثابت ہوتا ہے ، اسلئے اس حدیث سے اسلام کے تہائی حصے کے احکام معلوم ہوتے ہیں۔[2]

اس جامع حدیث سے جو آداب واحکام مستنبط ہوتے ہیں وہ چند یہ ہیں:

۱۔ منکر ختم کرنے کا وجوب

۲۔ منکر ختم کرنا ہر اس شخص پر ضروری ہے جس کو اس کے بارے میں علم ہو اور اس کو ختم کرنے پر قدرت حاصل ہو۔

---

[1] أخرجه الإمام مسلم: رقم الحديث 49

[2] الفتح المبين بشرح الأربعين للهيثمي: 549

۳۔ منکر ختم کرنے کے مختلف مراتب اور درجات ہیں۔

۴۔ معصیت ختم کرنے کا سب سے اُونچا درجہ یہ ہے کہ اس کو ہاتھ سے ختم کیا جائے جہاں اس کی ضرورت ہو۔

۵۔ دوسرا درجہ زبان سے اس کو ختم کرنا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جس معصیت کا ارتکاب کیا جارہا ہو اس کا شرعی حکم بیان کیا جائے اور اس کے مرتکب کو توبہ کی ترغیب دیدی جائے۔

۶۔ تیسرا رُتبہ دل سے معصیت پر نکیر کرنا ہے یعنی دل ہی دل میں اس پر ناراضگی کا اظہار کرے اور اس کو ختم کرنے کا عزم کیا جائے۔

۷۔ ان تینوں درجات میں ترتیب کا لحاظ کیا جائے، یعنی اوّلاً ہاتھ سے منکر کا ازالہ کیا جائے، اگر اسکی طاقت نہ ہو تو زبان پر، ورنہ تو دل سے نکیر پر اکتفاء کیا جائے۔

۸۔ جس شخص نے اپنی قدرت واستطاعت کے لحاظ سے کوئی بھی صورت اختیار کرلی تو اس کا ذمہ بری ہو گیا۔

۹۔ منکر کو ختم کرنا ایمان کا حصہ ہے۔

۱۰۔ استطاعت رکھنے اور نہ رکھنے سے واجب مختلف ہوتا ہے۔

۱۱۔ ہاتھ کے ساتھ انکار کرنے سے کوئی عذر مانع نہیں۔

۱۲۔ اس ذمہ داری کے واجب ہونے کا دار مدار قدرت پر ہے، اگر کوئی شخص بالکل ہی عاجز ہو تو اس پر یہ ذمہ داری لازم نہیں ہو گی۔

۱۳۔ جو شخص دل سے بھی کسی منکر پر نکیر نہ کرے اس کا ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں۔

۱۴۔ خیال رہے کہ نکیر کرنے سے مقصود منکر ختم ہونا ہے ، لہٰذا اگر یہ

نکیر کسی بڑے منکر کا سبب بن رہی ہو تو اس صورت میں خود یہ انکار ہی منکر بن جائے گا۔

۱۵۔ اس حدیث سے احکامِ اسلام کی آسانی کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قدرت نہ ہو تو مکلف بھی نہیں۔

اس جیسے کئی اور فوائد بھی اس حدیث سے نکل سکتے ہیں۔

یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ ایسا نہیں ہے کہ اگر داعی خود کامل الحال اور عامل نہ ہو تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قابل نہیں، بلکہ اگر ان کے ہاں اس طرح کمزوریاں ہوں تب بھی اس پر یہ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرنا ضروری ہے۔

اس حوالے سے حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قال العلماء: ولا يشترط في الآمر بالمعروف والناهي عن المنكر أن يكون كامل الحال، ممتثلاً ما يأمر به. مجتنباً ما ينهى عنه بل عليه الأمر. وإن كان مرتكباً خلاف ذلك لأنه يجب عليه شيئان: أن يأمر نفسه وينهاها. وأن يأمر غيره وينهاها. فإذا أخل بأحدهما لا يسقط عنه الآخر۔"

"علماء کرام فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود اس معروف پر عمل کرنے والا ہو جس کا دوسروں کو حکم دے رہا ہے اور جس منکر سے روک رہا ہو، اس سے خود بھی رُکنے والا ہو، (ایسا نہیں ہے) بلکہ امر بالمعروف کرنا ضروری ہے، اگرچہ خود اپنا عمل اس کے خلاف ہو۔ کیونکہ یہاں درحقیقت دو چیزیں ضروری ہیں ایک اپنے نفس کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، اور دوسری ذمہ داری لوگوں کو نیکی کی ترغیب اور برائی سے منع کرنا ہے، اب اگر دونوں میں

سے ایک حکم میں کوتاہی ہوجائے تو اسکی وجہ سے دوسرا حکم ساقط نہیں ہوگا۔"[1]

آج کل بعض حلقوں میں ایک بات مشہور ہوگئی ہے کہ ہر مسلمان تبلیغ نہیں کرسکتا اور عمومی طور پر جو مسلمان تبلیغ کا کام کر رہے ہیں، اس پر نکیر کرتے رہتے ہیں جو نامناسب ہے۔ اس تناظر میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی پیاری بات کہہ گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"قالوا: ولا يختص الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر بأصحاب الولاية بل ذلك ثابت لآحاد المسلمين، وإنما يأمر و ينهى من كان عالماً بما يأمر به وينهى عنه، فإن كان من الأمور الظاهرة مثل: الصلاة والصوم والزنا وشرب الخمر ونحو ذلك، فكلُّ المسلمين علماء بها وإن كان من دقائق الأفعال والأقوال وما يتعلق بالاجتهاد ولم يكن للعوام فيه مدخل فليس لهم إنكاره بل ذلك للعلماء."

"علماء کرام نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ارباب اختیار کے ساتھ خاص نہیں ، بلکہ عام مسلمانوں کو بھی اس کا اختیار حاصل ہے، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اسی شخص کا کام ہے جس کو اس نیکی اور برائی کا علم ہو، (لہٰذا) اگر وہ عام اور مشہور مسئلہ ہو مثلاً نماز و روزے کا فرض ہونا، شراب حرام ہونا وغیرہ ، تو (چونکہ) تمام مسلمانوں کو اس کا علم ہے (اس لئے اس کی امر و نہی کرنا سب پر ضروری ہے) اور اگر قول و فعل یا اجتہاد

[1] شرح الأربعين النووية لابن حجر العسقلانى (١٩٥)

کے متعلق کوئی باریک مسئلہ ہو جس کا عوام کو درک نہیں تو اس کا اختیار علماء کو حاصل ہے عوام اس کے مجاز نہیں۔"[1]

ان نقول سے واضح ہو رہا ہے کہ تبلیغ کیلئے کامل علم ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس مامور اور منہی عنہ کو دیکھ کر تبلیغ کی جاسکتی ہے جیسا کہ داعی اگر عامل نہ بھی ہو تب بھی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔

میری غرض یہ نہیں کہ داعی کیلئے عمل کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ داعی کیلئے تو عمل اور بھی ضروری ہے تاکہ اثرِ بالغ ہو، چنانچہ احادیث مبارکہ میں یہ مضمون متعدد روایات میں وارد ہوا ہے کہ بے عمل داعی اور عالم کو کڑی سزا دی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"يجاء بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار، فتندلق أقتابه في النار، فيدور كما يدور الحمار برحاه، فيجتمع أهل النار عليه فيقولون: أي فلان ما شأنك؟ أليس كنت تأمرنا بالمعروف وتنهانا عن المنكر؟ قال: كنت آمركم بالمعروف ولا آتيه، وأنهاكم عن المنكر وآتيه۔"

"قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا پھر اسے جہنم میں ڈالا جائے گا تو اس کی آنتیں آگ میں نکل پڑیں گی ، پس وہ اس طرح گردش کرے گا جس طرح گدھا ایک چکی کو لے کر (اس کے گرد) گھومتا ہے ، جہنمی اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ اے فلاں تیرا یہ حال کیوں ہے؟ کیا تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا نہ تھا؟ وہ کہے گا (ہاں) میں تمہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا تھا مگر خود اپنی باتوں پر عمل نہ کرتا تھا اور تم کو بری

---

[1] شرح الأربعين النووية لابن حجر العسقلانی (١٩٤ ، ١٩٥)

باتوں سے روکتا تھا مگر خود برائیوں میں مبتلا تھا۔"[1]

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

رأيت ليلة أسري بي رجالا تقرض شفاههم بمقارض من نار فقلت من هؤلاء يا جبريل فقال الخطباء من أمتك يأمرون الناس بالبر وينسون أنفسهم وهم يتلون الكتاب أفلا يعقلون-". [2:3]

" میں نے معراج کی رات میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے ہیں ، میں نے پوچھا کہ جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں، اُنہوں نے کہا کہ یہ آپ (ﷺ) کی اُمت کے وہ واعظ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کی تلقین کرتے تھے مگر خود اپنی ذات کو فراموش کردیتے تھے، یعنی خود تو عمل نہیں کرتے تھے لیکن اوروں کو عمل کی تلقین ونصیحت کرتے تھے۔"[2]

البتہ داعی کیلئے ضروری ہے کہ حق بات کو حق اور مثبت انداز میں پیش کرے ، تب انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا۔

داعی کی صفات کے حوالے سے ہمارے مخدوم مؤلف نے تفصیل سے لکھا ہے، بندہ اس سے تعرض نہیں کرتا۔ البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سرانجام دینے کیلئے اسلاف اُمت نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔

---

[1] أخرجه البخارى فى صحيحه، كتاب بدءالخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة، رقم الحديث: 3267

[2] أخرجه ابن حبان في صحيحه:(53)وأبو يعلي في مسنده(3992)

ایک داعی کے لئے امر بالمعروف کرنا کتنا ضروری ہے؟ اور اس سلسلہ میں ہمارے اکابر واسلاف کتنے کٹھن مراحل سے گزرے؟ اس حوالے سے امام ابوالحسن بنان بن محمد الزاہد کا ایک دلچسپ واقعہ ذکر کرتا چلوں جو مصر کے ایک بادشاہ "احمد بن طولون" کے ساتھ پیش آیا:

"ابو جعفر دینوری نے کہا کہ میں تجھے پورا واقعہ سناتا ہوں:

احمد بن طولون اندھوں کی طرح تلوار چلانے والا شخص تھا، وہ بے جا ظلم کرتا اور لوگوں کا مال ناحق زبردستی لیتا تھا، جن لوگوں کا اس نے سر تن سے جدا کیا یا جو خود اس کے جیل خانہ میں مر گئے، ان کی تعداد ۸ ہزار تک پہنچتی ہے، میرے شیخ ابوالحسن بنان جب احمد بن طولون کی سرزنش کیلئے اور اس کو نیکی کی نصیحت کرنے کیلئے تشریف لے گئے تو اس پر ابن طولون آگ بگولا ہو گئے اور حکم دیا کہ ابوالحسن بنان کو شیر کے سامنے ڈال دیا جائے۔ یہ خبر دنیا میں آگ کی طرح پھیلی، یہاں تک کہ بغداد کو بھی پہنچ گئی، ابن طولون نے اپنے فرمانرواوں کو جس دن یہ حکم جاری کیا اس دن میں (ابو جعفر دینوری) وہیں حاضر تھا۔ خمارویہ بن احمد بن طولون کے محل سے شیر کو لایا گیا، خمارویہ کو شکار کا انتہائی شوق تھا، وہ جب کسی گنجان جنگل یا کسی وادی میں درندے کی آواز سنتا تو اس کی تلاش میں نکل جاتا، اس کے پاس کچھ لبادہ اوڑھے ہوئے ایسے آدمی ہوتے تھے جو شیر کے پاس پہنچتے اور اپنے زور بازوں اس شیر کو صحیح سالم پکڑ کر لکڑی کے (لمبے) پنجرے میں ڈال دیتے تھے جس میں شیر کھڑے ہونے کی حالت میں بھی سما سکتا تھا۔

چنانچہ خمارویہ کے پاس جتنے شیر جمع تھے ان میں ایک سب سے زیادہ غصہ ناک، جسم وجسامت کے اعتبار سے سب سے موٹا، زیادہ

چیر پھاڑ کرنے والا، گوشت و پوست سے لبریز مضبوط اعضاء اور کھلے قبرستان کی مانند کشادہ منہ والا تھا۔

احمد بن طولون کے فرمانبرداروں نے شیخ ابوالحسن کو ایک میدان میں بٹھایا، لوگ آپ کا تماشا اُوپر سے دیکھ رہے تھے، فرمانرواوں نے پنجرے کو اُوپر کی جانب سے کھولنا شروع کیا، جب اُوپر کی جانب سے دروازہ کھینچا تو وہ کھل گیا، پھر اُنہوں نے شیر کو دھتکارنا شروع کر دیا اور آوازیں کسنے لگے، اس پر شیر نے اپنی گرج دار آواز میں چنگھاڑنا شروع کیا ، جس سے کلیجے پھٹنے کو تھے، سننے والے محسوس کر رہے تھے کہ گویا آسمان میں گرجنے کے بعد بجلی کی آواز ہے، (اس سے) دل وحشت زدہ تھے اور رونگٹے کھڑے ہوئے۔ شیر انگڑائیاں لیتا ہوا اس طرح چلا جیسا کہ منجنیق نے کوئی پہاڑ پھینکا ہو، شیخ کے لقمہ اجل بننے میں بس آنکھ جھپکنے کی دیر تھی۔

دوسری طرف ہم نے شیخ کو اطمینان کے ساتھ آنکھیں نیچے کیا ہوا پایا، آپ شیر کی طرف دیکھ رہے تھے، نہ ہی اس طرف سے کوئی رُعب تھا۔ انسانی شفقت کے مارے میں ہماری یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ دل پھٹ جائے۔ لیکن (ان تمام ہولناک اور خوفناک صورتحال کے باوجود) حیرانی ہمیں اس بات کی ہو رہی تھی کہ شیر وحشیانہ پن سے غافل نظر آ رہا تھا ،حالانکہ کئی دنوں سے بھوکا رکھا گیا۔

کیا دیکھتے ہیں کہ شیر اپنی دُم کے بل بیٹھا اور کچھ دیر زمین کے ساتھ چمٹ گیا، اپنے بازوں کو پھیلایا اور پھر وہاں سے اس حالت میں اُٹھا جیسے کہ وہ شیر ہے ہی نہیں۔ اپنے بھاری بھر قدموں کو اُٹھاتا ہوا آہستہ چلنے لگا ، قوت اور جسامت کی وجہ سے اس کے جوڑوں سے کڑکڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی، اپنے آپ کو شیخ کی طرف متوجہ کر کے رگڑنے لگا اور اس کو ایسا ہی سونگھا جیسا کہ

کتا اپنے مانوس مالک کو سونگھتا ہے۔ گویا وہ اپنے اس (خلافِ فطرت) طرزِ عمل سے اس بات کا واضح اعلان کر رہا تھا کہ خدا کے اس پرہیزگار بندے اور شیر کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں چاہتا، اگر کچھ نزاع ہے تو وہ ابن طولون اور اللہ تعالیٰ کے ارادوں میں ہے، شیر نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی شخصیت دیکھی تو خود اس سے ڈر گیا۔

دینوری کہتے ہیں کہ ہم نے شیر سے اپنی آنکھیں شیخ بنانی کی طرف پھیری تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ماتھے پر بل ڈالے بغیر کسی گہرے سوچ میں پڑے ہوئے ہیں، اسی حالت میں شیخ کو اُٹھایا گیا۔ ہم میں سے ہر کوئی شیخ کے اس غور و فکر (کا زاویہ معلوم کرنے) کے متعلق اپنے عقلی گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

کسی نے کہا: (شیر) کے ڈرنے ان کو اپنے رب سے غافل کر دیا ہے۔ کسی نے کہا: شیخ موت کی طرف متوجہ ہے، لیکن وہ نہایت پر سکون سوچ میں گم ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ استغراق کی حالت ہے جس کے ذریعے شیر پر جادو کیا گیا۔ اکثریت اسی رائے سے متفق تھی۔ ہم ان ہی (بے بنیاد) تخمینوں میں مصروف تھے کہ اچانک کسی نے شیخ سے پوچھا کہ اس وقت آپ کے دل میں کیا تھا؟ اور کس چیز کے متعلق آپ سوچ رہے تھے؟ شیخ نے جواب دیا: مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی ،میں تو شیر کے لعاب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ پاک ہے یا نا پاک؟ اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟"[1]

دیکھئے! ہمارے اسلاف نے اسلام کے پھیلانے، دعوت اور امر بالمعروف اور

[1] المختارمن فرائد النقول والاخبار للشیخ المحقق محمدعوامہ: ص ۸۲

نہی عن المنکر میں کتنا بڑا کردار ادا کیا، ان کی قربانیاں دیکھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے "تاریخ مشائخ چشت" میں خواجہ معین الدین اَجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ایک عجیب بات تحریر فرمائی ہے ، جسے دیکھ کر ہم جیسے کوتاہ فہم وسیاہ کار کے دلوں سے ان بزرگوں کیلئے دعاء نکلتی ہے، حضرت شیخ الحدیث صاحب لکھتے ہیں:

"خواجہ معین الدین کے والد کا نام "غیاث الدین سنجزی تھا۔آپ کی پیدائش باتفاق اہل تواریخ سن ۵۳۷ھ کو ایران کے علاقہ سیستان قصبہ سجز میں ہوئی۔آپ ہندوستان کے امام الطریق تھے، آپ ہی سے ہندوستان میں علوم معرفت کاافتتاح ہوا اور سلسلہ چشتیہ ہندوستان میں آپ ہی سے پھیلااور ہندوستان میں نوّے لاکھ آدمی آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔"[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے رفیقِ کار عزیزم مولانا عبید الرحمن صاحب زِیدَ مجدہم کو جنہوں نے مسئلہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" پر علمی انداز میں قلم اُٹھایااور اپنی بحث میں بہترین معلومات، متعلقات امر بالمعروف کوذکر جزئیات کی حدتک سمیٹنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

مجھ کم فہم کے اندازے کے مطابق اُردو زبان میں پہلی مرتبہ اس موضوع پر علمی انداز میں قلم اُٹھایا گیااور مؤلف حفظہ اللہ کافی حدتک اس میں کامیاب بھی رہے۔

مجھے جناب مؤلف سے ایک اور التماس بھی کرنی ہے کہ جس طرح اُنہوں نے اِس موضوع پر سلجھے ہوئے انداز میں لکھا تو ایک جامع تحریر مسئلہ "بدعت" پر بھی اُردو

---

[1] دیکھئے: تاریخ مشائخ چشت، تالیف حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ: ص۱۶۵، ناشر: مجلس نشریات اسلام کراچی

میں لکھ دے اور مختلف زاویوں سے بدعت کے اقسام وغیرہ پر مدلّل بحث کرے۔[1]

راقم اثیم نے مسودہ کو جستہ جستہ مقامات سے مطالعہ کیااور انداز کو سلجھا ہوا اور سنجیدہ پایا، اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور راقم کیلئے یہ چند سطور باعث اجر وثواب فرماویں۔

ربیع الثانی ١٤٣٦ وقت الظهر

هذا ما عندى والله هو الموفق

بداره الفانية

سجاد الحجابی

خادم العلوم والفنون بمدینۃ مردان المحروسۃ

---

[1] چنانچہ بعد میں حضرت مؤلف مدظلہ نے مختلف دیگر وجوہات کی وجہ سے اُردو کے بجائے عربی میں بدعت کے موضوع پر ایک رسالہ بنام ''فقه البدعة فی الشريعة الإسلامية'' لکھا جو طبع شدہ ہے۔

تاثرات

حضرت مولانا عبدالباقی صاحب زید مجدہم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی وبعد:

اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اپنے بندوں کی رشد و ہدایت کے لیے انبیاءؑ کے بعد علماء کرام کا انتخاب فرمایا اور انہیں انبیاءؑ کا وارث قرار دیا۔ علماء کرام لوگوں کی دینی مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں، ان کی مثال طبیب جیسی ہوتی ہے، ماہر اور عقلمند طبیب وہ ہوتا ہے جو مریض کو اس کے مرض کے مطابق دوا دے، اس کی بیماری کو سامنے رکھ کر اس کا علاج کرے تاکہ اس کا علاج کامیاب اور بہتر رہے۔

مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بسا اوقات مستقل تالیفات درکار ہوتی ہیں جو ہر ایک عالم کا کام نہیں اور بعض علمی میدان ایسے بھی ہیں جس میں قدم رکھنا ہر مؤلف کا کام نہیں، وہ خاص علماء ہی کا کام ہوتا ہے جو مسلمانوں کی موجودہ دینی مشکلات کو سمجھ کر اس کا حل نکال سکتے ہیں۔

کچھ وقت پہلے ایک جید عالم دین اور ممتاز مؤلف جناب مفتی عبید الرحمن صاحب کی دو کتابیں: "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اور "غیر مسلم کے ساتھ مختلف نوعیت کے تعلقات" دیکھنے کا موقع ملا، ماشاءاللہ! ان کی اس پہلی تحقیقی تالیف کو دلفریب، جید، عام فہم اور معاصر ضرورتوں کے مطابق پایا، آج کل اس قسم کے مؤلفین کم یاب ہیں جو ماحول اور ضرورت کے مطابق لکھ سکیں، لہذا ایسے نوجوان مؤلفین کی کتابیں زیادہ قابل اعتناء ہوتی ہیں، مناسب یہ ہے کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے، میں اُمید رکھتا ہوں کہ

حضرت مفتی صاحب اسی طرح دیگر معاصر ضروری موضوعات پر بھی قلم اُٹھائیں گے جس سے لوگوں کی دینی ضروریات کی تکمیل ہو سکے گی۔(ان شاءاللہ)

دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی تمام دینی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازیں اوران کے لیے توشہ آخرت بنائیں" يوم لاينفع مال ولابنون إلامن أتى الله بقلب سليم وما ذلك على الله بعزيز "۔

(حضرت مولانا)عبدالباقی حقانی(حفظہ اللہ ورعاہ)

مدرس سیاسیات دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلف

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے ان چند اہم اور بنیادی ضوابط میں سے ایک ہے جن میں اسلام کی ترقی کا راز مضمر ہے، اسلام کے محاسن اور لازوال خوبیاں نکھارنے کا یہ ایک اہم ذریعہ ہے، یہ ایک طرف اسلام کے حلقہ بگوش افراد کے درمیان ان کے دین ومذہب کے حدودِ اربعہ برقرار رکھنے کی ایک روشن راہ ہے تو دوسری طرف غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کا بھی ایک بہترین انداز ہے، اسلئے احادیثِ مبارکہ میں اس پر خاص توجہ دی گئی جس کا ایک مختصر سا نمونہ آپ اسی کتاب کے فضائل وترغیبات کے باب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر اُمت کے اکابر واسلاف نے اس باب کی خصوصی نگہداشت رکھی، اپنی بے لوث خلوص ومحبت، مجاہدانہ کارناموں، نیک مساعی، جان ومال کی لازوال قربانیوں بلکہ اپنے خونِ جگر سے اس کھیت کی آبیاری کی، اور صفحہ عالم پر وہ گہرے نقوش ثبت چھوڑے کہ مادہ پرست دل ودماغ آج بھی اس پر محوِ حیرت ہے۔

موضوع کی اس اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اگر اس عنوان پر لکھی گئی کتابوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر شاید کوئی ایسی کتاب موجود ہو، جس میں اس کے متعلق تمام ابحاث موجود ہوں، خصوصاً اُردو زبان کا دامن تو اس سے یکسر خالی نظر آتا ہے ،ان ہی دو باتوں کی وجہ سے ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ اس موضوع پر علمی انداز میں کام کیا جائے اور اکابر محدثین اور فقہاءِ کرام کی تحقیق واجتہاد کی روشنی میں قرآن وسنت کے ان تمام نصوص کو یکجا جمع کیا جائے جو اس موضوع

سے متعلق ہیں اور عملی میدان میں کام کرنے والے خوش نصیبوں کو اس راہ پر چلنے میں جن مسائل و مشکلات کا سامنا ہو اس کا بھی اسی طریقے سے جائزہ لیا جائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو ایک طرف موضوع کی اہمیت اور نزاکت کا پورا پورا احساس ہو اور دوسری طرف اس کی عملی مشکلات کا بھی تجربہ ہو، جبکہ میرے اندر یہ دونوں صفات موجود نہیں، اسلئے دوسرے حضرات کی طرف سے اُمید رہی ، لیکن سچ یہ ہے کہ موضوع کی اہمیت اور کچھ طبعی طور پر اپنی بے صبری نے اس انتظار کا دورانیہ طویل نہ ہونے دیا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کچھ لکھنا شروع کیا، تھوڑے ہی عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے یہ مختصر سی تحریر تیار کروائی۔

اب یہ جو تحریر آپ کے ہاتھ میں ہے یہ دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اُصول وضوابط اور اس سے متعلقہ مسائل و احکام بیان کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے، اس کوشش میں مجھے کس قدر کامیابی ہوئی ہے؟ اسکا فیصلہ آپ کریں گے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے بہت زیادہ غلطیاں صادر ہو چکی ہوں گی، بہت سی آراء قائم کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہو گا، بہت سے مسائل کی وضاحت ضروری تھی جو میں نہ کر سکا اور میری کوتاہ نظر سے وہ او جھل رہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے ، آپ اس ناقص تحریر کو پڑھ کر میری راہنمائی فرمائیں گے، تو آئندہ طباعت میں انشاءاللہ اس کی اصلاح کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔

ایک طفلِ تسلی مجھے ضرور ہے کہ حتی الامکان اُمت کے مستند حضرات فقہاء و محدثین ہی کے اقوال جمع کرنے کی کوشش ہے ،اپنی طرف سے کوئی زیادہ کلام سے امکانی

حد تک احتراز ہی کرتا رہا، اس انداز میں مجھے شام کے مشہور وسیع النظر عالم علامہ جمال الدین قاسمی (المتوفی ۱۹۱۴ء) رحمۃاللہ علیہ سے خصوصی رہنمائی ملی، آپ کا نظریہ و مذہب کیا تھا؟ تقلید و مقلدین کے حوالے سے آپ کے کیا خیالات تھے؟ ائمہ اربعہ کے پیروکاروں کے ساتھ آپ کا کیا طرز و سلوک رہا؟ درپیش مسائل حل کرنے میں آپ کا کیا طریقہ کار رہا؟

ان تمام باتوں سے قطع نظر کرکے مجھے آپ کا وہ اسلوب نہایت ہی خوشگوار محسوس ہوا جو آپ نے اپنے بیشتر تالیفات میں اختیار کیا ہے کہ اپنی طرف سے کوئی راہ/ نئی تحقیق پیش کرنے کی بجائے صرف عنوان ہی قائم کرتے ہیں، باقی کسی مستند کتاب سے اس کے متعلق پوری عبارت نقل کردیتے ہیں، آپ نے اپنی کتابوں" قواعد التحدیث فی فنون مصطلح الحدیث " "الفتویٰ فی الإسلام" "مذاهب الأعراب وفلاسفة الإسلام في الجن"وغیرہ میں اکثر یہی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

کتاب میں کل سات ابواب ہیں:

بابِ اوّل میں امر و نہی، معروف و منکر کی لغوی و اصطلاحی تحقیق،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تاریخی پس منظر پیش کیا گیا،اوراس بات کی تحقیق کی گئی کہ کیا یہ اس اُمتِ مرحومہ کی خصوصیت ہے یا سابقہ اقوام و ملل بھی اس ذمہ داری میں شریک تھے؟ باب کے آخر میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شرعی حکم بیان کیا گیا۔

بابِ دوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق کتبِ حدیث میں جو فضائل و ترغیبات مذکور ہیں یا اس کے نہ کرنے پر جو وعیدات و نقصانات بیان فرمائے

گئے ان کو ایک ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا اور احادیث نقل کرنے میں اس بات کا حتی الامکان لحاظ رکھا گیا کہ حدیث موضوع یا شدید ضعیف نہ ہو، اسی بنیاد پر اکثر مقامات میں مستند ائمہ حدیث کا تبصرہ بھی لکھا گیا۔

بابِ سوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط بیان کی گئی ہیں، شرائط کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان شرائط کی ہے جن کے بغیر یہ فریضہ انجام دینا درست نہیں ،اس قسم کی شرائط کو فقہاءِ کرام "شرائطِ جواز" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ دوسری قسم وہ شرائط ہے جو اس نوعیت کی تو نہ ہوں ، بلکہ ان کے بغیر بھی دعوت دینا درست ہو، تاہم اگر یہ شرائط موجود نہ ہوں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل حکم "وجوب" باقی نہیں رہتا، اس قسم کی شرائط کو فقہاءِ کرام "شرائطِ وجوب" سے تعبیر فرماتے ہیں۔

اس دوسری قسم کی شرائط کو بنیادی طور پر چار اقسام میں منقسم کیا گیا، ایک قسم ان شرائط کی تھی جن کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کے ساتھ ہے، یہ کل پانچ شرائط ہیں جن کی تفصیل اس تحریر میں موجود ہے۔ دوسری قسم ان شرائط کی ہے جن کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جس کو کسی نیکی کا حکم یا کسی برائی سے منع کیا جا رہا ہو۔ تیسری قسم میں ان شرائط کو ذکر کیا گیا جو خود اس معصیت کے متعلق ہیں جس پر نکیر کی جا رہی ہو۔ اور چوتھی قسم کی شرائط میں خود امر و نہی کے مختلف مراتب اور طریقہ کار کی مکمل تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

باب چہارم میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا طریقہ دعوت ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ داعی کے لئے چند ایسی صفات و اخلاق کو مختصر انداز میں پیش کیا گیا، جن کے ہوتے ہوئے دعوت کے بار آور ہونے کا یقین کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں ایک کلیدی حیثیت اس

حدیث مبارکہ کی بھی ہے جس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات محدثین نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان (أخرجه الإمام مسلم: رقم الحديث 49)

اسلئے باب پنجم میں اس حدیث کے متعلق چند اہم ابحاث ذکر کئے گئے۔

چھٹے باب میں موضوع سے متعلق چار اہم مسائل کی تحقیق کی گئی ہیں:

۱۔ عقائد و نظریات کے باب میں نہی عن المنکر کی اہمیت و ضرورت۔

۲۔ دینی اور دعوتی مصالح کیلئے معاشرتی بائیکاٹ کا شرعی حکم، اہمیت و افادیت اور سلفِ صالحین کا معمول۔

۳۔ مداہنت کی تحقیق اور تفصیلی حکم۔

۴۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کیلئے دو اہم اور بنیادی اُصول۔

5۔ بالواسطہ دعوت کی اہمیت اور طریقہ کار۔

چاروں مسائل کی تشریح و تحقیق کی ضمن میں چند جزوی اور فروعی مسائل بھی ذکر ہوئے۔

بابِ ہفتم میں بعض خاص خاص مواقع کے ان منکرات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں عام و خاص تمام لوگ مبتلا ہیں اور عام طور پر ان منکرات کی فہرست سے نکالا جا چکا ہے، یہی اس کتاب کا آخری باب ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے لے کر طباعت کے آخری مراحل تک جن جن حضرات نے بھی امداد و تعاون فرمایا، میں ان کا شکر گزار ہوں، خصوصا حضرت مولانا مفتی ثناء اللہ

صاحب جنہوں نے کتاب کی تصحیح وطباعت وغیرہ میں بھرپور تعاون کیا، مسودے کے اکثر حصے پر نظرثانی بھی فرمائی اور موقع بموقع حوصلہ افزائی بھی فرماتے رہے اور طباعت کیلئے اپنے تعلقات بھی بے دریغ استعمال فرمائے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرما کر ثوابِ دارین عطافرمائے۔

حضرت مولانا سجاد الحجابی صاحب زید مجدہم کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے تفصیلی مقدمہ رقم فرمایااور خود ہی سردی وبارش میں تشریف لاکر اس ناکارہ کے حوالہ کردیا، اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں ان کو اس احسان کا بہترین صلہ عطافرمادیں۔ میں ان کا انتہائی مشکور ہوں اوران کے علاوہ ان تمام حضرات کا بھی جنہوں نے اس ناکارہ کے ساتھ کسی بھی شکل میں کوئی تعاون کیا۔

بارگاہ الٰہی میں دست بدعاہوں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے مساعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے اوراس ناکارہ کی اس تحریر کودانت گسائی کی اُجرت کے طور پر اپنے دربارِعالی میں قبول فرمائے اوراس کواپنے قرب ورضا کا ایک وسیلہ بنادے۔

اپنی بے ربط عرض کو ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر حضرات اہلِ علم اور دردِ دل رکھنے والے اصحابِ قلم کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ اس تحریر میں کسی قسم کی کوئی بھی غلطی سامنے آجائے توبراہِ کرام مجھ ناکارہ کو ضرور مطلع فرمادیں، تاکہ دین یا خدمتِ دین کے نام پر اپنے غلط خیالات اور بے دلیل نظریات کا پرچار نہ ہو۔

ناکارہ: عبیدالرحمن

۱۷ جمادی الاولیٰ ۳۶ھ بمطابق ۹ مارچ ۲۰۱۵ء

بابِ اوّل

- امر و نہی کی لغوی واصطلاحی تحقیق
- امر و نہی کا معنیٰ
- معروف و منکر کی تحقیق
- تاریخی پسِ منظر
- کیاامر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے؟
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شرعی حکم
- کیاموجودہ دور میں انفرادی اصلاح کافی نہیں؟
- آیتِ کریمہ " عليكم أنفسكم" کی تفصیلی بحث

امر و نہی کا معنی

امر کا معنی ہے کسی چیز کا حکم دینا، کسی شخص کو کسی کام کے کرنے کا کہنا، ترغیب و تلقین کرنا، اور نہی کا معنی ہے کسی کام سے روکنا، منع کرنا۔

لغوی اعتبار سے لفظ "امر" اور "نہی" ان معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے، اس میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ امر کرنے والا اس شخص سے واقعی بڑا ہو یا اپنے آپ کو بڑا سمجھے جس کو امر کیا جارہاہے، نہ ہی اس کا یہ مفہوم ہے کہ امر یا نہی ہمیشہ جبراً کسی کام سے روکنے یا اس کے کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض حضرات کو اُصولِ فقہ کی کتابوں میں "امر" اور "نہی" کی ذکر کردہ تعریفات سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ امر اور نہی کے لئے ضروری ہے کہ متکلم اپنے آپ کو مخاطب کی بنسبت بڑا سمجھ کر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا کہے ،لہٰذا محض کسی نیکی کی ترغیب دینا یا کسی گناہ سے بچنے کے لئے کسی کو راغب کرنا اور اس کی وعیدات وغیرہ سنانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہے، جب تک کہنے والے اپنے آپ کو مخاطب سے بلند مرتبہ تصور نہ کرے اور قرآن کریم میں جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، ان تمام مقامات پر امر اور نہی سے یہی معنی مراد لے لیتے ہیں، اسلئے وہ حضرات زبانی وعظ و نصیحت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تصور نہیں کرتے ،چنانچہ اسی وجہ سے وہ مروجہ تبلیغی جماعت کے طریق کار کو ان نصوص کا محمل نہیں سمجھتے۔

لیکن یہ بات درست نہیں ہے، اُصولی لحاظ سے یہ تعریف لفظ "امر" اور لفظ

"نہی" کی نہیں ہے، بلکہ " صیغہ امر " اور " صیغہ نہی " کی ہے،اس پر اگر یہ اشکال کیا جائے کہ خود اس فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب بھی تو صیغہ امر سے ثابت ہے تو وہی اشکال پھر عائد ہو گا! اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صرف اس ایک فریضہ ہی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ نماز، زکوۃ اور روزہ وغیرہ فرائض کا بھی یہی حال ہے کہ صیغہ امر کیساتھ ان فرائض کے کرنے کا حکم دیا گیا تو چاہیئے کہ ان تمام فرائض کے ادا کرتے ہوئے بھی کرنے والا اپنے آپ کو بلند مرتبہ تصور کرے ورنہ یہ عبادات صحیح قرار نہ دی جائیں ۔

اصل بات یہ ہے کہ "امر""آمر" یعنی اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے ہے وہ جب اپنے بندوں کو کسی کام کا حکم دیتا ہے یا کسی برائی سے منع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ خالق و معبود ہے اور جس کو امر یا نہی کر رہا ہے وہ عابد و مخلوق ہے تو اس کا حکم دینا اس اصطلاحی معنٰی میں امر اور نہی ہی ہے، لیکن انسانوں کا ایک دوسرے کو کسی نیکی کی رغبت دینا یا برائی سے بچنے کا کہنا اس طرح نہیں ہے، یہاں کہنے والے کے لئے اپنے آپ کو بلند مرتبہ تصور کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اہلِ دل کے نزدیک تو درست ہی نہیں ہے۔

نیز یہاں اہل عربیت کی اصطلاح مقصود ہے "امر" اور "نہی" کے متعلق حضرات اُصولیین کی یہ اصطلاح بہت بعد میں بنی، نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب تمام قیود و شروط کیساتھ اس اصطلاح سے نامانوس تھے، یہ اصطلاحات اور تعریفات ان کے کانوں میں بالکل نہیں پڑی تھیں، جبکہ قرآن مجید کا نزول ان ہی کے زبان اور انہی کے مفاہیم و اسالیب میں ہوا، قرآن مجید کے الفاظ کو بعد میں بنی ہوئی اصطلاحات پر محمول کرنا اور اسی میں منحصر و مقید سمجھنا قطعاً درست نہیں، اس سے بعض اوقات بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ [1]

---

[1] یہاں اُصولیین کی تردید مقصود نہیں ہے حاشا وکلاً، اُصول فقہ تو دین و شریعت کا بڑا سرمایہ ہے کیونکہ

علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۲ھ) نے "المفردات[1]" میں "امر" کے متعدد معانی لکھے ہیں، اسی طرح علامہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۱۷ھ) اپنی مشہور کتاب "بصائر ذوي التمييز 2" میں تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں لفظ "امر" اٹھارہ معانی میں استعمال ہے۔

ان سب معانی اور تمام تر استعمالات کو دیکھنے سے جہاں امر اور نہی کا معنی جبراً کسی سے کام کرنے کا کہنا، یا زبردستی کسی کام سے روکنا معلوم ہوتا ہے، وہاں اس کے علاوہ معانی مثلاً ارشاد و ہدایت، ترغیب و ترہیب اور مشورہ وغیرہ بھی مستفاد ہوتے ہیں، بلکہ علامہ جمال الدین بن منظور الافریقی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۱۱ھ) نے لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جہاں امر سے یہ معنی لینا بالکل ہی درست نہیں، آپ لکھتے ہیں:

"وقوله: ورب خماص ... يأمرن باقتناص۔"

"بھوکی وحشی گایوں کا ریوڑ شکار کئے جانے کا شوق دلاتا ہے۔"

یہاں گائیوں کی طرف امر کی نسبت کی گئی جہاں اصطلاحی "امر" مراد لینا ممکن نہیں، چنانچہ خود علامہ افریقی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد فرماتے ہیں:

قرآن و سنت سے احکام و مسائل کا درست طریقہ استنباط اسی علم کا ثمرہ طیبہ ہے، بلکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ اس اصولی اصطلاح کا تعلق لفظ "امر" کے ساتھ نہیں ہے۔

[1] المفردات في غريب القرآن،مادة:امر،1 / 88

[2] بصائر ذوي التمييز في لطائف الكتاب العزيز مادة:أمر،40/2

"إنما أراد أنهن يشوقن من رآهن إلى تصيدها واقتناصها، وإلا فليس لهن أمر۔" [1.]

"شاعر کا مقصود یہ ہے کہ اس قسم کی گائیں دیکھنے والوں کو اپنے پکڑنے اور شکار کرنے کا شوق دلاتی ہیں،(شوق اسلئے کہا کہ)ان کا (اصطلاحی) امر نہیں ہوتا۔"

اُردو مفسرین کی نظر

اس حقیقت کی وضاحت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں لفظ "امر" اور"نہی" کے الفاظ متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں لیکن اردو ترجمہ اور تفسیر کرنے والے حضرات نے ہر جگہ ان دونوں الفاظ کا اُصولی اور اصطلاحی معنیٰ نہیں لیا، بلکہ ہر موقع میں اس کا مناسب ترجمہ کیا۔

چنانچہ سورۃالنساء میں یہ لفظ دو بار استعمال ہوا ہے(آیت نمبر ۱۱۴،اور۱۱۹) جو بالترتیب درج ذیل ہیں:

"لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔" [2]

"وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ

---

[1] لسان العرب ، باب الراء، حرف الالف، 27/4

[2] النساء : 114

دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا۔"[1]

نمونہ کے طور پر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) کا ترجمہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، آپ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہ کہے صدقہ کرنے کو یا نیک کام کو یا صلح کرانے کو لوگوں میں اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کی خوشی کے لئے تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب۔

اور ان کو بہکاؤں گا اور ان کو اُمیدیں دلاؤں گا اور ان کو سکھلاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے کان اور ان کو سکھلاؤں گا کہ بدلیں صورتیں بنائی ہوئی اللہ کی اور جو کوئی بناوے شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر تو وہ پڑا صریح نقصان میں۔"

علاوہ ازیں قرآن کریم میں لفظ "امر" کی نسبت بکثرت شیطان کی طرف بھی کی گئی ہے، اور وہاں حضرات اُصولیین کی جچی تلی فنی تعریف منطبق کرنا اور ان حضرات کی بیان کی ہوئی تمام احکامات لاگو کرنا بڑا مشکل ہے۔

سورۃ النور میں ارشاد فرمایا گیا:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَى مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔"

"اے ایمان والو! نہ چلو قدموں پر شیطان کے، اور جو کوئی چلے گا

[1] النساء: ۱۱۹

قدموں پر شیطان کے، سو وہ یہی بتائے گا بے حیائی اور بری بات۔ اور کبھی نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اسکی مہر (رحمت) ، نہ سنورتا تم میں ایک شخص کبھی۔ لیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ سب سنتا ہے جانتا۔"

(ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب) [1]

یہاں "يأمر بالفحشاء والمنكر" سے" قول القائل لغيره على سبيل الاستعلاء أفعل" مراد لینا ممکن ہی نہیں۔ نیز اس کا جولازمی حکم ہے "وموجبه الوجوب" اس کو ثابت کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

نیز "داعی کے اخلاق واوصاف" کے باب میں جو نصوص ذکر ہوں گے، ان تمام نصوص اور اسلاف واکابر کے طرز عمل اور امر و نہی کے طریق کار کو دیکھتے ہوئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہی مفہوم ہے جو حضرات اُصولیین نے مقرر فرمایا ہے۔

ان اُمور کو مد نظر رکھ کر واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام نصوص اُصولیین کے تعریف واصطلاح پر منطبق کرنا اور ہر جگہ اس سے یہی مراد لینا بالکل درست نہیں ہے۔

علامہ سید شریف جرجانیؒ کی تعریف

علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۱۶ھ) کے کلام سے یہ مسئلہ مزید صاف اور منقح ہو جاتا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] النور : 21 ، 22

الأمر بالمعروف: الإرشاد إلى المراشد المنجية، والنهي عن المنكر: الزجر عما لا يلائم في الشريعة، وقيل: الأمر بالمعروف: أمرٌ بما يوافق الكتاب والسنة، والنهي عن المنكر: نهيٌ عما تميل إليه النفس والشهوة، وقيل الأمر بالمعروف إشارة إلى ما يرضي الله تعالى من أفعال العبد وأقواله، والنهي عن المنكر: تقبيح ما تنفر عنه الشريعة والعفة، وهو ما لا يجوز في دين الله تعالى.[1]

"امر بالمعروف نام ہے ان اُمور کی رہنمائی کا جو (آخرت میں انسان کو) نجات دیتی ہے، اور نہی عن المنکر ان اشیاء سے روکنے کا نام ہے جو شرعاً مناسب نہ ہو، اور (اس کی تعریف میں یہ بھی) کہا گیا ہے کہ امر بالمعروف قرآن وسنت کے موافق حکم دینے کا نام ہے اور نہی عن المنکر ان چیزوں سے روکنا ہے جن کی طرف نفس وشیطان مائل ہوتا ہے، اور (ان ہی اصطلاحات کی تعریف میں یہ بھی) کہا گیا کہ بندے کے جو افعال وگفتار اللہ تعالیٰ پسند کرے، ان کی رہنمائی کرنے کو امر بالمعروف (کہا جاتا) ہے، اور جو چیزیں دین الٰہی میں ناجائز ہو ان کی قباحت وبرائی بیان کرنا نہی عن المنکر ہے۔"

معروف و منکر کی تحقیق

لفظ "معروف" "عرف" سے مشتق ہے، اور یہ مادہ کلام عرب میں بنیادی طور پر دو معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے:

ا۔ایک سے زائد اشیاء کا آپس میں پے درپے متصل اور یکجا ہونا۔

[1] التعريفات باب الألف، الأمر بالمعروف، ص ٣٦

۲۔ سکون و اطمینان۔

چنانچہ جب گھوڑے پر بال زیادہ ہو جاتے ہیں تو عرب لوگ اس وقت کہتے ہیں "عرف الفرس" اسی طرح "جاءت القطا عرفا عرفا " اس وقت بولتے ہیں جب قطا پرندے ایک بڑی تعداد کے ساتھ قطار کی شکل میں آجائیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے ہوں۔

جاننے اور پہچاننے کیلئے بھی عربی میں یہی مادہ استعمال ہوتا ہے کیونکہ جانی پہچانی چیز کی طرف سے آدمی کو سکون واطمینان رہتا ہے، نامعلوم اور ناآشنا چیز سے تردد اور بے چینی کی نوبت آجاتی ہے، اسلئے اس کیلئے "نکر" کا مادہ استعمال ہوتا ہے جو "عرف" کا ضد ہے، علامہ احمد بن فارس (۳۹۵ھ) اپنی معرکۃ الاراء کتاب "مقاییس اللغۃ" میں اس کی پوری وضاحت تحریر فرمائی ہے۔[1]

امام طبری (المتوفی ۳۱۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں معروف و منکر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وأصل "المعروف" كل ما كان معروفًا فعله، جميلا مستحسنًا غير مستقبح في أهل الإيمان بالله، وإنما سميت طاعة الله "معروفًا"، لأنه مما يعرفه أهل الإيمان ولا يستنكرون فعله.

وأصل "المنكر"، ما أنكره الله، ورأوه قبيحًا فعلهُ، ولذلك سميت معصية الله "منكرًا"، لأن أهل الإيمان بالله

---

[1] مقاييس اللغة مادة نكر.

یستنكرون فعلها، ويستعظمون رُكوبها. "[1]

"معروف دراصل ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کا کرنا اچھا اور نیک سمجھا جاتا ہو، مسلمانوں کے نزدیک وہ برا نہ شمار ہوتا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اسی لئے معروف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اس کو جانتے پہچانتے ہیں اور اس کو برا نہیں سمجھتے، "منکر" دراصل اس چیز کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو اور مسلمان اس کے کرنے کو برا سمجھتے ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو اسی لئے منکر کہا جاتا ہے کہ اہل ایمان اس کو ناپسندیدہ خیال کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب کرنے کو بڑا (جرم اور بڑی جرأت) سمجھتے ہیں۔"

علامہ ابوالبقاء کفوی(۱۰۹۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معروف و منکر کا یہی مفہوم پیش کیا، آپ فرماتے ہیں:

" [المعروف] : كل ما سكنت إليه النفس واستحسنته لحسنه عقلا أو شرعا أو عرفا فهو معروف، [المنكر] : وكل ما نفرت منه وكرهته فهو منكر"۔[2]

"معروف" ہر اس فعل کا نام ہے جس کی طرف سے دل مطمئن ہو اور اس کے عقلی، شرعی یا معاشرتی محاسن کی وجہ سے اس کو اچھا خیال کرے، "منکر" ہر وہ کام ہے جس سے دل متنفر ہو اور طبیعت اس کو برا اور ناپسندیدہ سمجھے۔"

معروف و منکر کا وسیع مفہوم

ان تعریفات سے معلوم ہوا کہ معروف صرف نماز، روزہ وغیرہ عبادات کا نام

---

[1] جامع البيان ، سورة آل عمران، رقم الآية: 110،ت شاكر

[2] الكليات فصل الميم، ج1ص804-

نہیں ہے، اسی طرح منکر صرف قتل وغارتگری اور زنا وغیرہ میں منحصر نہیں ہے، بلکہ دونوں کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، معروف میں وہ تمام اُمور داخل ہیں جو شارع کی نظر میں کرنے کے کام ہیں، چاہے اس کو کرنا ضروری ہو یا مستحب و مندوب، اس کا تعلق دل کے ساتھ ہو یا دیگر اعضاء وجوارح کے ساتھ وہ جڑے ہوئے ہوں، یہ تمام چیزیں معروفات کے ذیل میں داخل ہیں، معروفات کے اس وسیع دائرے میں سب سے زیادہ اہمیت کا مسئلہ ایمان اور اس کے متعلقات ہیں۔

منکر سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو شریعت کی نگاہِ بصیرت میں نہ کرنے کی چیزیں ہیں، چاہے اس کو چھوڑنا ضروری ہو یا نہ، اس کا تعلق عقیدہ و قلب کے ساتھ ہو یا دیگر اعضاء وارکان کے ساتھ، ان منکرات میں سرِفہرست شرک اور اس کے اسباب و موجبات ہیں۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"رأس المعروف الإيمان بالله تعالى فعلى كل مؤمن أن يكون آمرا به داعيا إليه وأصل المنكر الشرك فهو أعظم ما يكون من الجهل والعناد لما فيه إنكار الحق من غير تأويل فعلى كل مؤمن أن ينهي عنه بما يقدر عليه. "[1]

اس لحاظ سے معروف و منکر کے ضمن میں پوری شریعتِ اسلامیہ داخل ہوگئی کیونکہ شریعت انہی دو قسموں سے مرکب ہے ۔

نکتہ کی بات

دینِ اسلام کی جتنی بھی نیکیاں ہیں وہ چونکہ تمام اہلِ دانش کے ہاں معروف

[1] المبسوط للسرخسي،كتاب السير، ج10ص2.

ہیں اور جتنے بھی برائیاں ہیں تمام اہل عقل اس کو پہلے سے ناآشنا اور برا سمجھتے ہیں، احکام شریعت کی بجاآوری، سچائی، انصاف، وعدہ کی پاسداری اور امانت وغیرہ تمام نیکیوں کو انسانیت کا شعور بہت پہلے سے خوبی کا مستحق سمجھتی چلی آرہی ہے،احسان شناسی، کفرو بدعت، جھوٹ و ظلم، بدعہدی اورخیانت وغیرہ تمام منکرات کو تمام ادوار میں برائی کا موجب یقین کیا گیا، انسانیت کی ہمدردی، رحم وکرم، فیاضی وفراخدلی وغیرہ کی ہمیشہ قدر کی گئ، اورخود غرضی، سنگدلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہو سکا۔

صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی اور شجاعت وغیرہ تمام مشہور مشہور نیکیاں داد و تعریف کی مستحق سمجھی گئیں، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین وآفرین کے پھول نہیں برسائے گئے، اسی طرح تمام احکام شرعیہ کا معاملہ ہے کہ ان کی بجا آوری، اس پر عمل پیراہونا عقل ودانش کی عدالت میں ابتداء ہی سے وہ اوصاف رہے جن کا شمار خوبیوں میں ہوتارہا، اوراحسان خداوندی کی ناشناسی وبے قدری، نفس کی بندگی اور کفروشرک نے کبھی بھی خوبیوں اور محاسن کی فہرست میں جگہ نہیں پائی۔

انسانیت کے شعور کو چونکہ یہ تمام نیکیاں پہلے سے معلوم تھیں، اسلئے اس کو معروف سے تعبیر کیا گیااور تمام برائیوں کی اصل جڑ چونکہ انعامات خداوندی کی ناشناسی وبے قدری ہے جس سے عقلِ سلیم ہمیشہ سے ناآشنا رہی، اسلئے اس کو منکر کا نام دیا گیا۔

ایک بنیادی حقیقت

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اسلئے اس میں ان ہی چیزوں کو نیکیاں شمار کیا گیاہے جواس سے پہلے بلکہ ابتدائے نوع بنی آدم ہی سے انسانیت کے شعور وفطرت میں قابل تعریف سمجھی جاتی رہیں، اورشرک وبدعت اور جہالت وشرارت سے پاک نفوس وقلوب شروع ہی سے اس پر عمل پیرا تھے، اسی طرح جن چیزوں کواسلام نے منکرات قرار دیا وہ

پہلے سے درست فکر و نظر رکھنے والے لوگوں کے ہاں نہ کرنے والوں کاموں کی فہرست میں شامل تھے، داخلی اور خارجی فتنوں سے محفوظ انسان اسلام سے پہلے بھی اس سے دل برگشتہ تھے، حقیقی معنوں میں انسانی مزاج و مذاق رکھنے والوں کے معاشرہ میں اس کی کوئی جگہ نہیں تھی، اگرچہ ان لوگوں کے پاس دین اسلام کی یہ واضح تعلیمات نہیں تھی، کیونکہ یہ نعمت خداوندی اس وقت نازل ہی نہیں ہوئی تھی، لیکن فطرت اور اصل مزاج انسانی سے اس مضبوط رشتے بلکہ یکسانیت کی وجہ سے وہ بالکل ان چیزوں سے ناآشنا بھی نہیں تھے، بلکہ بڑی حد تک یہ ان کے سلیم فطرت و مذاق کا حصہ بن چکا تھا۔

اہل حق اور معتزلہ کے درمیان امر بالمعروف میں اختلاف

اہل سنت والجماعت کی طرح اہل اعتزال میں بھی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی اصطلاح بہت رائج ہے، چنانچہ اعتزال کے پانچ بنیادی اُصول، جن پر مسلک اعتزال کی پوری عمارت کھڑی ہے، میں سے ایک اصل یہی امر بالمعروف ہے، لیکن کیا اس مسئلہ میں اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیا بنیادی فرق ہے؟

معتزلہ کی اکثر کتابیں اب مفقود یا نایاب ہو چکی ہیں، البتہ چند ایک کتابیں اب بھی دستیاب ہیں جن میں سے شاید زیادہ شہرت و اعتماد قاضی عبدالجبار معتزلی مرحوم کی "شرح الأصول الخمسة" کو حاصل ہے، اس کتاب میں معتزلہ کے پانچ بنیادی اُصولوں کی تشریح کی گئی ہے جن پر اعتزال کا مدار ہے، اس کے مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی زیادہ اور اساسی نوعیت کا اختلاف موجود نہیں، چنانچہ:

ا۔ دونوں کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے، "شرح

الأصول الخمسة"میں ہے:

"لا خلاف بين الأمة في وجوب الأمر بالمعروف والنّهي عن المنكر إلّا ما يحكى عن شرذمة من الإمامية لا يقع بهم وبكلامهم اعتداد. "[1]

۲۔ دونوں کے نزدیک امر و نہی کے باب میں تدریج سے کام لینا ضروری ہے یعنی پہلے زبانی طور پر دعوت دے، اگر اس سے کام نہ چلے تو ہاتھ کا استعمال کرے۔

قاضی عبدالجبار صاحب لکھتے ہیں:

"الغرض بالأمر بالمعروف والنهي عن المنكر أن لايضيع المعروف ولا يقع المنكر، فمتى حصل هذا الغرض بالأمر السهل لايجوز العدول عنه إلى الأمر الصّعب، وهذا مقرّر في العقول، وإلى هذا أشار تعالى بقوله: وإن طائفتان من المؤمنين إلخ. فبدأ أوّلا بإصلاح ذات البين ثمّ بالمقاتلة إن لم يرتفع الغرض إلّا بها حسب ما ذكرناه. "[2]

"ترجمہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقصد یہ ہے کہ نیکی ختم نہ ہو اور گناہ صادر نہ ہو جائے، جب تک یہ مقصد آسان طریقے سے حاصل ہوتا ہو تو اس سے مشکل کام کی طرف التفات کرنا درست نہیں۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور باری تعالیٰ کے کلام سے اشارۃً ثابت ہے۔

۳۔ اہل سنت کے نزدیک بھی امر بالمعروف کا وجوب سمعی و شرعی ہے اور اہل

---

[1] شرح الأصول الخمسة، الأصل الخامس، ص :741.

[2] شرح الأصول الخمسة، الأصل الخامس، ص :741.

اعتزال کے اکثر علماء کے نزدیک بھی اس حکم کی یہی حیثیت ہے اور یہی قاضی عبد الجبار صاحب کے نزدیک راجح بھی ہے۔[1]

دونوں مکاتب فکر کی آراء میں اگر کچھ فرق ہو سکتا ہے تو یہی کہ ہمارے نزدیک امر بالمعروف بھی دین اسلام کے دیگر احکام کی طرح ایک حکم ہے جس پر اپنے درجہ میں عمل کرنا ضروری ہے، لیکن معتزلہ نے اس کو باقاعدہ اُصول کا درجہ دیا چنانچہ اس کو "اُصول خمسہ" میں سے مستقل اصل کی حیثیت سے شامل کیا، اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز جب اصل کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے تو عام فروعی احکام کی بنسبت اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے اور علمی و عملی دونوں سطح پر اس کا معمول سے زیادہ اہتمام شروع کیا جاتا ہے اور یہیں سے اس میں افراط و تفریط کے مظاہر سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں، اس لئے یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جب معتزلہ نے امر بالمعروف کو اپنے "اُصول لازمہ" میں سے ایک اصل لازم کی حیثیت سے شامل کیا تو اس کے بعض مسائل میں اُنہوں نے علمی یا عملی طور پر افراط یا تفریط سے کام لیا ہو، جو اُن کا امتیاز قرار پایا ہو، لیکن بہر حال اصل مسئلہ میں اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان کوئی معتد بہ فرق نہیں ہے۔[2]

---

[1] لاحظ ص ٢٤ من المصدر المذکور.

[2] معتزلہ کے پانچ بنیادی اُصول کیا تھے؟ ان کے متعلق اہلِ سنت کا کیا موٴقف ہے؟ دونوں مکاتبِ فکر کا اس حوالہ سے کن نکات میں اتفاق ہے اور کہاں اختلاف؟ اس کے متعلق دکتور عواد بن عبداللہ المتعق نے "المعتزلة وأصولهم الخمسة وموقف أهل السنة فيها" کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسئلہ میں دونوں فریق کے درمیان کوئی معتد بہ فرق نہیں ہے۔ البتہ انہوں نے ایک فرق ذکر کیا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک تمام منکرات ایک جیسے ہیں اور سب سے نہی کرنا ضروری ہے جبکہ اہلِ سنت کے نزدیک "معروف" کی طرح "منکر" کے بھی مختلف درجات و مراتب ہیں، تمام منکرات سے

تاریخی پس منظر

کسی بھی مذہب و نظریہ کی بقاءاور ترقی کیلئے ضروری ہے کہ نظریاتی حد تک اس کی مکمل حفاظت کی جائے، اس کو اندرونی و بیرونی ہر طرح اثرات و خطرات سے محفوظ رکھا جائے، اور عملی طور پر اس کی آبیاری کی جاتی رہے، اور مزید ترقی اور برتری کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ماننے والے افراد اپنے اپنے حلقوں میں اس کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تلقین کرتے رہیں، دوسرے افراد کے سامنے اس کی خوبیاں اور فوائد اُجاگر کرتے رہیں۔

یہ ایک ایسا فطری قانون ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر عصر حاضر تک تمام ادیان و مذاہب کے حاملین اسی کو اپناتے رہے، اور یہ صرف دین و مذہب ہی تک محدود نہ رہا، بلکہ مذہب سے بیزار سیکولر نظریات کے لوگ بھی اپنے افکار و خیالات پھیلانے کیلئے اسی راہ پر گامزن رہے ہیں، تمام سیاسی قائدین اور حکومتی زعماءاسی فطری قانون کے تحت اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، یہی کام اگر دین اسلام کے تحفظ اور اس کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے انجام دیا جائے تو شرعی اصطلاح میں اس کا نام "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یا بالفاظ دیگر "دعوتِ دین" ہے۔

قرآن و سنت کی متعدد نصوص سے بڑی وضاحت کیساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ پہلی اُمتوں میں بھی جاری رہا، انبیاءِ کرام ؑ کی غیر موجودگی میں یا ان کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد کچھ ایسے نیک بخت افراد ضرور موجود ہوتے تھے جو کسی نہ کسی شکل

ممانعت کرنے کا حکم برابر نہیں ہے۔(ملاحظہ فرمائیں۔مذکورہ کتاب کا ص 271) لیکن غور کیا جائے تو یہ کوئی معتدبہ فرق نہیں، بلکہ مزید تامل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ نزاع لفظی ہے۔

میں اپنے نبی کی تعلیمات وہدایات کی دعوت و تبلیغ کرتے رہتے، ایمان وتوحید کی تلقین کرتے رہتے اور برائی و منکرات سے لوگوں کو بچانے کی کوشش اور فکر کرتے رہتے۔

ذیل میں مختصراً چند ایک نصوص ذکر کی جاتی ہیں۔

پہلی نص

"إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔"

"جو لوگ منکر ہیں اللہ کی آیتوں سے اور مار ڈالتے ہیں نبیوں کو ناحق، اور مار ڈالتے ہیں جو کوئی کہے انصاف کو لوگوں میں سے، سواُن کو خوش خبری سنا دکھ والی مار (عذاب) کی"۔[1]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی کارستانیاں بیان فرمائی ہیں کہ انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے، انبیاء کرام کے علاوہ دیگر نیک افراد نے جب ان کو اس منکر سے روکنا چاہا تو ان کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

امام ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی سند کیساتھ ایک روایت نقل فرمائی جس سے اس بربریت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، آپؒ لکھتے ہیں:

"عن أبي عبيدة بن الجراح قال: قلت: يا رسول الله، أى الناس أشد عذابا يوم القيامة؟ قال:"رجل قتل نبيا، أو رجل أمر بالمنكر ونهى عن المعروف. ثم قرأ رسول الله صلى

[1] آل عمران : 21

الله عليه وسلم:"إن الذين يكفرون بآيات الله ويقتلون النبيين بغير حق ويقتلون الذين يأمرون بالقسط من الناس"إلى أن انتهى إلى"وما لهم من ناصرين" ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا أبا عبيدة، قتلت بنو إسرائيل ثلاثة وأربعين نبيا من أول النهار في ساعة واحدة! فقام مائة رجل واثنا عشر رجلا من عباد بني إسرائيل، فأمروا من قتلهم بالمعروف ونهوهم عن المنكر،فقتلوا جميعا من آخر النهار في ذلك اليوم، وهم الذين ذكر الله عز وجل."[1]

"حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب والے لوگ کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی جو کسی نبی کو یا اس آدمی کو قتل کرے جو نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی پھر فرمایا: اے ابوعبیدہ! بنواسرائیل نے ایک دن کے شروع کے ایک ہی وقت میں ۴۳ انبیاء کرام کو شہید کیا، (اس پر) انہی (بنی اسرائیل) ۱۱۲ عبادت گزار اُٹھے اور قاتلین انبیاء کو نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا جس پر ان قتل کرنے والوں نے ان تمام عابدین کو بھی دن کے آخری حصہ میں قتل کیا، اللہ تعالیٰ نے (ان آیات میں) انہی کا تذکرہ کیا ہے۔"

اس روایت میں صراحت ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بڑی تعداد نے اس موقع پر نہی عن المنکر کا کام سرانجام دیا۔

چنانچہ اسی آیت کے تحت امام قرطبیؒ (المتوفی ۶۷۱ھ) رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] جامع البيان، سورة آل عمران، رقم الآية : 21 ، 6 / 285

تحریر فرماتے ہیں:

"دلت هذه الآية على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر كان واجبا في الأمم المتقدمة، وهو فائدة الرسالة وخلافة النبوة."[1]

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ اُمتوں پر بھی واجب تھا، یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی جانشینی ہے۔"

دوسری نص

"لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۔"

"کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور ملّا، گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے؟ کیا برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں۔" [2]

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہودی علماء و مشائخ کو بڑی سخت تنبیہ فرمائی کہ لوگوں کو جھوٹ اور ناجائز باتیں کہنے اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے؟ پھر اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی یہ کارکردگی بُری اور غلط ہے، یہ عتاب و مذمت اسی لئے ہوا کہ ان پر نہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد کی گئی تھی، لیکن اُنھوں نے اس سے رُو گردانی کی، اور اپنے کچھ ذاتی مفاد کی لالچ میں اس فرض منصبی کو بھلا بیٹھے۔

---

[1] تفسير القرطبي، سورة آل عمران، رقم الأية : 21، 4 / 47

[2] المائدة : 64

تیسری نص:

"لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۔ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۔"

" لعنت کھائی منکروں نے بنی اسرائیل میں سے، داؤد کی زبان پر اور عیسی بیٹے مریم کی۔ یہ اس سے کہ گنہگار تھے اور حد پر نہ رہتے تھے ۔آپس میں منع نہ کرتے برے کام سے، جو کر رہے تھے۔ کیا برا کام ہے جو کرتے تھے۔"[1]

اس مقام پر قرآن کریم نے بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا کہ وہ اپنے مختلف کرتوت اور ناکردنی کی وجہ سے لعنت خداوندی کا شکار ہوئے، ملعون ہو جانے کے اسباب میں امر بالمعروف کا ترک کرنا بھی بیان فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کرنا اس قوم کی ذمہ داریوں میں بھی داخل تھا۔

چوتھی نص

" يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔"

"اے بیٹے: کھڑی رکھ (قائم کر) نماز، اور سکھلا بھلی بات، اور منع کر برائی سے، اور سہار (صبر کر) جو تجھ پر پڑے۔ بیشک یہ ہیں ہمت کے کام۔"[2]

---

[1] المائدة: ٧٨ و ٧٩

[2] لقمان: 17

حضرت لقمانِ حکیم کازمانہ حضرت داؤدعلیہ السلام کے زمانے یااس سے بھی کچھ پہلے کاہے، وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی وصیت کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتاہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ ایک اہم اور نیک کام کے طور پر جاری تھا۔

اس کے علاوہ بھی متعدد نصوص ہیں جس سے صراحتاً، کنایۃً یااشارۃً یہ مفہوم ہوتاہے، یہاں درج بالا نصوص ذکر کرنے پر ہی اکتفاء کیاجاتاہے۔

انہی نصوص کی وجہ سے علامہ سیف الدین الامدی (المتوفی ۶۳۱ھ) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ما من أمة إلا وقد أمرت بالمعروف كاتباع أنبيائهم وشرائعهم، ونهت عن المنكر كنهيهم عن الإلحاد وتكذيب أنبيائهم." [1]

"(مجموعی طورپر سابقہ) تمام اُمتوں نے نیکیوں کاحکم دیامثلااپنے انبیاء کرام اوران کے لائے ہوئے دین وشریعت کے اتباع کا (ہر اُمت نے حکم دیا) اور برائی سے روکا جیسے کہ الحاد اوراپنےانبیاء کرام کے تکذیب سے (ہر قوم نے لوگوں کو) روکا۔"

ان تمام نصوص سے معلوم ہوتاہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پہلی مرتبہ اس اُمت کے ذمے عائد نہیں ہوا، بلکہ تمام ادیان میں یہ سلسلہ جاری وساری رہا،

---

[1] الإحكام في أُصول الأحكام للآمدي،الأصل الثالث:الإجماع، المسئلة الثالثة: الإجماع حجة شرعية لها قوة النصوص،1 / 215

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بغیر کسی مذہب و نظریہ کا تحفظ و بقاء عملًا ناممکن ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام توچونکہ لوگوں کے دنیوی واُخروی مصالح اور مفاد کیلئے دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں، دونوں جہاں کی کامیابی ان کے لائے ہوئے دین میں پنہاں ہوتی ہے اسلئے اپنی اُمت کے افراد تک اس کو پہنچانا ضروری ہے، پھر افراد اُمت کا آپس میں اس کی تبلیغ و مذاکرہ کرنا اور اپنے اولاد و احفاد کو اور انصار و اتباع اس سے روشناس کرانا بھی اس کے بقاء و کامیابی کیلئے شرط ہے۔

کیاامر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اُمت کی خصوصیت ہے؟

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ۔"

"تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو پیدا ہوئے ہیں لوگوں میں، حکم کرتے ہو پسند بات پر، اور منع کرتے ہو ناپسند سے، اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔ اور اگر ایمان میں آتے اہل کتاب تو ان کو بہتر تھا۔ کوئی نہیں ان میں ایمان پر، اور اکثر وہ بے حکم ہیں"۔[1]

اس آیت میں اُمت محمدیہ کو بہترین اُمت قرار دیا گیا ہے، امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل فرمائی کہ اُمت مرحومہ کی فضیلت کا معیار (جو اس آیت میں ذکر ہوا) یہی مذکورہ تین اُمور ہیں، خیر الامم قرار دیئے جانے کی اصل بنیاد یہی اُمور ہیں۔

[1] آل عمران: 110

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"عن قتادة قال: ذكر لنا أن عمر بن الخطاب قال في حجة حجها ورأى من الناس رعة سيئة، فقرأ هذه:"كنتم خير أمة أخرجت للناس"، الآية. ثم قال: يا أيها الناس، من سره أن يكون من تلك الأمة، فليؤد شرط الله منها. "[1]

"حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک حج کے دوران لوگوں کے برے اور نامناسب طرز عمل کو دیکھا تو یہ (مندرجہ بالا) آیت پڑھی، پھر فرمایا: اے لوگوں! جس کو یہ پسند ہو کہ اس اُمت میں سے ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی شرط کو پورا کرے (یعنی اس اُمت میں جو تین صفات بتلائی گئیں، ان کو اختیار کرے۔)"

امام فخر الدین رازی (المتوفی ۶۰۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں:

"والمقصود منه بيان علة تلك الخيرية، كما تقول: زيد كريم يطعم الناس ويكسوهم ويقوم بما يصلحهم، وتحقيق الكلام أنه ثبت في أُصول الفقه أن ذكر الحكم مقرونا بالوصف المناسب له يدل على كون ذلك الحكم معللا بذلك الوصف، فههنا حكم تعالى بثبوت وصف الخيرية لهذه الأمة، ثم ذكر عقيبه هذا۔"[2]

"اس سے (اس اُمت کے) بہترین ہونے کی وجہ بتلانی مقصود ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ زید شریف انسان ہے، لوگوں کو کھلاتا پہناتا اور ان کی ضروریات پوری

---

[1] جامع البيان ،سورةآل عمران:رقم الاٰية: 110، 7 / 102

[2] مفاتيح الغيب، سورةآل عمران:رقم الاٰية: 110، 325/3،مكتبه علوم إسلامية

کرتا ہے (کہ اس کہنے کے مطابق کھلانا پہننا وغیرہ ہی شریف ہونے کی اصل وجہ اور بنیاد ہے) اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اُصول فقہ میں یہ (قاعدہ) مسلم ہے کہ جب کسی حکم کے ساتھ اس کے مناسب کوئی صفت ذکر کی جائے تو یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہی صفت ہی اس حکم کی علت ہے، تو یہاں (بھی) اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کیلئے بہتر ہونے کی صفت ذکر فرمائی، پھر اس کے بعد یہ (تین صفات یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ) ذکر فرمائیں۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اُمت ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے ادیان و مذاہب میں بھی مختلف اقوام کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔

تاریخ کے اس تناظر میں یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ جیسا کہ تحریر کیا گیا متعدد نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف اس اُمت ہی کی خاصیت نہیں، بلکہ دیگر مذاہب اور سابقہ امم بھی اس صفت میں شریک رہیں، اور ایمان باللہ تو تمام مذاہب کی بنیاد اور اصل ہے۔

تو ان تینوں اُمور میں دیگر اُمتوں کے مشترک ہونے کے باوجود اس اُمت کے خیر الامم ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ وہ کون سی صفات ہیں جو اس اُمت کا طرہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے پوری دنیا میں اسی اُمت کا انتخاب ہوا اور "خير أمة" کے عظیم لقب سے اس کو نوازا گیا؟

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں اس نکتہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، سوال و جواب انہی کی عبارت میں درج ہے:

"وهاهنا سؤالات:

السؤال الأول: من أي وجه يقتضي الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر والإيمان بالله كون هذه الأمة خير الأمم مع أن هذه الصفات الثلاثة كانت حاصلة في سائر الأمم؟.

والجواب: قال القفال: تفضيلهم على الأمم الذين كانوا قبلهم إنما حصل لأجل أنهم يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر بآكد الوجوه وهو القتال لأن الأمر بالمعروف قد يكون بالقلب وباللسان وباليد، وأقواها ما يكون بالقتال، لأنه إلقاء النفس في خطر القتل وأعرف المعروفات الدين الحق والإيمان بالتوحيد والنبوة، وأنكر المنكرات: الكفر بالله، فكان الجهاد في الدين محملا لأعظم المضار لغرض إيصال الغير إلى أعظم المنافع، وتخليصه من أعظم المضار، فوجب أن يكون الجهاد أعظم العبادات، ولما كان أمر الجهاد في شرعنا أقوى منه في سائر الشرائع، لا جرم صار ذلك موجبا لفضل هذه الأمة على سائر الأمم، وهذا معنى ما روي عن ابن عباس أنه قال في تفسير هذه الآية: قوله كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرونهم أن يشهدوا أن لا إله إلا الله ويقروا بما أنزل الله، وتقاتلونهم عليه و «لا إله إلا الله» أعظم المعروف، والتكذيب هو

أنكر المنكر."[1]

"یہاں کچھ سوالات ہیں، پہلا سوال یہ ہے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کیونکر اس اُمت کے بہتر ہونے کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ یہ تینوں اُمور سابقہ تمام اُمتوں میں موجود رہیں؟

جواب: (امام) قفال نے فرمایا کہ سابقہ اقوام کے مقابلے میں اس اُمت کی فضیلت اسلئے ہے کہ یہ اُمت انتہائی صورت یعنی جہاد کی شکل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، کیونکہ امر بالمعروف دل کے ذریعے بھی ہوتا ہے اور زبان وہاتھ کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے، (لیکن ان سب میں سے) زیادہ مستحکم طریقہ قتال ہے، کیونکہ قتال میں اپنے نفس کو قتل ہو جانے کے خطرہ میں ڈالنا ہے، اور سب سے بڑھ کر نیکی دین حق اور توحید ورسالت پر ایمان لانا ہے اور سب سے بڑی برائی کفر ہے، تو دین میں جہاد کے اندر بڑی مضرتوں کو برداشت کیا گیا تاکہ لوگ کو بڑی نیکی تک پہنچایا جاسکے اور بڑی مضرت (کفر) سے چھڑایا جائے (مشروعیت کی) اس (عظیم مقصد وحکمت کے پیش نظر) ضروری ہے کہ جہاد عظیم ترین عبادت ہو۔

اور چونکہ جہاد کا مسئلہ سابقہ تمام مذاہب کے مقابلے میں دین اسلام کے اندر مضبوط (اور کامل مکمل) ہے، اسلئے یہ (نکتہ) تمام اُمتوں کے مقابلے میں اُمت محمدیہ کے فضیلت کا سبب ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ فرمایا، اس کا بھی یہی حاصل ہے۔"

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ جہاد کا حکم جس اہتمام وضرورت اور شان وشوکت کیساتھ اسلام میں مشروع ہے دیگر اُمتوں میں اس طور پر حکم نہیں دیا گیا تھا، اور جہاد چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کی ایک شاخ اور اسی کی ایک انتہائی صورت ہے، اسلئے گویا اصل امتیاز اور اختصاص کی وجہ نہی عن المنکر ہی ہے۔ واضح رہے کہ نفسِ

[1] أيضا

جہاد کا حکم صرف اس اُمت ہی کی خصوصیات میں سے نہیں، بلکہ دیگر مذاہب میں بھی یہی حکم دیا گیا تھا، خود قرآن کریم میں متعدد اُمتوں کے جہاد کے واقعات مذکور ہیں۔

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

"أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ۔"

"کیا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو موسیٰ کے بعد نہیں دیکھا جب اُنہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں پیغمبر نے کہا کیا یہ بھی ممکن ہے، اگر تمہیں لڑائی کا حکم ہو تو تم اس وقت نہ لڑو، اُنہوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے، پھر جب انہیں لڑائی کا حکم ہوا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"

(ترجمہ از حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحب)[1]

سورۃ المائدۃ میں حضرت موسی وہارون □ اوران کی قوم کے جہاد

[1] البقرۃ : 246

کرنے کا واقعہ مذکور ہے، اسی طرح دیگر نصوص میں اسکا دیگر اُمتوں میں بھی موجود ہونا مذکور ہے، اسلئے نفسِ جہاد اُمت محمد یہ کے امتیازی خصوصیات میں سے نہیں، بلکہ اس میں بعض دیگر اُمتیں بھی شریک ہیں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہ مطلب نہیں، وہ نفس جہاد کو خاصیت شمار نہیں فرمارہے بلکہ ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جہاد اگرچہ بعض اُمتوں میں بھی رہا، مگر دین اسلام میں جس قوت اور تفصیلات کیساتھ یہ حکم دیا گیا دوسری ملتیں اس سے یکسر خالی ہے۔

پوری بحث کا نچوڑ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں تمام اُمتوں میں سے اُمت محمد یہ کو "خیر أمة" قرار دینے کی دو بنیادی وجوہات ذکر ہیں:

۱۔ایک نفسِ جہاد جس کا حکم بعض اُمتوں کو نہیں دیا گیا۔

۲۔دوسری وجہ ایک اس حکمِ کا اُمت محمد یہ کے تمام اقوام اور پوری انسانیت تک کیلئے عام ہونا ہے، دوسرے تمام ادیان چونکہ خاص افراد یا محدود زمانہ تک کیلئے واجب العمل تھی، اسلئے مجموعی طور پر یہ دو اُمور اُمت محمد یہ کو تمام ادیان و ملل سے ممتاز اور خاص کر دیتی ہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جو زیادہ اہتمام کی قید نکالی دی گئی، مراد اس سے امر و نہی بالید ہے جو اعلیٰ درجہ ہے اس کا، یہ درجہ اس اُمت میں اور اُمم سے دو وجہ سے زیادہ ہے:

اوّلا: جہاد کا مشروع ہونا جس سے دفعِ کفر و دفعِ فساد مقصود ہے۔

ثانیاً: بوجہ عموم دعوت محمد یہ اس کا سب اقوام کیلئے عام ہونا۔ بخلاف شرائع سابقہ

کے کہ بعض میں جہاد نہ تھا، اور بعض میں بوجہ خصوص بعثت انبیاء سابقین کے سب اقوام کیلئے عام نہ تھا، اور ظاہر ہے زیادہ عمل سے زیادہ اجر ہے بلکہ صرف وجہ ثانی بھی کافی ہے، پس یہ بھی من جملہ اسباب خیریت اس اُمت کے ہوا، اور اس میں منحصر نہ سمجھا جائے اور بھی وجوہ خیریت کے وارد ہوئے ہیں۔"[1]

امر اور نہی کا شرعی حکم

باب اوّل میں جتنی آیات واحادیث ذکر ہوئی، ان میں سے بعض کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے، بعض نصوص میں اس ذمہ داری کو ادا نہ کرنے پر مختلف عقوبات ووعیدات مذکور ہیں ، ان تمام نصوص سے بڑی وضاحت کیساتھ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک شرعی فریضہ ہے، کیونکہ بعض نصوص میں صیغہ امر کیساتھ حکم دیا گیا ہے اور مطلقِ امر وجوب کیلئے آتا ہے، اور لعن وغیرہ جو وعیدات وارد ہوئی ہیں وہ بھی ایک ضروری حکم کو چھوڑنے ہی پر مرتب ہوتے ہیں، اس لئے اس کی فرضیت میں کوئی شک نہیں، بلا عذر چھوڑنا گناہ ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مِن جملة الكبائر ترك القادر الأمر بالمعروف والنّهي عن المنكر."[2]

البتہ یہ فرضیت تمام مسلمانوں پر ہے یا بعض افراد کے کرنے سے بھی تمام لوگ شرعاً سبکدوش ہو جائیں گے ؟ اُصولی الفاظ میں یہ فرضِ عین ہے یا فرضِ کفائی؟

---

[1] بیان القرآن، ج ص ادارہ تالیفات اشرفیہ

[2] الرسائل الزينية، الرسالة الثالثة والثلاثون،ص354

جمہور فقہاءِ کرام کے نزدیک یہ فرضیت اور وجوب کفائی ہے، یعنی اگر بعض لوگ بھی یہ فریضہ سرانجام دیں تو بھی تمام لوگ بری ہو جائیں گے، ہر ایک فرد کا امر بالمعروف یا گناہوں پر نکیر کرنا کوئی ضروری نہیں، بعض حضرات فقہاء و مفسرین اسکو فرضِ عین سمجھتے ہیں۔

دونوں حضرات کا مستدل یہ آیت کریمہ ہے:

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔"

"اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے اور اچھے کاموں کا حکم کرتی رہے اور برے کاموں سے روکتی رہے اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں"۔[1]

جو حضرات اس کے فرضِ کفایہ ہونے کے قائل ہیں، وہ یہاں "منکم" میں لفظ "من" کو تبعیضیہ قرار دیتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم میں کچھ لوگ ایسے ہوں کہ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں "جب بعض افراد کی طرف حکم متوجہ ہے تو فرضِ کفائی ہی ہے، فرضِ عین میں حکم تمام مکلفین کو عام ہوتا ہے، جیسے "أقيموا الصلوة" اٰتوا الزکوة" وغیرہ نصوص میں بعض افراد کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تمام ہی افراد کو حکم دیا گیا۔

جن حضرات کے نزدیک یہ ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے وہ اس لفظ "من" کو تبعیض کیلئے نہیں سمجھتے، ان کا مؤقف یہ ہے کہ دیگر نصوص میں حکم تمام اُمت کو دیا گیا، اسلئے تمام ہی اُمت اس کی مکلف ہے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ تمام اُمت کو حکم

---

[1] آل عمران : 104

دیا جانا فرض عین ہونے کی کوئی دلیل نہیں، مثلاً جہاد کے باب میں جتنی نصوص و آیات ہیں، ان میں سے متعدد نصوص اُمت ہی کی طرف متوجہ ہیں، لیکن اس کے باوجود جمہور کے قول کے مطابق جہاد عام حالات میں فرضِ کفایہ ہی ہے۔

فرضِ عین یا کفایہ ہونے کا فیصلہ

تمام نصوص پر غور و فکر کرنے سے جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان احکامات سے اصل مقصود منکر کا ازالہ اور معصیت ختم کرنا ہی ہے، اور جب بعض افراد کے کہنے یا کرنے سے وہ منکر ختم ہو سکتا ہے تو تمام اُمت پر واجب ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

امام ابو بکر جصاص (المتوفی ۳۷۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قال أبو بكر قد حوت هذه الآية معنيين أحدهما وجوب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر والآخر أنه فرض على الكفاية ليس بفرض على كل أحد في نفسه إذا قام به غيره لقوله تعالى ولتكن منكم أمة وحقيقته تقتضي البعض دون البعض فدل على أنه فرض على الكفاية إذا قام به بعضهم سقط عن الباقين ومن الناس من يقول هو فرض على كل أحد في نفسه ـ والذي يدل على صحة هذا القول أنه إذا قام به بعضهم سقط عن الباقين كالجهاد وغسل الموتى وتكفينهم والصلاة عليهم ودفنهم ولولا أنه فرض

على الكفاية لما سقط عن الآخرين بقيام بعضهم به۔"[1]

"یہ آیت دو معانی پر مشتمل ہے، ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضروری ہونے پر، اور دوسری اس بات پر کہ یہ فرض کفایہ ہے، اگر کوئی بھی ایسا کررہا ہو تو (باقی) تمام افراد پر فرض نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان" ولتكن منكم" اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ صرف بعض افراد بھی کافی ہوں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے، اگر بعض لوگ بھی سرانجام دیں تو دیگر افراد کے حق میں فرضیت ساقط ہوگی، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہر شخص پر مستقل طور پر ضروری ہے۔۔۔ (پہلے) قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر بعض افراد بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں تو دوسرے لوگوں سے فرضیت ساقط ہو جاتی ہے جیسے کہ جہاد، مردوں کو غسل دینا ان پر نماز جنازہ پڑھنا، دفنانا (وغیرہ اُمور کہ کچھ لوگ بھی یہ کام کریں تو فرض پورا ہو جائے گا) اگر یہ فرض کفایہ نہ ہوتا تو بعض افراد کے کرنے سے دوسرے لوگوں سے فرضیت ساقط نہ ہوتی۔"

علامہ آلوسی (المتوفی ۱۲۷۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت اور اختصار کیساتھ یہ اختلاف ذکر فرمایا اور پھر جمہور کے مؤقف کا رجحان تحریر فرمایا۔ آپ لکھتے ہیں:

"أن العلماء اتفقوا على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر من فروض الكفايات ولم يخالف في ذلك إلا النزر، ومنهم الشيخ أبو جعفر من الإمامية قالوا: إنها من فروض

[1] أحكام القرآن للجصاص،باب فرض الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، سورة أل عمران، رقم الأية:104،ج2/ 315

الأعيان۔"[1]

"علماء (کرام) اس بات پر متفق ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فروض کفایہ میں سے ہے، اس میں چند ایک کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا، انہی میں سے (فرقہ) امامیہ کے شیخ ابو جعفر بھی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ یہ فرض عین ہے۔"

فرضِ کفایہ کی تعریف اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ غلط فہمی بھی دور کرنی ضروری ہے جو فرض کفایہ کے عنوان سے اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ بس ایک دو یا متعدد افراد کا کام کرنا کافی سمجھا جاتا ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چند افراد کی وجہ سے تمام علاقے والے بریٔ الذمہ ہو جائیں گے۔

یہ ایک سنگین غلط فہمی ہے جو علماء کے حلقوں تک جاری و ساری ہے، اور اسی غلط فہمی کے نتیجہ میں اکثر فروض کفایہ کا یہ حال ہو چکا ہے کہ ان کے مشروع کرنے سے شریعت کے جو مقاصد مد نظر تھے، جن بلند اہداف اور نیک مصالح کیلئے ان احکام کو واجب کیا گیا تھا، وہ قطعاً پورے نہیں ہو رہے۔

بعض سعادت مند لوگ ضرور اس میں لگے ہوتے ہیں لیکن وہ مطلوبہ کام کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتے، مگر اس کے باجود دیگر لوگ ان کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤاخذہ سے بری خیال کر لیتے ہیں، اسلئے فرضِ کفایہ کا صحیح مفہوم و نوعیت جاننا ضروری ہے۔

---

[1] روح المعاني ،سورة أل عمران،رقم الآية:104،ج 2/ 238

شرعی احکامات کے درجہ بندی کی حکمت

دراصل بات یہ ہے کہ شریعت کے تمام تکلیفی احکام کا مقصد انسان کی دنیوی واُخروی مصلحت اور کامیابی ہے، شریعت کا ایک اہم بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں کس طرح کامیاب وشادمان رہے، اس مقصد کیلئے کچھ اختیاری احکامات دئے جاتے ہیں، جس میں انسان کوئی بھی پہلو اختیار کرنے کا مجاز ہوتا ہے، مسئلہ کے کسی بھی جانب کو اختیار کرنے میں اس پر کوئی روک ٹوک نہیں، کیونکہ یہ احکامات انسان کی کامیابی میں لازمی حیثیت کے حامل نہیں ہوتے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کرنا یا جن سے بچے رہنا کامیابی کیلئے ضروری ہوتا ہے، ایسے کاموں کو فرض وواجب یا حرام اور مکروہِ تحریمی قرار دیا جاتا ہے، انسان کے دنیوی کامیابی اور اُخروی نجات کیلئے یہ احکامات انتہائی ضروری ہوتے ہیں، پھر ان میں سے بعض مرکزی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں ان کا حکم اور زیادہ تاکید کے ساتھ نازل ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان اسی متعین پہلو کو اختیار کرنے کا پابند ہوتا ہے جس کا شریعت کی جانب سے اس کو حکم دیا گیا، اس کی خود مختاری ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ ایسا کرنا دونوں جہانوں کی کامیابی کی راہ میں مضر ہوتا ہے۔

پھر ان میں سے بعض احکام وہ ہوتے ہیں جن کی حیثیت پوری اُمت کے فلاح وبہبود کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی سی ہوتی ہے کہ جس کے بغیر اُمت کی حقیقی کامیابی ممکن نہیں ہوتی، لیکن چونکہ اس کا تعلق پوری اُمت سے ہوتا ہے، اسلئے مجموعی طور پر پوری اُمت کو اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمام یا خاص افراد کو مکلف نہیں کیا جاتا، اس قسم کے احکام کو فرض کفائی یا واجب علی الکفایہ کہا جاتا ہے، جس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ شریعت کو ان اُمور کا بجالانا لازمی طور پر منظور ومقصود ہے، اس کے بغیر حقیقی کامیابی متصور نہیں، البتہ چونکہ کامیابی

کے لئے فی نفسہٖ کام کرنا ضروری ہے جس کیلئے بعض افراد کی بجاآوری کافی ہے، اسلئے رحم وکرم اور یسر وسہولت کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر اُمت کے تمام افراد پر فرضیت یا وجوب کا یہ اضافی بوجھ نہیں ڈالا گیا، بلکہ بعض افراد کا کرنا بھی کافی ہے۔

پھر چونکہ شریعت کو ان احکام کا بجالانا مقصود و منظور ہوتا ہے، اسلئے جس طرح کہ افراد کی تعیین و تشخیص نہیں ہوتی، یوں ہی تحدید بھی نہیں کی جاتی کہ اتنے افراد یہ ذمہ داری نبھائیں تو تمام افراد کا ذمہ بری ہو جائیگا، بلکہ شریعت کی طرف سے افراد سے بالکل قطع نظر کرکے حکم دیا جاتا ہے، پھر مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غور وفکر کریں کہ کیا جو خوش بخت افراد اس کی ادائیگی میں مصروف ہیں، ان سے یہ کام اچھی طرح پورا ہو رہا ہے یا مزید افراد کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف اوقات وحالات اور ماحول و معاشرہ میں اس کے درمیان تفاوت ہو سکتا ہے۔

اُصولی لحاظ سے فرضِ کفایہ کی حقیقت

علماءِ اُصول دین کی اصطلاحات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، ان حضرات نے فرضِ کفایہ کو بالکل درست اور مناسب عنوان دیا ہے "الحقوق الغیر المحدودۃ" یعنی وہ حقوق جس میں حد بندی نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ شاطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۹۰ ھ) نے ایک مستقل باب باندھا ہے جس میں آپ نے فرضِ عین اور فرض کفایہ کی حقیقت سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کی طرف سے انسان کے اُوپر جو واجبات عائد کی جاتی ہیں، چاہے اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو جیسے نماز، روزہ وغیرہ یا وہ واجبات حقوق العباد کے ضمن میں داخل ہوں، غرض ان تمام حقوق اور واجبات کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف۔ وہ واجبات جن کی حدود، مقدار اور ترتیب شریعت کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں جیسے نماز، روزہ کہ اس کے تمام تر تفصیلات خود شارع کی طرف سے واضح اور متعین ہیں، اس قسم کے واجبات کا حکم یہ ہے کہ یہ ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے، تمام افراد اس کے مکلف ہیں، اگر کسی معاشرے کے تمام افراد یہ واجبات بجالارہے ہوں لیکن کوئی ایک شخص اس سے غفلت کا معاملہ کرے تو دیگر افراد کے بجالانے کی وجہ سے اس کا ذمہ فارغ نہیں ہوگا، بلکہ حکمِ خداوندی اس کی طرف بدستور متوجہ رہے گی اور نہ کرنے کی وجہ سے عذابِ خداوندی کا مستحق ہوگا۔

ب۔ وہ واجبات اور ذمہ داریاں جو شریعت کی طرف سے انسانیت پر عائد کی جاتی ہیں، لیکن اس کے حدود و مقدار شریعت کی طرف سے مقرر نہیں کیے جاتے، اس کا طریقہ کار مقرر نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک عمومی حکم دیا جاتا ہے کہ مثلاً ان جیسے حالات میں یہ کام تم نے کرنا ہے، کب کتنا اور کیسے اس کا فیصلہ اسی بندے کے سپرد کردیا جاتا ہے جس کو ان حالات سے واسطہ پیش آجائے کہ وہ درپیش موقع و محل کو مدنظر رکھ کر ان تمام باتوں کا فیصلہ کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

جیسے انسانیت کو حکم ہوا: "أطعموا القانع والمعتر" بھوکے اور لاچار لوگوں کو کھلانا انسان کے ذمے لگایا گیا، لیکن کتنا اور کیسا کھانا کھلایا جائے؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی، ظاہر ہے کہ اس کی تعیین و تحدید کافی مشکل ہے، اگر تعیین کر بھی دی جائے تو بھی بعض اوقات اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، کیونکہ ضروریات مختلف ہوتی رہتی ہیں اور دوسری طرف ضرورت مند کی طبیعت اور فطری مزاج کی وجہ سے اس پر خاصا اثر پڑتا ہے، اسلئے شریعت کی طرف سے اس کی کوئی تشخیص نہیں کی گئی، بلکہ مکلف کی ذمہ داری ہے کہ وہ موقع محل کے مطابق ان تمام باتوں کا فیصلہ کرکے شریعت

کے تقاضا پر عمل کرے۔

علامہ شاطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان جیسے احکام کے حدود اور اس کا طریقہ کار طے نہ کرنا ہی شریعت کی طرف سے اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ یہ ہر شخص کی ذمہ داری نہیں، تمام انسانیت پر یہ احکامات لاگو کرنا شریعت کا منشا نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان جیسے افراد کی ضرورت پوری کی جائے، لہٰذا اگر کوئی ایک بندہ خدا بھی یہ سعادت حاصل کرے تو چونکہ شریعت کا تقاضا پورا ہو گیا اسلئے دوسرے لوگوں کا ذمہ بھی فارغ ہو گیا۔

اس تقسیم کے بعد آپ نے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" بلکہ تمام فروض کفایہ کو اسی دوسری قسم میں داخل قرار دیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

"ومثاله: الصدقات المطلقة وسد الخلات، ودفع حاجات المحتاجين، وإغاثة الملهوفين، وإنقاذ الغرقى، والجهاد، والأمر بالمعروف، والنهي عن المنكر، ويدخل تحته سائر فروض الكفايات. فإذا قال الشارع: {وأطعموا القانع والمعتر} أو قال: "اكسوا العاري"، أو: {وأنفقوا في سبيل الله} فمعنى ذلك طلب رفع الحاجة في كل واقعة بحسبها، من غير تعيين مقدار، فإذا تعينت حاجة؛ تبين مقدار ما يحتاج إليه فيها، بالنظر لا بالنص، فإذا تعين جائع؛ فهو مأمور بإطعامه وسد خلته، بمقتضى ذلك الإطلاق، فإن أطعمه ما لا يرفع عنه الجوع؛ فالطلب باق عليه ما لم يفعل من ذلك ما هو كاف ورافع للحاجة التي من أجلها أمر ابتداء، والذي هو كاف يختلف باختلاف الساعات

والحالات في ذلك المعين. "

" (غیر محدود حقوق کی مثال) جیسے صدقے، ضرورت مند لوگوں کی مشکلات ختم کرنے اور ضروریات پوری کرنے کا حکم، بے کس افراد کی مدد کرنے اور ڈوبنے والوں کو بچانے کا حکم، جہاد اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کے احکامات، (بلکہ) اس کے تحت تمام فروض کفایہ داخل ہو جاتے ہیں، لہٰذا جب شریعت کا حکم آیا "أطعموا القانع والمعتر" تو اس کا مقصود یہ ہے کہ ہر واقعہ میں اسی کے اعتبار سے ضرورت پوری کی جائے اس کی کوئی مقدار متعین نہیں، بلکہ جب ضرورت پیش آجائے تو اس میں غور کرنے سے قدرِ ضرورت خود بخود واضح ہو جائے گی، نص کی ضرورت نہیں، جب کسی بھوکے سے واسطہ آجائے تو اس کو کھلانے اور اس کی ضرورت پوری کرنے کا حکم ہے، لہٰذا اگر اتنا کھلایا جس سے بھوک دور نہیں ہوا تو حکم پھر بھی باقی ہے جب تک بقدر کفایت کھانا نہ کھلائے جس سے فقیر کی وہ ضرورت پوری ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو کھلانے کا حکم دیا گیا تھا، اب بقدرِ کفایت در پیش مختلف اوقات اور حالات کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔"[1]

فرضِ کفایہ کا مفہوم اُصولیین کی نظر میں

علماءِ اُصولیین اور فقہاء کرام نے فرضِ کفائی کی یہی تعریف فرمائی ہے، چنانچہ علامہ کمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی شرح کرتے ہوئے ان کا تلمیذ رشید مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن امیر الحاج (المتوفی ۸۷۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:

[1] الموافقات ،القسم الثاني كتاب الأحكام، المسألة التاسعة: الحقوق الواجبة، 77/1 دار الكتاب العربی۔

" (مسألة الواجب على الكفاية) وهو مهم متحتم مقصود حصوله من غير نظر بالذات إلى فاعله فتناول ما هو ديني كصلاة الجنازة ودنيوي كالصنائع المحتاج إليها وخرج المسنون؛ لأنه غير متحتم وفرض العين۔"

"واجب کفائی اس ضروری اور حتمی امر کا نام ہے جس کا کرنا مقصود ہو، کرنے والے کو دیکھنا مقصود نہ ہو، لہٰذا یہ تعریف دینی اُمور کو بھی شامل ہوگئی جیسے نماز جنازہ، اور دنیوی اُمور کو بھی جیسے وہ (مختلف پیشے) جن کی ضرورت ہو، مسنون اعمال اس تعریف سے نکل گئے، کیونکہ وہ ضروری نہیں ہوتے اور فرض عین بھی نکل گیا (کیونکہ اس میں کرنے والے کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔)"[1]

فرض عین یا کفائی قرار دینے کی حکمت

علامہ احمد بن ادریس القرافی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید کتاب " الفروق" میں اس بات کے لیے ایک مستقل باب باندھا ہے کہ فرض عین اور کفایہ میں کیا فرق ہے؟ بعض احکامات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرض عین ہے اور بعض چیزوں کو فرض کفایہ قرار دیا جاتا ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس تقسیم میں شریعت کی کیا مصلحت ہے؟

آپ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ افعال کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ایک قسم وہ کام ہیں جن کو بار بار کرنے سے نئے نئے فوائد حاصل ہوتے ہیں

---

[1] التقرير والتحبير علي تحرير الكمال بن الهمام،الباب الأول في الأحكام، مسألة الواجب على الكفاية، 135/2-

جیسے نماز کہ ہر بار نماز پڑھنے سے نمازی کو مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۲۔دوسری قسم ان افعال کی ہے جن کا اصل مقصود ایک بار کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، دُہرانے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا، مثلاً کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہے کسی نے اس کی جان بچانے کیلئے دریا میں غوطہ لگایا اور اس کو بحفاظت باہر نکالا، اب اس غوطہ لگانے کا یہی ایک فائدہ تھا جو حاصل ہو چکا، اس کے بعد اگر کوئی غوطہ لگاتا ہے تو کوئی خاص فائدہ اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

علامہ قرافی فرماتے ہیں کہ پہلے قسم افعال فرض عین قرار دیئے جاتے ہیں اور دوسری قسم افعال کو فرض کفایہ کے درجہ میں رکھا جاتا ہے۔[1]

الحاصل: فرضِ کفائی ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر اتنے افراد یہ کام کرتے رہیں جن سے اس حکم کے مقاصد پورے ہوں، تو یہ اس حکم کی بجاآوری اور تعمیل متصور ہوگی، اور یوں سمجھا جائے گا کہ اُمت نے اس حکم پر عمل درآمد کر لیا، لیکن اگر کام کرنے والے افراد اتنے ہوں جس سے اصل مقاصد اور متعینہ اہداف و مقاصد کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہو تو ایسی صورت میں پوری اُمت کے سر اس کی ذمہ داری عائد ہو گی۔

لہذا راجح قول کے مطابق جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے تو اب ہر شخص کو اپنی علاقائی صورت حال پر غور کرنے اور پوری دیانتداری سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہمارے گرد و پیش ماحول میں اس حکم خداوندی کی تکمیل اور تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیا ہمارے ہاں اتنے افراد یہ کام کر رہے ہیں جس سے منکرات کا ازالہ

---

[1] الفروق، الفرق الثالث عشر بين قاعدتى فرض الكفاية وفرض العين، ص 132، المكتبة العصرية،

یا تقلیل ہو؟ کیاافرادِ اُمت کے جم غفیراور نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں صرف دوچندافراد کے کام کرنے کے طفیل ہم اس حکم خداوندی کے ترک کرنے میں عنداللہ معذور متصور ہوں گے؟

شرعی احکام کی دو قسمیں

شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں،ایک قسم ان احکام کی ہے کہ شریعت نے اس کی فرضیت،وجوب وغیرہ درجہ مقرر کیااور ساتھ اس کی کوئی مخصوص شکل بھی ضروری قرار دیدی،یعنی اُمت کو حکم بھی دیا گیااور تعمیل حکم کی صورت بھی بتلائی گئی،مثلاً نماز،روزہ،حج وعمرہ،وغیرہ،عبادات عموماًاس نوعیت کے ہیں،دوسری قسم میں وہ احکام ہیں کہ شریعت کی طرف سے اس کے کرنے کا حکم تو دیا گیا لیکن اس کی کوئی متعین شکل اور مخصوص صورت مقرر نہ کی گئی،بلکہ اُمت کواس حد کا اختیار دیا گیا کہ وہ زمان ومکان کے مطابق کوئی مناسب شکل دیکراس حکم کی تعمیل کریں،مثلاً جہاد،کہ شریعت نے کبھی اس کو فرض کفایہ اور بعض حالات میں فرض عین تو قرار دیا،لیکن اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ تلوار لے کر لڑنا ضروری ہے یا کلاشنکوف وغیرہ بندوق کے ذریعے اس کا انتظام کرنا ہوگا؟اس قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔

پہلی قسم کا حکم یہ ہے کہ جس طرح ان احکام کی تعمیل ضروری ہے،یوں ہی اس کی مخصوص ومقررہ شکل کی بھی پوری پابندی کی جائے گی،اگر شرعاًاس مخصوص شکل کی پابندی کو فرض وواجب قرار دیا گیا تو فرض وواجب کی حد تک اس کا اہتمام لازم ہے اور اگر استحباب وندب کی حد تک اس کی ترغیب دی گئی ہو تو اسی حد تک اہتمام کرلینا مستحب ومندوب ہوگا،مثلاً نماز کا جو طریقہ شریعت میں مشروع کیا گیااس کی پابندی لازم ہے اور اس

کے بر خلاف کسی غیر منصوص طریقہ سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا بدعت کے زمرہ میں داخل ہو گا کیونکہ شریعتِ مطہرہ نے جب ایک خاص شکل کو متعین کیا تو اب اُمت کو اپنی طرف سے نئی شکل دینے کا اختیار نہیں رہا۔

دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ جب شریعت کی طرف سے کسی حکم کی تعمیل کے لئے کوئی شکل متعین نہیں کی گئی تو اُمت کی ذمہ داری ہے کہ حکم کی تعمیل کے لئے اپنے زمانے کی ضروریات و مصالح کے لئے کوئی ایسی شکل ترتیب دے جس سے شارع کا منشا پورا ہو سکے، اور چونکہ شارع کی طرف سے کوئی پابندی نہیں رکھی گئی اس لئے کسی خاص شکل کو لازم سمجھنا غلط اور غلو کے مترادف ہو گا، البتہ جو شکل جس شخص کے خیال میں زیادہ مفید اور دینی مصالح سے قریب تر ہو، اس کو چاہئے کہ اسی خاص شکل میں حکم کی تعمیل کرتا رہے لیکن بہر حال اس کی حیثیت ایک ذاتی رائے اور تجربہ کی ہے اس کو شرعی حکم کا درجہ دینا درست نہیں۔

دعوتِ دین کی کوئی خاص شکل متعین نہیں

"دعوتِ دین" اور "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا جو حکم اُمت کو دیا گیا ہے وہ بھی اسی قسم کے احکام میں سے ہے کہ خود اس حکم کا اہتمام کرنا تو اُمت پر لازم ہے لیکن اس کی کوئی مخصوص شکل یا خاص کیفیت شریعت نے ضروری قرار نہیں دی، گویا اُمت کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ موقع و محل کی مناسبت سے اس کے لئے کوئی بھی مناسب شکل اختیار کریں، لہٰذا اگر کچھ افراد تعلیم و تعلم کی صورت کو زیادہ مفید سمجھتے ہیں تو وہ یہی صورت اختیار کریں اور کچھ افراد اگر تزکیہ و احسان یا تالیف و تصنیف کی شکل کو مؤثر سمجھتے ہیں تو وہ اسی راستہ سے اصل حکم کی تعمیل کریں، اور اگر کوئی قتال و جہاد کو شارع کے منشا سے قریب تر تصور کرتا ہے تو وہ اسی میدان میں رہ کر اصل حکم شرعی پر عمل پیرا رہے اور اگر کوئی مروجہ

دعوت و تبلیغ کے نظم کو زیادہ مناسب خیال کرتا ہے تو وہ اسی طریقہ کار میں رہ کر حکم کی تعمیل کرتا رہے۔

دین کے مختلف شعبوں میں غلو کرنا

ان میں سے کسی بھی شکل وصورت اختیار کرنے والے افراد کے لئے دوسرے افراد پر محض اس لئے تنقید کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ میری پسندیدہ شکل کیوں اختیار نہیں کرتا؟ میری ترجیح کے خلاف طریقہ کار کیوں اپناتا ہے؟ میرے اپنائے ہوئے میدان سے ہٹ کر دوسرے میدانِ عمل کا کیوں انتخاب کیا؟ ایسی تنقید کرنا قطعاً غلط ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جس شکل کو زیادہ مناسب سمجھا ہے بس وہی ٹھیک ہے اور اس کی حیثیت شرعی حکم کی ہے جس کی خلاف ورزی کرنا گناہ اور قابلِ تنقید جرم ہے، یہ ایسا غلو ہے جس میں خواہ کوئی دینی فائدہ حاصل ہو یا نہ ہو، لیکن اس کے نتیجہ میں نقصان و مفاسد ضرور جنم لیتے ہیں، اس لئے اس سے گریز کرنا ضروری ہے۔

اصل مقصودِ دین کی خدمت، اقامت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے اور یہ درج بالا سب باتیں اسی کی مختلف صورتیں ہیں جو برائے خود مقصود نہیں ہیں، بلکہ اُصولی اصطلاح میں دین کے یہ مختلف شعبہ جات وسائل اور حسن لغیرہ ہیں، ان کو تقابلی انداز میں پیش کرکے کسی بھی شعبہ کی تنقیص کرنا ایک طرف تو قطعاً غلط اور بڑے غلو کی بات ہے دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کوئی بھی شعبہ الگ طور پر "سب کچھ" کا مصداق نہیں بن سکتا، بلکہ سب مل کر ہی اصل مقصود تک رسائی ہوسکتی ہے، اب اگر ہر شعبہ کے افراد اپنے ہی مشغلہ کو سب کچھ کا درجہ دیکر دوسرے دینی شعبہ جات کی تنقیص کریں گے تو لامحالہ اس سے اصل منزل دور سے دور تر چلا جائے گا، اس

کے نتیجہ میں جو کچھ نقصان ہو گا، وہ کسی صاحبِ بصیرت آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

نیکی اور بدی کے اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم

یہ جو تحریر کیا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے، یہ نفسِ امر اور نہی کا حکم ہے ورنہ جس چیز سے روکا جارہا ہے (منہی عنہ) یا جس نیکی کا حکم دیا جارہا ہو (مامور بہ) اس کے اعتبار سے احکام میں تفاوت ہو سکتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص مستحب کام میں کوتاہی کر رہا ہو تو اس کو امر کرنا مستحب ہے، اگر خدانخواستہ کسی فرض و واجب میں غفلت ولاپرواہی کا شکار ہو تو اس کام کا امر کرنا فرض و واجب ہے، اسی طرح جس منکر سے روکا جارہا ہو اس میں بھی یہی تفصیل ہے کہ مکروہِ تنزیہی سے روکنا اولیٰ و بہتر، مکروہِ تحریمی اور حرام سے منع کرنا واجب و فرض ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"والأمر بالمعروف يكون واجبا ومندوبا على حسب ما يؤمر به والنهي عن المنكر كذلك أيضا إن قلنا إن المكروه منكر شرعا۔"[1]

"جس بات کا حکم دیا جارہا ہو اس کے اعتبار سے امر بالمعروف کبھی واجب ہو گا اور کبھی مندوب و مستحب، اسی طرح اگر منکر کا معنی ناجائز سے کیا جائے تو نہی عن المنکر کا بھی یہی حکم ہے (کہ جس چیز سے روکا جارہا ہو اس کے اعتبار سے حکم بدلتا رہتا ہے۔)"

اسی طرح یہ جو حکم اُوپر درج ہوا، یہ عام حالات کا ہے، ورنہ بعض صورتوں میں

[1] روح المعاني ،سورة أل عمران،رقم الأية:104،ج 2 / 238-

فرض عین بھی ہو جاتا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اور بعض حالات میں خارجی عوامل واسباب کی وجہ سے ناجائز یا ممنوع بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ شرائط کے باب میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا۔

کیا موجودہ زمانے میں انفرادی اصلاح کافی نہیں؟

قرآن وسنت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بعض ایسی نصوص بھی وارد ہوئی ہیں، جن سے تقریباً ہر زمانے کے بعض اہل علم حضرات یہی سمجھتے رہے ہیں کہ ہمارے زمانے میں اس حکم کی اہمیت وفرضیت باقی نہیں رہی، کتب حدیث میں سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ مشہور ہے جس میں آپ نے یہی عقدہ حل کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی تھی۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت قیس بن ابی حازمؒ سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا:

"عن قيس بن أبي حازم، قال: سمعت أبا بكر الصديق، يقول: يا أيها الناس، إنكم تقرءون هذه {يأيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم} فإني سمعت رسول الله ﷺ يقول: «إن الناس إذا رأوا منكرا فلم يغيروه، يوشك أن يعمهم الله بعقابه".

"قیس بن حازم نے کہا کہ میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اے لوگو: تم اس آیت کو پڑھتے ہو (اور ظاہرِ آیت سے خیال کرتے ہوں کہ بس اپنی ہی اصلاح کافی ہے دوسروں کو سدھارنا کوئی ضروری نہیں) حالانکہ میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب لوگ کسی

منکر کو دیکھنے کے باوجود ختم نہیں کریں گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو عمومی سزا دیدے۔"[1]

یہ روایت مختلف طرق کے ساتھ روایت کی گئی ہے، تمام طرق کو مد نظر رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ نے باقاعدہ منبر پر بیٹھ کر یہ خطاب فرمایا تھا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اتنے اہتمام کے ساتھ خطاب کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے مبارک دور میں بھی بعض افراد کو اس آیت کی وجہ سے اشکال ہو رہا تھا، وہ حضرات اس آیت کے ظاہری مفہوم کی وجہ سے شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ انفرادی اصلاح کافی ہے، لوگوں کو حق کی تبلیغ کرنا، ان کو راہ راست پر لانا ضروری نہیں، تب ہی حضرت صدیقؓ کو اس اشکال کے دور کرنے کی ضرورت پیش آئی، خیر القرون کے اس مبارک دور کے بعد بھی ہر زمانے میں بعض حضرات کا یہی موقف رہا۔

اس اشکال کی بنیاد ایک تو یہی سورۃ مائدہ کی آیت کریمہ ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں ذکر ہو چکا، اور اس قسم کی بعض وہ احادیث ہیں جن سے یہ مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے مثلاً صحابی رسول حضرت ابو ثعلبۃ الخشنی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس میں اُنہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اسی آیت کے متعلق دریافت کیا، تو حضور ﷺ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ پوری روایت نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"أبو أمية الشعباني، قال: أتيت أبا ثعلبة الخشني، فقلت: يا أبا ثعلبة، كيف تصنع في هذه الآية؟ قال: أية آية؟ قلت:

---

[1] شرح السنة للبغوي،كتاب الرقاق، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ، رقم الرواية: 4153، ج344/14

قول الله سبحانه وتعالى: {عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم} فقال: أما والله لقد سألت عنها خبيرا، سألت عنها رسول الله ﷺ فقال: «بل ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر، حتى إذا رأيت شحا مطاعا، وهوى متبعا، ودنيا مؤثرة، وإعجاب كل ذي رأي برأيه، ورأيت أمرا لا بد لك منه، فعليك نفسك، ودع أمر العوام، فإن وراءكم أيام الصبر، فمن صبر فيهن، قبض على الجمر، للعامل فيهن مثل أجر خمسين رجلا يعملون مثل عمله۔"

"ابوامیہ شعبانی کہتے ہے کہ میں نے حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے ہاں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اس آیت کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے؟ اُنہوں نے کہا، کس آیت کے بارے میں؟ میں نے یہ آیت تلاوت کی، توآپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا، توآپ ﷺ نے فرمایا: تم(اس فریضہ کی ادائیگی سے باز نہ رہو) بلکہ نیکیوں کا حکم دیتے رہو یہاں تک کہ جب تم بخل کو دیکھو کہ لوگ اس کی اتباع کرنے لگے ہیں، جب تم خواہشات نفس کو دیکھو کہ لوگ اس کے غلام بن گئے ہیں، جب دنیا کو دیکھو کہ لوگ اس کو آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، جب تم دیکھو کہ ہر عقل مند اور کسی مسلک کا پیرواپنی ہی عقل اور اپنے ہی مسلک کو سب سے اچھا اور پسندیدہ سمجھنے لگا ہے،اور جب تم کسی ایسی چیز کو دیکھو کہ جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو تو اپنے آپ کی فکر کرو۔اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو(بلکہ ان سے گوشہ نشینی اختیار کرو) کیونکہ تمہارے سامنے آخرزمانہ میں ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا ضروری ہوگا،لہٰذا جس شخص نے ان دنوں میں صبر کرلیا اس کی حالت یہ ہوگی کہ گویا اس نے اپنے

ہاتھ میں انگارا لے لیا ہے اور ان دنوں میں جو شخص دین وشریعت کے احکام پر عمل کرے گا اس کو ان پچاس لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا جو اس شخص جیسے عمل کریں۔"[1]

اس روایت میں حضور ﷺ نے پانچ اُمور کی نشاندہی فرمائی کہ جب تک یہ پانچ اُمور نہیں ہوتے تولوگوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ضروری ہے، اور جب اُمت میں یہ پانچ اُمور پیدا ہو جائیں گے تو اس وقت اپنی انفرادی اصلاح کافی ہے، عوام کو سدھارنا، ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا کوئی ضروری نہیں۔

جن پانچ اُمور کو اس حدیث مبارکہ میں نشانِ منزل قرار دیا گیا ان کا حاصل مختصرا یہ ہیں:

۱۔ شریعت کی طرف سے انسان پر جو حقوق لازم کر دئے گئے ہیں، ان کے اداء کرنے کے مقابلے میں بخل کو ترجیح دی جانے لگے۔

۲۔ احکام شرعیہ کے مقابلے میں نفسانی خواہشات پر عمل کیا جانے لگے۔

۳۔ دین و آخرت کے بدلے دنیا کو ترجیح دی جانے لگے۔

۴۔ ہر آدمی اپنی سوچ و فکر سے مطمئن اور اسی پر کاربند ہو، خود پسندی کا مرض عام ہو، مشورے کی روایت ختم ہو جانے لگے۔

۵۔ بداخلاقی اور ناجائز اُمور کا ایسا طوفان ہو جس میں آدمی اپنے آپ کو مجبور تصور کرنے لگے۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہ اُمور کمی وزیادتی کے ساتھ تقریباً ہر دور میں موجود رہے ہیں، اسلئے ہر دور میں بعض حضرات کو ان اُمور کی وجہ سے اشتباہ ہوتا رہا، کیونکہ جب وہ معاشرہ میں ان اُمور کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے اور پھر ان آیات واحادیث کو ملاحظہ

---

[1] شرح السنة للبغوي،كتاب الرقاق، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ، رقم الرواية: 4156، ج347/14-

کرتے، تو یہی فیصلہ کرتے کہ "عصرِ حاضر "میں اپنی ہی اصلاح کافی ہے، دوسروں کی اصلاح وصلاح کے پیچھے پڑ جانے کا یہ زمانہ نہیں، محققین حضرات کی کتابوں میں یہ نظریہ مختلف اہل علم سے منقول ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"لقد أجمعَ السلَف الصّالح عَلى التحذير من أهِلِ زمَانهم وَمِن قرب مَكانِهم، وَآثروا العزلةَ وَالخلوةَ وَاجتنبُوا الخلطَة وَالحلوة، وَأمرُوا بِذلكَ وَتواصوا به هُنالك، وَلا شك أنهم كانوا أنصَح وَبأمِر الدين أبصر، وَأن الزمَان ليسَ بَعدهم خَيراً ممَا كَانَ بَل شراً مِنهُ وَأمَرّ۔ " [1]

"سلف صالحین نے اپنے ہم زمانہ لوگوں اوران کے قریب ہونے سے بچنے، بچانے پر اتفاق کیاہیں،(لوگوں کے ساتھ رہنے کے مقابلے میں) گوشہ نشینی کو ترجیح دی ہیں، لوگوں کے ساتھ ہونے سے اجتناب کیا ہیں، اُنہی (باتوں) کا امر ووصیت کرتے رہیں،اوریقیناًوہ زیادہ خیر خواہ تھے، دینی اُمور کے متعلق زیادہ بصیرت والے تھے، اوران کے بعد کا زمانہ پہلے سے زیادہ اچھا نہیں بلکہ بہت برااور کڑواہے۔"

آپ نے امام سفیان ثوری، فضیل بن عیاض اور قاری شاطبؒی وغیرہ جیسے اعیان حضرات کے حوالہ سے نقل فرمایا کہ ان حضرات نے اپنے اپنے زمانے کو مندرجہ بالاحدیث کا مصداق سمجھ کر"أيام الصبر "صبر کازمانہ یعنی انفرادی اصلاح پر اکتفا کرنے کازمانہ قرار دیا،اوراپنے دور میں خلوت وعزلت کی ترغیب وتاکید فرماتے رہے۔[2]

---

[1] شم العوارض في ذم الروافض ص 94

[2] علامہ عبد الغنی بن اسماعیل نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ "تکمیل

جمہور کا مؤقف اور ان کے دلائل

لیکن یہ ان حضرات کا انفرادی مؤقف رہا جو اگرچہ اُمت کی خیر خواہی، غمخواری، دل سوزی اور اخلاص پر مبنی تھا، مگر جمہور اُمت نے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کیا۔

جمہور علماء و فقہاء کے مد نظر وہ نصوص تھے جس میں پوری اُمت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلقاً حکم دیا گیا تھا، ان نصوص میں کوئی تخصیص واستثناء نہیں، اور درحقیقت دین اسلام کا مزاج بھی یہی ہے، پوری اُمت کو دین حق کی دعوت دینا، خدا اور رسول کی طرف بصیرت کے ساتھ بلاتے رہنا اس دین فطرت کا طرہ امتیاز ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

"قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔"

"کہہ دو میرا اور میرے تابعداروں کا بصیرت کے ساتھ یہ راستہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہوں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔(ترجمہ حضرت لاہوری

النعوت فی لزوم البیوت" تحریر فرمایا ہے جو مکتبہ القاہرہ سے چھپا ہے اس میں آپ نے اپنے زمانے کے متعلق دسیوں اخبار وآثار سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ یہ خلوت وعزلت ہی کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں لوگوں—

- سے عزلت وانفراد ہی اختیار کر لینا چاہیئے، آپ کی تاریخ وفات سن 1143ھ ہے۔

صاحب)[1]

انفرادی اصلاح کافی ہونے کے دلائل کا تجزیہ

جن دلائل سے انفرادی اصلاح کے کافی ہونے پر استدلال کیا گیا، وہ تسلی بخش نہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بنیادی طور پر استدلال مندرجہ بالا آیت کریمہ اور حضرت ابو ثعلبہ الخشنی حفظہ اللہ کی درجہ بالا روایت سے کیا جاتا ہے، ذیل میں ان دونوں استدلالات کے متعلق چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

آیت کریمہ " علیکم أنفسکم" سے استدلال کا جواب

جہاں تک مندرجہ بالا آیتِ کریمہ سے استدلال کرنے کا مسئلہ ہے تو یہ درست نہیں، کیونکہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان پر اپنی اصلاح کرنی ضروری ہے، اپنے سارے اعمال وافعال کو شریعت کے ترازو میں ڈھالنا ان کی ذمہ داری ہے، جب کوئی بندہ مؤمن اپنی زندگی شریعت کے مطابق بنا کر ہدایت یافتہ ہو جائے تو دوسرے لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا اس پر کوئی اثرِ بد نہیں پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ احکام شریعت میں ایک بنیادی حکم اور انتہائی اہمیت کا حامل ایک عمل "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" بھی ہے، اس حکمِ خداوندی کو بجالانے کے بغیر مکمل طور پر ہدایت یافتہ ہونا کیسے ممکن ہے؟

لہذا آیتِ کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سمیت تمام احکام شریعت کو بجالایا جائے، تو بس یہی بندہ مؤمن کی ذمہ داری اور اس کا فرضِ منصبی ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی بندہ خدا اس کی بات نہ مانے اور اپنے گمراہی پر ڈٹا رہے تو اس

---

[1] یوسف :108

گمراہی کا وبال اسی کے سر ہے، بندہ مؤمن اس کے گمراہی کا کوئی ذمہ دار نہیں، کیونکہ یہی تبلیغ و تلقین ہی اس کی ذمہ داری تھی جو اس نے نبھائی، منوانا ہر فرد پر ہر حال میں نہ واجب ہے نہ ممکن، عام مسلمان تو در کنار، خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خطاب ہے:

" لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ۔ "

"آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔"[1]

گویا آیت کریمہ کا وہی معنی ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں دوسرے اسلوب سے سمجھائی گئی:

"إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ۔"

"بے شک ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری سنانے کے لیے اور ڈرانے کے لیے اور تم سے دوزخیوں کے متعلق باز پرس نہ ہو گی۔"[2]

یعنی فریضہ دعوت بجالانے کے بعد بھی اگر کوئی دین حق یا اس کے احکام پر عمل نہ کرے تو اس میں داعی پر کوئی گناہ و عتاب نہیں۔

آیتِ کریمہ کا منشا حضرات صحابہ کرام اور تابعین کی نظر میں

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے صحابہ کرام سے یہی تفسیر نقل کی ہے، چنانچہ

[1] الغاشیة : 22

[2] البقرة : 119

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

"عن حذيفة:"عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم، قال: إذا أمرتم ونهيتم".

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت کریمہ میں "إذا اهتديتم" کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تم امر اور نہی کرتے رہوں (تو لوگوں کی گمراہی آپ کیلئے کچھ مضر نہ ہوگی)۔ "[1]

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہدایت یافتہ ہونے کیلئے صرف اپنی ذاتی اصلاح ہی کافی نہیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا بھی اس کا ایک اہم جز ہے، لہٰذا اس آیت کی بناء پر امر و نہی سے پہلو تہی کرنا قطعاً درست نہیں، بلکہ اس میں تو مزید تاکید ہے کہ لوگوں کی گمراہی و ضلالت کے وبال و نحوست سے اسی وقت مکمل طور پر بچا جا سکتا ہے جب اپنے معاملات بھی درست ہوں اور ساتھ دوسروں کو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے۔

اس کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیق ،سعید بن المسیب اور سدی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے بھی آپ نے یہی تفسیر نقل کی ہے، بلکہ حضرت ابو بکر صدیق حفظہ اللہ نے تو واضح طور پر اس بات کی صراحت فرمائی، کہ اس آیت میں امر و نہی کے حوالے سے کوئی گنجائش یا رخصت نہیں دی جا رہی بلکہ تمام قرآن کریم میں اس حوالے سے زیادہ شدید آیت یہی ہے کہ اس میں بندہ مؤمن پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کی گئی ۔

---

[1] جامع البيان ،سورة المائدة، رقم الآية:105،11/ 148-

اور وہ ذمہ داری یہی ہے کہ مسلمان صرف اپنے اعمال وافعال ہی کا مکلف نہیں رہا، بلکہ اگر لوگوں کے ناجائز معاملات اور خلاف شرع اُمور کو دیکھے تو اس پر موقع و محل کے مناسب نکیر کرنا بھی ضروری ہے، اسی طرح فرائض و عبادات وغیرہ احکام شرعیہ میں کوتاہی کے وقت دعوت دینا بھی ضروری ہے۔

چنانچہ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عن قيس بن أبي حازم قال: صعد أبو بكر المنبر منبر رسول الله ﷺ، فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: يا أيها الناس، إنكم لتتلون آية من كتاب الله وتعدونها رخصة، والله ما أنزل الله في كتابه أشد منها:"يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم" والله لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليعمنكم الله منه بعقاب.
"

"حضرت ابو بکرؓ نے منبر رسول پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور فرمایا"اے لوگو: تم اللہ تعالیٰ کے کتاب میں سے ایک آیت تلاوت کرتے ہوں اور (اس کو غلط جگہ چسپاں کرتے ہوں، جس کی وجہ سے) تم اس کو گنجائش ورخصت سمجھتے ہوں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہی نہیں فرمائی، (وہ آیت یہ ہے)"يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم"اللہ کی قسم: تم امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کرتے رہوں ورنہ اللہ تعالیٰ تم کو عمومی عذاب دیں گے"۔[1]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"محققین کے نزدیک اس آیت کا صحیح معنی یہ ہے کہ جب تم تکلیفی احکام پورا کروگے تو دوسرے لوگوں کی کوتاہی تم کو کچھ نقصان نہیں دے گی، جیساکہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا"کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا" اور جب بات یوں ہے تو انسان کے تکلیفی احکام میں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے، جب کوئی شخص یہ سرانجام دے گا تو اس کے بعد اس پر کوئی عتاب و ملامت نہیں، کیونکہ وہ اپنی ذمہ داری نبھا چکا، اس پر صرف امر یا نہی کرنا تھا (جو وہ کرچکا، ہر حال میں قبول کرانا اس کی ذمہ داری میں داخل نہیں)۔" [2]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس استدلال کا یہی جواب دیا ہے۔[3]

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

امام طحاویؒ نے اپنی کتاب "شرح مشکل الآثار" میں اس آیت کریمہ سے متعلق ایک مستقل باب باندھا ہے، اس باب میں آپ نے اس آیت کے متعلق حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت ابو ثعلبہ ﷛ کی مندرجہ بالا روایت کی روشنی میں تفصیل سے بحث فرمائی ہے، حضرت صدیق ﷜ کی مذکورہ روایت کے مختلف طرق

[1] حوالہ سابقہ

[2] شرح النووي على مسلم،كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان، 2 / 22

[3] ملاحظہ ہو: شرح الأربعين النووية لابن حجر العسقلانی(112)

روایت کرنے کے بعد آپ نے اس کا یہی محمل بتایا ہے کہ یہ اس مخصوص زمانے کے متعلق ہے جو حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے، عام حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تاکیدی حکم ہے تمام مسلمان اس کے مکلف ہیں، لیکن جب وہ مخصوص زمانہ آئے گا تو پھر یہ تاکیدی حکم باقی نہ رہے گا، بلکہ اس وقت اپنی انفرادی اصلاح بھی کافی ہو گی۔

چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

"قال أبو جعفر: فعقلنا بهذا الحديث أن معنى قول أبي بكر رضي الله عنه: إن الناس يضعون هذه الآية في غير موضعها يريد بها سيعملونها في غير زمنها وأن زمنها الذي يستعمل فيه هو الزمن الذي وصفه رسول الله صلى الله عليه وسلم في حديث أبي ثعلبة بما وصفه به ونعوذ بالله عز وجل منه، وأن ما قبله من الأزمنة فإن فرض الله عز وجل فيه على عباده الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر حتى تعود الأمور إلى ما أمر الله عز وجل أن يكون الناس عليه من امتثال ما أمرهم الله به عز وجل والانتهاء عن ما نهاهم عنه...قال أبو جعفر: ففيما ذكرنا توكيد الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر حتى يكون الزمان الذي ينقطع ذلك فيه، وهو الزمان الذي وصفه رسول الله ﷺ في حديث أبي ثعلبة الذي لا منفعة فيه بأمر بمعروف ولا بنهي عن المنكر، ولا قوة مع من ينكره على القيام بالواجب في ذلك فسقط الفرض عنه فيه ويرجع

أمره فيه إلى خاصة نفسه، ولا يضره مع ذلك من ضل. هكذا يقول أهل الآثار في هذا الباب على ما قد صححنا هذه الآثار عليه۔"

"اس حدیث سے ہم یہ سمجھیں ہیں کہ حضرت ابو بکر کے اس قول کا(کہ لوگ اس آیت کو بے محل منطبق کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ عنقریب لوگ اس زمانے پر یہ حدیث حمل کریں گے جو در حقیقت اس کا زمانہ نہیں ہو گا، اس حدیث کا اصل مصداق وہ زمانہ ہے جس کے اوصاف آپ ﷺ نے ابی ثعلبہ کی روایت کردہ حدیث میں بیان فرمائے، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس زمانہ سے پہلے زمانے میں بندوں کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض رہے گی، یہاں تک کہ تمام اُمور اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہو جائے کہ جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کو بجالایا جائے، اور جن سے روکا ہے اس سے رُکا جائے۔

ابو جعفر کہتا ہے کہ ہماری ذکر کردہ تفصیلات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید مذکور ہے، یہاں تک کہ وہ زمانہ آجائے جس میں یہ تاکید (واہمیت) ختم ہو جائیگی، اور یہ وہی زمانہ ہے جس کے حالات آپ ﷺ نے حدیث ابی ثعلبہ میں بیان فرمائے ، (ایسازمانہ جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور نہ ہی نکیر کرنے والے کے پاس واجب کی ادائیگی کی طاقت ہو گی، تو ایسے زمانے میں اس سے فرضیت ساقط ہو جائیگی اور ذمہ داری اس کے اپنے نفس تک محدود ہو جائیگی، گمراہ ہونے والوں کی گمراہی اس کو کچھ نقصان نہیں دے گی۔"[1]

---

[1] شرح مشكل الآثار،باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله ﷺ في المراد بقول الله عز وجل: يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم ،3 / 213۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ آیت کریمہ مخصوص زمانے کے متعلق ہے، لیکن اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ یہ مخصوص زمانہ کب آئیگا؟ حدیث ابو ثعلبہؓ میں جو پانچ چیزیں ذکر ہو چکی وہ تو سب آج کل عام ہیں، لہٰذا جب حدیثِ مبارکہ میں کسی خاص زمانے کی تعیین و تحدید نہیں کی گئی، بلکہ کچھ خاص اوصاف بیان فرمائے گئے کہ اس زمانے کے یہ حالات ہوں گے، اور آج ہمارے اس زمانے میں یہ تمام اوصاف عام ہو چکے، تو حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ اس زمانے کو آیت کریمہ کا محمل ٹھہرادیا جائے، اور اس کے مطابق آج کے اس دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو لازم یا فرض نہ کہا جائے، یہ لزوم و فرضیت اس زمانے کے متعلق نہیں، بلکہ عصر حاضر میں اپنی انفرادی اصلاح کافی ہے، دوسروں کی فکر کرنا کوئی لازم یا فرض نہیں؟

حدیث ابو ثعلبہ سے استدلال کا جواب

سرسری نظر میں یہ استدلال کافی مضبوط معلوم ہوتا ہے، لیکن اوّلاً تو موجودہ زمانے کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرانا یقینی نہیں، بلکہ اس میں دو رائے ہو سکتی ہیں، کیونکہ حدیثِ مبارکہ میں صرف ان پانچ اُمور کا کسی زمانے میں پایا جانا مراد نہیں، ورنہ موجودہ زمانے کا کیا کہنا؟ صدیوں پہلے یہ امر بالمعروف محض تاریخ کا ایک واقعہ بن چکا ہوتا، کیونکہ تقریباً تمام ادوار میں یہ پانچوں کی پانچوں بیماریاں کسی نہ کسی حد تک موجود رہی ہیں، صحابہ کرام بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے مبارک دور کے علاوہ کسی ایسے دور کی نشاندہی بڑی مشکل سے کی جا سکے گی جس میں یہ اُمور بالکل موجود نہ رہے ہوں، حالانکہ ہر دور کے محققین علماء اور دوررس فقہاء ہمیشہ سے اس کی فرضیت کے قائل اور عملی لحاظ سے اس کے پابند رہے ہیں۔

حدیثِ مبارک کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے کی نشاندہی

فرمائی گئی وہ ایسا نامبارک زمانہ ہو گا جس میں یہ اُمور بد انسانیت کے اندر عام ہوں گی، یعنی صرف ان پانچ علامات بد کا وجود مقصود نہیں، بلکہ معاشرہ میں اس کا شیوع و عموم مراد ہے، بیسیوں آدمیوں میں ڈھونڈنے سے کوئی ایسا مرد مؤمن نہیں ملے گا جس کے قلب و دماغ کو اللہ تعالیٰ نے ان بیماریوں سے نجات کلی عطا فرمائی ہو، جب زمانے کی فضا ایسی ناہموار ہو، وہاں چونکہ مخاطب سے قبول کرنے کی اُمید کرنا کارِ عبث کے مترادف ہے، اسلئے ایسے زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا کوئی ضروری نہیں۔

جن حضرات مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کی یہ تفسیر کی تھی کہ یہ ایک خاص زمانے کے متعلق ہے جس میں مسلمان کے ذمے امر و نہی کا وجوب باقی نہیں رہے گا، اُنہوں نے بھی واجب نہ رہنے کی یہی وجہ لکھی ہے کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ہو گا، سیدنا حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے یہی منقول ہے۔[1]

آخری زمانے میں انفرادی اصلاح کافی ہونے کی بنیادی وجہ

امام ابن العربی المالکی (المتوفی ۵۴۳ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت ابو ثعلبہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی ان دونوں روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد اس کی یہی علت لکھی کہ زمانے کی سنگینی، ماحول کی آلودگی اور لوگوں کی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے یہ وجوب باقی نہیں رہے گا، کیونکہ ایک طرف تو قبول کرنے کی توقع نہیں، اور دوسری طرف اپنی جان و مال کو بھی خطرہ میں ڈالنا ہے، اسلئے ایسے زمانے میں وجوب باقی نہیں رہے گا، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"وذلك لعدم الاستطاعة على معارضة الخلق، والخوف

---

[1] جامع البیان فی تأویل القرآن،سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ:105، 11 / 139-

على النفس أو المال من القيام بالحق. وتلك رخصة من الله عز وجل يسرها علينا۔"

"یہ مخلوق کا مقابلہ نہ کرسکے اور حق پر قائم رہنے کی صورت میں اپنے جان و مال پر ڈرنے کی وجہ سے ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک رخصت ہے جو ہم پر آسان کی ہے۔"[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب نہ ہونے کی بنیادی وجہ مخاطب کا اس کو قبول نہ کرنا ہے، اور یہ بات شرائط و ارکان کے باب میں تفصیل سے مذکور ہوگی، ان شاءاللہ کہ اگر داعی کو یقین ہے کہ مخاطب میری بات قبول نہیں کرے گا تو دعوت دینا کوئی ضروری نہیں، اور اس زمانے کی عمومی صورتحال یہی ہوگی کہ مندرجہ بالا پانچ اوصافِ بد کی موجودگی میں کسی سے عمل کرنے کی توقع کرنا دل بہلانے کے مترادف ہوگا، معاشرے اور ماحول کی اس پراگندگی کی بناء پر امر و نہی کے وجوب و فرضیت کے مواقع شاذ و نادر ہی پیش آئیں گے، اسلئے آیت کریمہ اور احادیثِ مبارکہ میں اس عموم و اطلاق کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا کہ جب ایسا زمانہ آئیگا تو اپنی ہی اصلاح کافی ہوگی۔

تمام نصوص پر غور کرنے سے اس بات کی ترجیح و تائید ہوتی ہے کہ اس مخصوص زمانے میں دعوت واجب نہ ہونے اور انفرادی اصلاح کافی ہونے کی اصل علت یہی مخاطب کی طرف سے قبول نہ کرنے کا یقین ہے۔

چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حدیث ابو ثعلبہ میں جن پانچ اُمور کی نشاندہی

---

[1] أحكام القرآن لابن العربي،سورة المائدة، رقم الآية:105، 2/ 227، العلمية۔

فرمائی، یہ پانچوں صفات اس جذبہ عدم قبولیت کے محرک ہیں، یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے کسی سے حق بات پر عمل کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، جو شخص انتہائی حب جاہ اور بے پناہ حب دنیا کا مریض ہو کہ اپنی زندگی کا حال اور مستقبل اسی کی تلاش میں گذار رہا ہو، دوسری طرف عجب وخود پسندی کی آہنی جال میں گرفتار ہو کہ اپنی ہی رائے، اپنی ہی بات سب سے بھلی، مفید اور خوش کن لگے، ایسے آدمی کو اگر حق کی دعوت دی جائے، تو وہ کیسے اس پر عمل درآمد کر سکتا ہے؟ حق پر عمل پیرا ہونے میں بسا اوقات جاہ وجلال، دنیا و مال اور ذاتی سوچ و فکر کو بھی رخصت کرنا پڑتا ہے؟

جب صرف افراد ہی کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی یہی روش ہو، یہی ان کا منتہائے نظر اور انتہاء مقصود ہو تو محض آخرت کے فائدے کیلئے اپنے اس مقصودِ زندگی سے کیسے داغِ مفارقت برداشت کی جاسکتی ہے؟

علاماتِ قیامت کے متعلق بعض روایات سے بھی اس رجحان کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ بعض روایات میں قیامت سے پہلے کے علامات وحالات بیان فرمائے گئے ہے کہ فحاشی و عریانی کا دور دورہ ہوگا، زنا وبدکاری راستے کا کھیل اور آنکھوں کے روزمرہ کا مشاہدہ بن جائیگا، ان جیسے اوقات میں جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے گا، اس کا مقام ممتاز صحابہ کرام بسم اللہ الرحمن الرحیم کے مقام جیسا ہوگا، جیسے یہ حضرات صحابہ کرام کے مبارک جماعت میں چنیدہ شخصیات تھے، اسی طرح آخر اوقات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بھی اپنے زمانے کے لائق وفائق اور برگزیدہ ہستیاں سمجھی جائیگی۔

بعض محدثینِ کرام کی تشریحات سے اس جواب کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے

ہیں:

"وأماالاٰية فهي محمولة علي ما إذا لم يجدوا قدرة علي الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر...والحاصل أن في هذا الزمان غلب الفساد و شاع الجهل فلا ينجح فيها النصح ولايقبل قول الناصح، فحين إذ ذاك يسقط وجوب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر۔[1]

"(مندرجہ بالا)آیت کریمہ اس صورت پر محمول ہے کہ جب کوئی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدرت نہ پائے۔۔۔ خلاصہ یہ کہ (احادیث مبارکہ میں ذکرکردہ)اس زمانے میں فساداور جہل غالب ہوگا، خیر خواہی مفید نہیں ہوگی نہ ہی خیر خواہ کی بات قبول کی جائے گی، پس جب ایسا ہو جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب ختم ہو جائے گا۔"

اس عبارت میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ بات فرمائی گئی کہ اس زمانے میں فساد غالب ہو جانے اور دینی علوم واحکام سے جہالت عام ہو جانے کی وجہ سے داعی کی دعوت، خیر کی طرف بھلائی اور نصیحت کار آمد نہیں، جب زمانے کی عمومی فضا ایسی ہو تو اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب بھی باقی نہیں رہے گا۔

علامہ سید علی زادہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب کبھی ساقط نہیں ہوگا، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی مخصوص زمانہ کے آنے کے بعد دعوتِ دین کا وجوب بالکل ختم ہو جائے گا، جن روایات میں ایسا مضمون وارد ہوا ہے ان سے مقصود یہ ہے کہ اس زمانے میں دعوتِ حق مفید نہیں ہوگی، لہٰذا جس موقع پر دعوت دینا مفید نہ ہو

[1] بذل المجهود ج ١٧،ص ٢٦٨

وہاں دینا بھی ضروری نہیں رہے گا، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"ولایسقط الأمر بالمعروف وکذا النّھي عن المنکر أبدا ولکنّه لا ینفع الوعظ والزّجر في آخر الزّمان حین تقسو القلب..(وتولع الأنفس بلذّات الدّنیا فصبر النّفس). "

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کبھی ساقط نہیں ہوگا تاہم آخری زمانہ میں جبکہ دل سخت ہوں گے اور نفوس دنیاوی لذتوں کے دلدادہ ہو جائیں گے تو ایسے وقت میں وعظ (مخاطب کے حق میں) فائدہ مند نہیں رہے گا۔"[1]

جواب کا حاصل

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث ابو ثعلبہ میں جن پانچ چیزوں کے غالب ہو جانے کی وقت "فعلیك نفسك، و دع أمر العوام" فرمایا گیا اس سے مراد صرف ان پانچ اُمور کا موجود ہونا نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ معاشرہ پر اس کا تسلط اور غلبہ ہو جائے اور ظاہر ہے کہ ان جیسے اخلاق کے غالب ہونے کے وقت دعوت قبول کرنے یا نصیحت پر عمل کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی، اسلئے اس کا وجوب بھی باقی نہیں رہے گا، وجوب ساقط ہونے کی اصل بنیاد چونکہ لوگوں کا اس کو قبول نہ کرنا ہے اسلئے ہمارے زمانے پر اس کا انطباق درست نہیں، ابھی اگرچہ بہت سی برائیاں عام ہیں، لیکن الحمدللہ وہ زمانہ نہیں آیا جس کی اس حدیثِ مبارکہ میں نشاندہی کی گئی ہے۔

[1] شرح شرعة الإسلام،ص511

ایک اجتماعی ذمہ داری: احتسابی جماعت کا قیام

" وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (104) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ " [آل عمران: 104، 105]

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری ہے جو لوگوں کو خیر اور بھلائی کے کاموں کی طرح بلاتے رہے، معروف اور نیکیوں کا حکم دیتے ہوں اور منکرات و برائیوں سے روکتے ہوں، ظاہر ہے کہ خیر میں اور معروف میں تمام نیکیاں داخل ہیں جب کہ منکر کا لفظ تمام گناہوں کو شامل ہے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"يدعون" الناس"إلى الخير"، يعني إلى الإسلام وشرائعه التي شرعها الله لعباده"ويأمرون بالمعروف"، يقول: يأمرون الناس باتباع محمد ﷺ ودينه الذي جاء به من عند الله"وينهون عن المنكر": يعني وينهون عن الكفر بالله و التكذيب بمحمد وبما جاء به من عند الله، بجهادهم بالأيدي والجوارح، حتى ينقادوا لكم بالطاعة. "[1]

اس جماعت کا کام یہ ہوگا کہ وہ اُمت کے مختلف طبقات اور مختلف شعبہ جات پر گہری نظر رکھیں گے،ان میں شرعی نقطہ نظر سے جو کچھ کوتاہیاں اور منکرات شامل ہوں،

---

[1] جامع البيان ت شاكر، ج7ص90.

ان کو ختم کرنے کی اپنی استطاعت کی حد تک بھر پور کوشش کریں گے، مثال کے طور پر ہمارے ہاں بعض مسلمان خدمت دین کے کام میں لگے ہیں اور بعض لوگ کارِ دنیا میں مصروف ہیں، خدمت دین کی بھی مختلف شکلیں اور متعدد شعبہ جات ہیں یوں ہی کار دنیا کی بھی سینکڑوں انواع واقسام ہیں، پھر اجتماعی و انفرادی لحاظ سے ہر میدان میں نظریاتی اور عملی لحاظ سے طرح طرح کی منکرات کا ایک طوفان ہے، اب ان تمام میدانوں میں کونسے کونسے منکرات رائج ہیں یا دین اسلام کے کن کن فرائض وواجبات میں کیا کیا کوتاہیاں عمل میں آتی ہے؟ ان منکرات کو ختم کرنے اور واجبات کو زندہ رکھنے کے لئے کہاں کہاں کونسا طریقہ کار گر ہوگا! یہ اس احتسابی جماعت کا مقصود اور فرضِ منصبی ہے۔

ظاہر ہے کہ کروڑوں کھربوں کی آبادی میں اس کام کے لئے معدودے چند افراد کسی طرح کافی نہیں ہیں بلکہ جگہ جگہ اتنے جم غفیر کا ہونا ضروری ہے جو اس مقصد کے لئے کافی ثابت ہو سکتے ہوں، نیز یہ کوئی معمولی یا آسان کام بھی نہیں ہے بلکہ مختلف مواقع میں معروف و منکر کی تمیز اور مناسب طریقہ عمل اختیار کرنے کے لئے بقدر ضرورت شرعی علم لازم ہے اور ساتھ عملی واخلاقی مہارت اور متعلقہ ماحول سے واقفیت بھی ضروری ہے جبکہ اخلاص اور للٰہیت تو ہے ہی ہر عمل کی روح، لہٰذا اس اجتماعی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے درج بالا صفات سے متصف اتنے افراد کا موجود ہونا ضروری ہے، جو پوری اُمت کے لئے کافی ہوں اور وہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہیں

اسلامی حکومت کا نظامِ حسبہ

اسلامی حکومتوں میں "حسبہ" کے نام سے ایک مستقل شعبہ تھا،اس کے تحت سینکڑوں افراد کام کرتے تھے ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ معاشرہ میں رائج منکرات کا جائزہ لیں اور

اس کو ختم کرنے کی مناسب کوشش کریں، سرکاری طور پر ان کے پاس کچھ اختیارات بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے یہ شعبہ فعال رہتا تھا، اس شعبہ سے وابستہ افراد زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگوں کے معاملات، برتاؤ دیکھتے اور پھر خود اس کی اصلاح و تغییر کرتے یا پھر متعلقہ ذمہ دار افراد کو اس سے مطلع کرتے تھے، اسی نظام کا فائدہ تھا کہ معاشرہ میں بے دینی اور بے راہ روی کم تھی اور ماحول مجموعی طور پر معاصی و منکرات کے لپیٹ میں نہیں ہوتا تھا ،بلکہ جب کسی کوتاہی یا معصیت نے رواج پکڑنا شروع کیا تو ساتھ ہی ساتھ اس کا ازالہ بھی ہو جاتا اور سرکاری سرپرستی کی وجہ سے عام افراد زیادہ ضد واصرار کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

غیر سرکاری طور پر جماعت کا قیام

موجودہ دور میں جبکہ حکومتوں کا نصب العین دین و مذہب کی حفاظت واشاعت نہیں ہے، اب سرکاری طور پر گو ایسے خالص دینی و اسلامی نوعیت کا کوئی محکمہ قائم کرنا مشکل ہے، بلکہ موجودہ نظام مملکت میں مفید بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس سے مکمل طور پر غفلت برتنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، اگر غیر سرکاری طور پر اپنی استطاعت واختیار کے مطابق کوئی ایسا ادارہ تشکیل دیا جائے جو عام مسلمانوں کو موقع و محل کے مناسب شرعی احکام سے روشناس کرایا کرے اور معاصی و منکرات کی نشاندہی کر کے اس سے مسلمانوں کو دور کرنے کی محنت کرے تو اس کے بہت کچھ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

کراچی کی مجلس دعوت واصلاح

ایسا کرنا کوئی مشکل ہے نہ ہی کوئی بے فائدہ۔ ماضی قریب میں اس کے کئی نظائر موجود ہیں، چنانچہ کراچی کے متعدد اکابر اہلِ علم نے اپنے وقت کے فتن و منکرات کے شیوع

پر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس بات پر اتفاق کیا کہ موجودہ دینی مساعی ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتیں، اس کے لئے مزید ایک ایسی مجلس تشکیل دینی چاہئے جس کا کام ہی یہی ہو کہ وہ اُمت کو معاصر فتن و منکرات سے بچانے کی تدبیر سوچے۔

مزید تفصیل محدث العصر حضرت مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے:

"عرصہ سے جب بھی ان حالات کا جائزہ لیا گیا اور صورت حال پر غور وخوض کیا گیا کہ اس سیلاب کی روک تھام کے لئے یا عمومی اصلاح احوال کے لئے کون کون سے افراد یا جماعتیں کام کر رہی ہیں؟ اور یہ فرض کفایہ انجام پذیر ہو رہا ہے یا نہیں؟ اور یہ دینی درس گاہیں جو پشاور سے چاٹگام تک پھیلی ہوئی ہیں، یہ موجودہ ملک گیر امراض کے لئے نسخہ شفاء ہیں یا نہیں؟ جب بھی پورا جائزہ کامل غور وخوض سے لیا گیا، نتیجہ یہی نکلا کہ مرض کا پورا علاج نہیں ہو رہا۔ ۔۔۔اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم سے مختلف اوقات میں بات ہوتی رہی اور ہم دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو دینی درس گاہیں ہم چلا رہے ہیں، اگرچہ وہ بھی ایک ٹھوس اور بنیادی خدمت ہے ۔۔ لیکن بحالت موجودہ ہماری مسئولیت اس پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے زیادہ محنت اور وسعت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک ان علمی و عملی فتنوں کے دفاع کے لئے اپنے مدرسہ یا دار العلوم میں اہمیت وتوجہ کے ساتھ کام نہ کیا جائے گا یہ مقصد انجام پذیر نہ ہوگا اور ہم مسئولیت سے سبکدوش نہ ہوں گے۔"

اس کے بعد تبلیغی جماعت کی محنت کو سراہنے کے باوجود ذکر کیا ہے کہ اُمت کے اندر موجودہ علمی و عملی فتنوں کی روک تھام کے لئے محض اتنی محنت کافی نہیں ہے، اس کے لئے ایک وسیع تر بنیادوں پر ایک مجلس قائم کرنے کی ضرورت ہے جس کا نام "مجلس دعوت واصلاح" رکھا، پھر اس مجلس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ذکر فرماتے ہیں:

"ا۔ الحاد وارتداد و بے دینی اور تحریفات دین اور مجمع علیہ منکرات کے سد باب کے

لئے زبانی اور تحریری جدو جہد۔

۲۔ مسلمانوں کے مختلف طبقات کے گروہی اختلافات کو معتدل کر کے سب کو مجمع علیہ فواحش و محرمات اور تحریف والحاد کی مدافعت پر جمع کرنا۔

۳۔ جدید پیش آنے والے مسائل میں انفرادی فتوؤں کے بجائے باہمی مشورہ سے تحقیقی اور اجتماعی فیصلے پیش کرنا۔"[1]

حاجی محمد امین صاحب کی جماعت ناجیہ صالحہ

صوبہ خیبر کے مشہور مجاہد اور بزرگ شخصیت حضرت حاجی محمد امین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی 9 جمادی الاولیٰ 1365ھ بمطابق 16 اپریل 1942ء میں ایک ایسی ہی مجلس قائم فرمائی تھی جو معاشرہ میں موجودہ معاصی کا جائزہ لیکر مختلف طریقوں سے اس کے اصلاح کرنے کی کوشش کرتی تھی، جماعت کا نام "جماعت ناجیہ صالحہ" رکھا گیا تھا اور اس کا اہم مقصود یہی تھا کہ معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی محنت کو منظم طریقے سے جاری رکھا جائے، جس مجلس میں جماعت ناجیہ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی، اسی پہلی مجلس میں ہی ضلع مردان و پشاور کے سینکڑوں علماء و صلحاء نے شرکت فرمائی اور پھر حضرت حاجی محمد امین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں یہ جماعت سالہا سال تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتی رہی، جماعت کے نمایاں خدمات میں سے یہ بھی ہے کہ جہاد کشمیر میں حصہ لیا اور ایک خاص سطح پر لوگوں کے لئے شرعی قضاء کا نظم بنایا جس میں جماعت کے کئی اراکین کی وساطت و تعاون سے شرعی فیصلے کئے جاتے تھے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوانح نگار اس جماعت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم، ص

"1۔سب سے پہلے فرض، واجب و سنت اپنی اپنی جگہ پر بہتر طریقے سے ادا کرنا۔

2۔جملہ حرام اور وہ طریقے جو کہ حرام کی طرف راغب کرتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا۔

3۔غیر اسلامی حکومت کی کسی بھی وقت امداد نہ کرنا۔

4۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنی استعداد کے مطابق انجام دینا اور اس راہ میں تکالیف برداشت کرنا (بلکہ اس کو[1] اپنی خوش قسمتی سمجھنا۔)

5۔شرک[2] اور قبیح کاموں سے اپنے آپ کو بچانا۔

6۔اپنی استعداد کے مطابق جماعت کی ترقی کے لئے کچھ حصہ وقف کرنا۔"[3]

ناکامی کی وجوہات

یہ تو صرف ان دو جماعتوں کا ذکر خیر تھا، اس کے علاوہ بھی اُمت کے بہی خواہوں نے مختلف سطحوں پر اور مختلف انداز سے ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوششیں فرمائی ہیں لیکن ان جماعتوں سے وہ مقاصد و اہداف پوری طرح حاصل نہیں ہوسکے جو اصل ذمہ داری تھی، ظاہری طور پر اور مادی دنیا کی نظر میں یہ جماعتیں ناکام ثابت ہوئی، ایسا کیوں ہوا؟ اور اس ظاہری ناکامی کے وجوہات و اسباب کیا تھے؟ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں مگر درج ذیل باتوں کا بھی اس میں دخل تھا جن کی وجہ سے اس قسم کی جماعتیں دیرپا ثابت ہوتی ہیں نہ ہی عالمگیر حیثیت اختیار کرپاتی ہے:

---

[1] بریکٹ کے الفاظ اصل کتاب میں موجود نہیں ہیں، عبارت کی درستگی اور روانی کیلئے اسکو بڑھایا گیا ہے۔

[2] اصل کتاب میں یہ لفظ اسی طرح لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے، صحیح لفظ "منکر" یا "شرک" معلوم ہوتا ہے۔

[3] تذکرہ عاشق رسول ، تألیف تحسین اللہ، ص120

1۔اس کام کے لئے مستقل اور بقدر کفایت افراد کا موجود نہ ہونا۔ جو حضرات ان جیسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ تھے وہ تعداد کے لحاظ سے بھی کم تھے اور اس کام کے علاوہ اپنے مشاغل کا ہجوم بھی زیادہ ہوتا تھا۔

2۔دیگر افراد کا عدم تعاون۔ اُمت مرحومہ نے اجتماعی طور پر ان جماعتوں کا خیر مقدم نہیں کیا، حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اُمت مرحومہ کے تمام تر شعبوں سے بقدر ضرورت افراد ان کا ساتھ دیتے اور پوری طرح ان کی معاونت فرماتے۔

3۔ نبوی طریقہ کار (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) کی پابندی نہ کرنا۔ یا تو شخصی نوعیت کی محنت جاری رہی، یا بعض جگہ اگر اجتماعی طرز کا کام بھی کیا گیا تو بھی اس کا منہج بعینہٖ وہ منہج نہیں تھا جو حضور نبی کریم ﷺ کا طریقہ کار تھا۔

4۔اپنے کارکنان کے دلوں میں تقویٰ اور ایمانی صفات کی محنت کا فقدان۔ یہی وجہ ہے کہ بڑوں اور بزرگوں کے بعد بسا اوقات ان جیسے خیر کے کاموں کو ذاتی مفاد یا جذبات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔

5۔ پانچویں بڑی وجہ موجودہ جمہوری اور سیکولر نظام سے تصادم ہے، قرآن کریم جس احتسابی جماعت کو اُمت کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیکر ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایسی جماعت اُمت کے درمیان موجود رہے، سیکولر سوچ اور جمہوری نظام اس احتسابی جماعت کو انسانی اور عوامی حقوق کے خلاف سمجھ کر رد کر دیتا ہے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے صفائی اور ڈھٹائی کے ساتھ رد کر دینے کی استطاعت نہ ہو تو طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیکر اس راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

پس چہ باید کرد

احتسابی جماعت کی اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ اکابر اہلِ علم کی زیر نگرانی کوئی ایسی مجلس تشکیل پائے جس کا بنیادی نصب العین اور طریقہ کار وہی ہو جو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے "مجلس دعوت و اصلاح" کی تفصیل میں درج کیا گیا یا اگر اپنے ماحول یا زمانے کے مطابق کوئی حک و اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے تو اس کو بھی باہمی مشاورت سے طے کر دیا جائے، اگر آج بھی ایسا کیا گیا تو اُمید ہے کہ اس کے بیش بہا اثرات و برکات ظاہر ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں مسلمان بہت سے فتنوں کی ضد میں آنے سے محفوظ ہو جائیں گے، موجودہ دور میں چونکہ فتن و معاصی پہلے کی بنسبت کئی گنا زیادہ ہیں اور روز افزوں اس میں ترقی ہوتی رہتی ہیں، اس لئے ماضی کے مقابلہ میں موجودہ حالات میں اس کا اہتمام زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۹۹۹

باب دوم

فضائل و فوائد، وعیدات و نقصانات

فصلِ اوّل: فضائل و فوائد

مؤمن اور منافق کے بنیادی امتیازی اوصاف

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللهُ إِنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (71) وَعَدَ اللهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔"

"اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

اللہ نے ایمان دار مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا وعدہ دیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور عمدہ مکانوں اور ہمیشگی کے باغوں میں اور اللہ کی رضا ان سب سے بڑی ہے یہی وہ بڑی کامیابی ہے۔(ترجمہ حضرت لاہوری

صاحب)"[1]

رکوع کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے منافق مرد وعورت کا تذکرہ کیا، ان کی طرز زندگی اور انجام کار بیان کیا، رکوع کے آخر میں منافقین کے مقابلے میں مؤمن مرد وعورت کا ذکر فرمایا، ان کے طرز معاشرت اور اہم کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی، پھر ان کی عاقبت واضح کی گئی، ان آیات میں منافقین ومؤمنین کے اہم صفات اور بنیادی کردار کا نمونہ مذکور ہے، دونوں جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تذکرہ کیا گیا فرق یہ بیان کیا گیا کہ مسلمان نیکیوں کا حکم اور برائیوں سے منع کرتے ہیں جبکہ منافقین اس کے بالکل اُلٹ کرتے ہیں یعنی برائی کا حکم اور نیکیوں سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

منافقین کے صفات میں بھی اس کا تذکرہ ہوا اور مؤمنین کی تعریف وتوصیف میں بھی اس صفت کو اُجاگر کیا گیا، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مسلمان کی کامیابی و کامرانی اور منافقین کے ذلت وخسران کے بنیادی اسباب میں سے سب سے پہلے اسی عمل کو بنیاد بتاکر پیش فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور خوشنودی حاصل کرنے کا یقینی راستہ

ان آیات میں مؤمنین کے تین اوصاف مذکور ہوئے:

(۱)امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

(۲)۔نماز قائم کرنا

(۳)۔اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری۔

[1] سورة التوبة، رقم الآية: ٦٧ و ٧١

پھر ان تین صفات کے تین ثمرات ونتائج کو واضح کیا گیا:

(۱)۔اللہ تعالیٰ کی رحمت

(۲)۔نعمتوں وخوشیوں سے بھرے ہوئے جنت ملنا

(۳)۔سب سے بڑی نعمت اور تمام تر اعزازات سے بڑھ کر اعزاز یعنی اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی۔

مؤمن ومنافق کے تمیز اور مؤمن کے بنیادی صفات کے بیان کرنے کی جگہ میں ان تین صفات کا ذکر انتہائی حکمت پر مبنی ہے، تعریف کی جگہ میں ہمیشہ ان صفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو مدح کرنے والے کے خیال میں اعلیٰ ترین اوصاف اور قابل فخر اُمور ہوں، جس چیز کی بنیاد پر کسی کو مدح وتعریف کا کوئی مقام ملتا ہے تو ان ہی بنیادی اُمور کو سراہا جاتا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے جب کامل مؤمنین کے یہ صفات ذکر فرمائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کا جو مقام ومنصب ہے، جن اُمور کی بنیاد پر اس کو مندرجہ بالا تین انعامات ملتے ہیں، وہ بنیادی اُمور یہی تین کام ہیں۔

حضرات علماءِ کرام اور مفسرین نے لکھا ہے کہ "سیرحمهم الله" میں سین تاکید کیلئے ہے، جس سے مقصود تاکید ومبالغہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضرور اپنی رحمت سے نوازے گا۔

ایمان کا لازمی تقاضا

"عن عطاءبن ميسرة الخراساني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «سيأتي على الناس زمان يذوب قلب المؤمن في جوفه كما يذوب الثلج في الماء» قيل: يانبي الله ومم ذاك؟ قال: «يرى المنكر يعمل به فلا يستطيع أن

یغیرہ۔"[1]

"حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ جس میں مؤمن کا دل ایسا ہی پگھلے گا جس طرح پانی میں برف پگھلتی ہے" کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ برائی دیکھے گا لیکن اس کو ختم کرسکنے کی طاقت نہ ہوگی۔"

ایمان جس نفس فروشی اور جان نثاری کا نام ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا اور رسول کے نافرمانی کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ دینِ اسلام انفرادی طور پر چندعادات وعبادات کے مجموعہ کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک اجتماعی نظام سے عبارت ہے جو پوری زمین پر اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے مبارک اعمال قائم کرنے اور پھر اس کو برقرار رکھنے کا خواہ ہے، اسلئے جب کوئی ایمان لاتا ہے تو یہ جذبہ اس کے اندر کارفرما ہونا چاہئے کہ احکام شریعت پر اتنی غیرت اور خود مخلوق خدا کیساتھ اتنی رحمت و مودت ہو کہ وہ کوئی منکر ہوتا ہوا دیکھ کر برداشت نہ کرسکے، بلکہ اپنے امکانی حد تک اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہے جس کے مختلف درجات ہیں (جو آگے کتاب میں تفصیل سے تحریر کئے جائیں گے)۔

اس مبارک حدیث میں اسی جذبہ کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مسلمان پر اس قسم کی حمیت اور مخلوق خدا کی شفقت کا جذبہ اتنا غالب ہونا چاہئے کہ وہ ہر قیمت پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دیکھنا برداشت نہ کرے، حتی کہ اگر کہیں ایسا نہ بھی کرسکے تو اس غم میں وہ ایسا

---

[1] ذكره العلامة محمدبن وضاح القرطبي في كتابه" البدع والنهي عنها" بإسناد يحتج به ، باب تغير البدع،ج2 ص182.

پگھلے گا جیسا کہ برف پانی کے اندر کچھ دیر بعد پگھل کر ختم ہو جاتی ہے ۔

اس بات کی مزید وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے:

"حدثني الحسن بن علي بن حسن بن حسن، عن أبيه، عن جده، قال: كان يقال: «لا يحل لعين مؤمنة ترى الله يعصى فتطرف حتى تغيره."

"مسلمان (کی) آنکھ کیلئے یہ حلال نہیں کہ وہ اللہ کی نافرمانی دیکھنے کے باوجود اس کو ختم کئے بغیر بند ہو جائے (یعنی استعمال ہوتی رہے اور اس کی کوئی پرواہ نہ کرے۔)"[1]

عربی زبان جاننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ یہ تعبیر عام طور پر کسی معمول اور عادت بیان کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خیر القرون میں نہی عن المنکر کی کتنی فکر ہوتی تھی؟ ان کے دلوں میں اس کی کیا اہمیت تھی کہ جب تک وہ اپنے امکانی حد تک اس منکر پر نکیر نہ کرتے تب تک سکون کی سانس نہیں لیتے۔

اسلام کا ایک عظیم شعبہ

"عن حذيفة قال:"الإسلام ثمانية أسهم - أظنه قال -: فالإسلام سهم، والصلاة سهم، والزكاة سهم، وصوم رمضان سهم، والحج سهم، والجهاد سهم، والأمر بالمعروف سهم، والنهي عن المنكر سهم، وقد خاب من لا

[1]الأمربالمعروف والنهي عن المنكرللإمام أبي بكر ابن أبي الدنيا، ص78

سهم له۔"[1]

"مفہوم: حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ: (دینِ) اسلام کے آٹھ (بڑے) حصے ہیں، اسلام (یعنی کلمہ توحید پڑھکر اسلام قبول کرنا) نماز، زکوۃ، رمضان کا روزہ، حج، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جس کسی کو کوئی بھی حصہ نصیب نہ ہوا وہ نامراد ہے۔"

یہ حدیث مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح منقول ہے،اس سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے کہ ارکانِ اسلام کیساتھ دین کے تمام اعمال اور شعبہ جات میں سے صرف جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بیان کیا گیا، اورچونکہ جہاد بھی درحقیقت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک انتہائی صورت ہے،اسلئے خلاصہ یہ ہوا کہ ارکان اسلام کے بعد دین کا عظیم الشان شعبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ہے۔

صحابہ کرامؓ جیسا ثواب حاصل کرنے کا طریقہ

"عبد الرحمن بن الحضرمي يقول: أخبرني من سمع النبي ﷺ يقول: "إن من أمتي قوما يعطون مثل أجور أولهم ينكرون المنكر۔" [2]

---

[1] شعب الإيمان، رقم الحديث، 7179،ج10ص69.

[2] رواه أحمدفي مسنده، رقم الرواية: 23181،ج38 /241ونقله الهيثمي في مجمعه وقال معلقاعليه: رواه أحمد، وعبد الرحمن لم أعرفه، وبقية رجاله ثقات.انظرمجمع الزوائد، كتاب الفتن، قبيل باب فيمن يؤمر بالمعروف فلا يقبل، ج2ص271-

"میری اُمت میں سے جو لوگ منکر پر انکار کریں گے، ان کو پہلے اُمت کی طرح اجر وثواب دیا جائیگا۔"

پہلے لوگوں سے مراد قرن اوّل کے مسلمان یعنی حضرات صحابہ کرام ہیں، صحابہ کرامؓ کے اعمال عشق ومحبت اور اخلاص واعتقاد سے بھرپور ہوتے تھے، جن کی وجہ سے ان کا اجر وثواب بھی انتہائی زیادہ ہے، چنانچہ ایک موقع پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (صحابہ کرام کے اجر و ثواب کا یہ حال ہے کہ) اگر اُمت کے دیگر لوگ پہاڑ کے برابر سونا چاندی صدقہ کریں تو صحابہ کرام کے ایک مد بلکہ آدھے مد صدقہ کے بھی برابر نہیں، یعنی ان کو جو ثواب آدھے مد صدقہ کا ملے گا وہ دیگر لوگوں کو سونے چاندی کے پہاڑ صدقہ کرنے سے بھی حاصل نہ ہوگا۔

اس حدیث میں ان لوگوں کیلئے بڑی بشارت ہے جو منکرات اور گناہوں پر نکیر کرتے ہیں، یہ بیش بہا اجر وثواب شاید ہی دوسرے نیک اعمال میں حاصل ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صدقہ ہے۔

"عن أبي ذر، عن النبي ﷺ، أنه قال: «يصبح على كل سلامى من أحدكم صدقة، فكل تسبيحة صدقة، وكل تحميدة صدقة، وكل تهليلة صدقة، وكل تكبيرة صدقة، وأمر بالمعروف صدقة، ونهي عن المنكر صدقة، ويجزئ من ذلك ركعتان يركعهما من الضحى۔"[1]

[1] صحيح مسلم ،كتاب الصلاة، باب استحباب صلاة الضحى، وأن أقلها ركعتان، 1/ 498

"حضور ﷺ نے فرمایا، انسان کے صحیح وسالم عضو پر سے صدقہ ضروری ہوتا ہے، ملنے والے کو سلام کرنا صدقہ ہے، نیک کام کا حکم دینا صدقہ اور برے کام سے روکنا بھی صدقہ ہے۔"

اس حدیث میں واضح طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صدقہ فرمایا گیا، یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جتنی نعمتیں ملتی ہیں ان کا شکر ادا کرنے کے مختلف طریقے ہیں، ایک طریقہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شکر کی ایک صورت ہے اور شکر کی فضیلت اور ثواب کسی سے مخفی نہیں۔

فتنوں اور (صغیرہ) گناہوں کی مغفرت کا ایک اہم ذریعہ

"شقيق، قال: سمعت حذيفة، قال: كنا جلوسا عند عمر رضي الله عنه، فقال: أيكم يحفظ قول رسول الله صلى الله عليه وسلم في الفتنة، قلت أنا كما قاله: قال: إنك عليه أو عليها لجريء، قلت: فتنة الرجل في أهله وماله وولده وجاره، تكفرها الصلاة والصوم والصدقة، والأمر والنهي---"[1]

"حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے عرض کیا "فتنہ کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان تم میں سے کس کو یاد ہے؟ "میں نے عرض کیا کہ میں نے اسی طرح

[1] صحيح البخاري ،كتاب الصلاة،باب الصلاة كفارة، 111/1

یاد کیا ہے جس طرح آپ ﷺ نے فرمایا تھا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو اس پر بہت جرأت کرتا ہے، میں نے کہا آدمی کو اپنے گھر، مال، اولاد اور پڑوس کے متعلق جو فتنے پیش آتے ہیں، نماز، روزہ، صدقہ اور امر و نہی اس کا کفارہ بنتا ہے۔"

اہل و عیال وغیرہ اُمور کے سلسلے میں بعض اوقات انسان سے ایسے اُمور کا ارتکاب ہو جاتا ہے جن کو شریعت کی طرف سے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، یہاں فتنہ سے مراد یہی بھول وچوک ہے، حاصل یہ ہوا کہ اگر مذکورہ اُمور کی رعایت یا حفاظت وغیرہ کے خیال سے کچھ کمی بیشی واقع ہو جائے تو نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف نہی عن المنکر اس کیلئے کفارہ بن جاتا ہے، اور ان ہی اُمور کی وجہ سے اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔

بعض نصوص و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "فتنہ" سے مراد وہ کمی و بیشی ہے جو صغائر کے حدود میں ہو، کبائر سے بخشش کیلئے توبہ ضروری ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

" إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا۔"

"اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا تو ہم تم سے تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔"[1]

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ دونوں باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے اسی حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

[1] النساء : 31

"انسان کا اپنے اہل کے متعلق فتنہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے کسی ناجائز قول و فعل کا ارتکاب کرے، مال میں فتنہ یہ ہے کہ ناجائز طریقہ سے کمائے یا غلط جگہ خرچ کرے، اولاد کے متعلق فتنہ یہ ہے کہ ان سے اتنی محبت رکھی جائے کہ ان کی وجہ سے بہت سے نیکیوں سے مشغول ہو، یا ان کیلئے کمانے میں اتنا مصروف ہو کہ حلال وحرام کی تمیز نہ رہے، پڑوس کے باب میں فتنہ یہ ہے کہ اگر وہ مالدار ہے تو ان جیسے ہونے کی تمنا کی جائے اور اس سے اس نعمت کے زائل ہونے کی آرزو کی جائے، فتنوں کے ان تمام اقسام کو نماز، روزہ، صدقہ اور نیکی کا حکم برائی سے منع کرنا مٹا دیتی ہے، اور یہ سب اعمال چھوٹی گناہوں ہی کا کفارہ بن جاتی ہیں۔"[1]

بہر حال اس حدیثِ مبارکہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ بھی فی الجملہ گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

باعثِ برکت عمل

سورۃ مریم میں سیدنا حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام کا وہ خطاب مذکور ہے جو آپ (علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام) نے اپنی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد اپنی قوم بنی اسرائیل سے فرمایا تھا، اس میں آپ نے وہ احسانات وانعامات گنوائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کئے تھے، ان میں سے ایک انعام یہ بھی تھا کہ " و جعلنی مبارکا" کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے برکت والا بنایا، اس سے کیا مراد ہے؟ اور برکت بننے کی کیا نوعیت ہے؟

مفسرین کرام نے اس کا مصداق یہ بیان فرمایا ہیں کہ میں تم کو امر بالمعروف اور

[1] إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب الصلاة كفارة، 480/1

نہی عن المنکر کروں گا، یہی کام باعث برکت ہے اس سے معاشرہ میں خیر و برکت پھیلے گا۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"كانت بركته الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر... وقد اجتمع الفقهاء على قول الله: (وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ) وقيل: ما بركته؟ قال: الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر أينما كان. "

" (حضرت عیسی علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام) کی برکت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا تھی۔)"[1]

"مبارک" کی تفسیر میں امام طبری اور علامہ سیوطی تصحیح وتنقیح مجموعی طور پر تین اقوال ذکر کئے ہیں:

ا۔اس سے مراد دوسروں کو نفع پہنچانا ہے۔

۲۔ خیر و بھلائی کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

۳۔اور تیسری تفسیر یہی ہے کہ اس کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہے۔

یہ تینوں باتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑی حد تک پائی جاتی ہے، کسی کو نیکی کی طرف ترغیب دینا یا برائی سے منع کرنا اس کو اخروی فائدہ پہنچانا ہے اور خیر و بھلائی سکھانے کا بھی یہ ایک بہترین انداز ہے، لہذا تینوں اقوال کی بنیاد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا مصداق ہے۔

اس سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ (موقع و محل کی مناسبت سے) ہر جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا باعثِ برکت عمل ہے، اسکو سرانجام دینے والا

---

[1] جامع البيان، سورة مريم، رقم الاٰية: 31،ج 18/ 191ت شاكر۔

مبارک ہے۔

قرآن وحدیث پر عمل کرنااور شریعت خداوندی کے مطابق پوری زندگی گزارنا، انفرادی واجتماعی زندگی کی تکمیل دین اسلام کے ہاتھ میں تھمانایہ برکت حاصل کرنے کے وہ عمومی اسباب ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ افراداور معاشرے کوبے پناہ برکت سے مالامال فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمائی، قانونِ شریعت کی مخالفت اور سنن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوری بے برکتی اور نحوست کے وہ ذرائع ہیں، جس کامشاہدہ مشرق ومغرب کے مسلمان اور یورپ وایشیاکے فلاسفر کرچکے ہیں، بلکہ ماضی اور حال کے تمام عقل مند انسانوں کے سامنے اس کے دریچے کھلے پڑے ہیں، کہ خدا کی غلامی ہی انسانیت کامعراج ہے،اور خدا اور رسول سے دوری ہی انسانیت کی ہلاکت کا خشت اول ہے، جس پر جاکر انسان ومعاشرہ مختلف دینی ودنیوی مصائب کی دلدل میں پھنس جاتاہے۔

اورچونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکراس کے احیاء وبقاء کاایک عظیم سبب اور انتہائی مفیدراستہ ہے،اسلئے اس کوبابرکت عمل کہاگیا، کہ حقیقی برکت کے اسباب کاحصول اس عمل کے کرنے میں مضمرہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں جہاد کاثواب ہے

"عن العلاء بن عبد الرحمن، قال: حدثني الذي، سمع عليا، قال: " الجهاد على أربع شعب: على الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، والصدق في المواطن، وشنآن الفاسقين، فمن أمر بالمعروف شد ظهر المؤمن، ومن نهى عن المنكر أرغم أنف المنافق، ومن صدق في المواطن قضى ما عليه، ومن شنأ الفاسقين وغضب لله،

غضب الله له۔"[1]

"حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاد کے چار شعبہ جات ہیں، ان میں سے ایک شعبہ امر بالمعروف اور دوسرا نہی عن المنکر کرنا بھی ہے۔۔۔"

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ جہاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ایک اہم شعبہ اور آخری درجہ ہے، جو آدمی شرائط وآداب کے لحاظ رکھتے ہوئے اس اہم کام کو سرانجام دیتا ہے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مجاہد جتنا ثواب ملے گا۔

دوسروں کے اعمال وثواب میں شریک ہونا

عن أبي مسعود قال: أتى رجل النبي ﷺ فسأله فقال: "ما عندي ما أعطيك لكن ائت فلانا" قال: فأتى الرجل فأعطاه فقال رسول الله ﷺ: "من دل على خير فله مثل أجر فاعله أو عامله۔"[2]

"حضرت ابو مسعودؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں ایک شخص نے آکر کچھ مانگا، حضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس تو دینے کیلئے کچھ بھی دستیاب نہیں، تاہم فلاں آدمی کے پاس جاؤ، ابو مسعود فرماتے ہیں کہ وہ شخص اس کے پاس گیا اس نے کچھ دیدیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی بھلائی کی

---

[1] رواه ابن أبي الدنيافي الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر (ص60)ورواه أبونعيم في الحلية بإسناده إلي الخلاس بن عمر(حلية الأولياء، ترجمة علي ابن أبي طالب ؓ، ج1ص68)

[2] أخرجه ابن حبان في صحيحه (ذكر إعطاء الله جل وعلا الآمر بالمعروف ثواب العامل به من غير أن ينقص من أجره شيء) 1 / 525

طرف رہنمائی کی اس کو بھی کرنے والے جیسا ثواب ملے گا۔"

اس حدیث کے الفاظ عام ہے، یعنی بھلائی خواہ محسوس ومادی اشیاء کی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں ہے یا غیر محسوس اشیاء کی، بہر حال جو کوئی بھی اس رہنمائی کے نتیجہ میں کوئی بھلائی کرے گا تو رہنمائی کرنے والے کو بھی اس کا ثواب ملے گا۔

اس حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی فضیلت بیان ہوئی، کہ اگر کسی کی ترغیب وترہیب سے دوسرے شخص نے کوئی نیک کام کیا یا برائی اور گناہ سے اپنے آپ کو بچایا، تو اس کو دو قسم کی نیکیاں ملے گی، ایک تو اس ترغیب دینے کی، اور دوسری نیکی اس کام کرنے کی وجہ سے کہ اس نے دین کے حکم پر عمل کر کے ثواب حاصل کیا اسی طرح ثواب ترغیب دینے والے کو بھی ملے گا انشاءاللہ۔

بعض اہلِ علم لکھتے ہیں کہ اسلاف کی فضیلت اور امتیاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بعد میں آنے والے حضرات نے ان ہی لوگوں سے نیکیوں اور برائیوں کا علم سیکھا، لہذا یہ لوگ خواہ جتنے بھی زیادہ نیک اعمال کریں، اسلاف کے عمل کے مقابلے میں دوگنا چوگنا ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب ان سے یہ کام کرنا سیکھا تو ان کی فضیلت زیادہ ہے، کیونکہ وہ اس کے عمل میں بھی برابر کے شریک ہیں اور خود اپنے بھی بعض اعمال کئے جس میں اس بعد میں آنے والے کا کوئی حصہ نہیں، ہمارے اور ان کے اعمال کا وہی حال ہے جو طاؤس اور اس کے پروں کا ہوتا ہے کہ طاؤس کے پَر خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ خود طاؤس سے زیادہ بڑھ نہیں سکتے کیونکہ طاؤس پر سمیت دیگر تمام اعضاء کا نام ہے۔

درحقیقت یہ مسابقہ کا میدان ہے، اُخروی درجات وقربت میں تنافس اور مقابلہ کی فضا شرعاً جائز بلکہ محمود ہے، بہت سے اولیاءاللہ نے ان جیسے نصوص کو مدنظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اب صرف اپنے انفرادی اعمال کے بل بوتے نجات اور قربت کے اعلی درجات کا حصول

مشکل ہے، اس کے حصول کا بہترین ذریعہ لوگوں کے نیک اعمال میں سبب بنناہے، اسلئے اُنہوں نے اپنی زندگیاں اسی فکر میں گنوادی، اور دعوت دین کو شب وروز کا مشغلہ بنایا۔

مولانا محمد الیاس صاحب کا ایک ملفوظ

تبلیغی جماعت کے عظیم داعی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی اس کا اہتمام تھا چنانچہ آپ کے ملفوظات میں ہے:

"اس کا بھی دھیان کیا کریں کہ ہماری ان حقیر کوششوں کے ذریعہ اللہ پاک جتنوں کو دین پر لگادیں گے اور پھر اس سلسلہ سے جو لوگ قیامت تک دین پر پڑیں گے اور وہ جو بھی نیک اعمال کریں گے تو ان کے اعمال حسنہ کا جتنا ثواب ان کو ملے گا ان شاء اللہ ان تمام ثوابوں کے مجموعہ کے برابر اللہ پاک اپنے وعدہ کے مطابق ہم کو بھی عطا فرمائیں گے بشرطیکہ ہماری نیت خالص اور ہمارا کام قابل قبول ہو۔"[1]

راستے کا ایک ضروری حق

"عن أبي سعيد الخدري ﷺ، عن النبي ﷺ قال: «إياكم والجلوس على الطرقات»، فقالوا: ما لنا بد، إنما هي مجالسنا نتحدث فيها، قال: «فإذا أبيتم إلا المجالس، فأعطوا الطريق حقها»، قالوا: وما حق الطريق؟ قال: «غض البصر، وكف الأذى، ورد السلام، وأمر

[1] ملفوظات مولانا محمد الیاس، ص56-

بالمعروف، ونهي عن المنكر۔" [1]

"حضوراقدس ﷺ نے فرمایاکہ راستہ میں بیٹھنے سے بچے رہو، صحابہ کرام نے عرض کیاکہ ہمارے لئے اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، (کیونکہ) وہی ہماری مجالس ہوتے ہیں جس میں ہم گفتگو کرتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایااگرتم نے وہاں بیٹھناہی ہے توپھرراستہ کوراستے کاحق اداکرو، صحابہ کرام نے عرض کیاکہ راستے کاکیاحق ہے؟ حضورنے فرمایاکہ (غیر محرم عورت کے سامنے) نگاہ نیچی کرنا، راستہ سے تکلیف دہ چیز کوہٹانا، سلام کاجواب دینااورامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔"

اس حدیث سے معلوم ہواکہ جس طرح مختلف چیزوں کے مختلف حقوق مقرر کیے گئے ہیں جس کو اہتمام وتوجہ کے ساتھ پوراکیاجاتاہے، یوں ہی راستہ کاایک حق "دعوت دین" بھی ہے کہ اگرکوئی شخص کسی گناہ میں مبتلاہے تواس کوبچانے کی فکر کی جائے، کوئی کسی ضروری حکم کی تعمیل میں سستی وغفلت کاشکارہے تواس کوعمل کرنے کی ترغیب دی جائے، بعض روایات سے معلوم ہوتاہے کہ یہ صرف راستہ ہی کاحق نہیں، بلکہ اس شخص کابھی حق ہے جوکسی منکر میں مبتلاہو، لہٰذادیگر حقوق کی طرح اس حق کو بھی پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ پوراکرتے رہناچاہئے۔

امر اور نہی میں کوتاہی کرنے کے دو بنیادی اسباب اور اس کا نبوی حل

"عن النبي ﷺ، قال: " أنتم اليوم على بينة من ربكم

[1] صحيح البخاري ،كتاب المظالم والغصب، باب أفنية الدوروالجلوس عليها، 3 / 132

تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر، وتجاهدون في سبيل الله، وستحولون عن ذلك فلا تأمرون بالمعروف، ولا تنهون عن المنكر، ولا تجاهدون في سبيل الله، أنتم اليوم على بينة من ربكم، لم تظهر فيكم السكرتان: سكرة الجهل وسكرة العيش، و ستحولون عن ذلك، القائمون يومئذ بالكتاب سرا وعلانية كالسابقين الأولين من المهاجرين والأنصار، لهم أجر خمسين "، قالوا: يا رسول الله، منا أو منهم؟، قال: «لا بل منكم»"[1]

"آج تم اپنے رب کی طرف سے ایک واضح راستہ پر ہو، نیک کاموں کا حکم اور برائی سے روکتے ہو، اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہو، اور عنقریب تم اس سے پھر جاؤگے پس نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروگے نہ ہی اللہ کے راستے میں جہاد کروگے، آج تم اپنے رب کی طرف سے ایک واضح راستہ پر ہو، تم میں دو نشے پیدا نہیں ہوئے، جہالت اور زندہ رہنے کا نشہ، عنقریب تم اس حالت سے پھر جاؤ گے، اس زمانہ میں قرآن پر خفیہ اور علانیہ عمل کرنے والے پہلے مہاجرین اور انصار کے مانند ہوں گے، ان کیلئے پچاس آدمیوں کا ثواب ملے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ: ہم میں سے پچاس آدمیوں کا یاان میں سے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "نہیں، بلکہ تم میں سے۔"

[1] روه الإمام أبوبكر ابن أبى الدنيا فى كتاب" الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" (ص74/1) وروى بمعناه الإمام محمدبن وضاح القرطبي فى كتابه "البدع، باب في نقض عرى الإسلام ودفن الدين وإظهار البدع، ص ١٣٥"وكذانقله الهندى المتقى فى كنزالعمال، الباب الثاني في الاعتصام بالكتاب والسنة، ج١ص ٢١٤

"سکرۃ" کلام عرب میں نشے کو کہا جاتا ہے، جب کسی چیز کی محبت دل میں اتنی جا گزیں ہو جائے کہ اس چیز کے واقعی نقصانات و مفاسد سے آنکھیں بند کی جانے لگیں اور ہر قیمت پر اس چیز کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش شروع ہو جائے تو اس کو بھی نشہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی سے ہٹ کر اردو میں بھی یہ محاورات استعمال ہوتے رہتے ہیں، یہاں اس حدیث مبارک میں بھی "سکرۃ" سے یہی حالت مراد ہے، یعنی جب تک اُمت میں جہالت اور عیش و عشرت کا نشہ عام نہ ہو تب تک اس کی ایمانی تشخص برقرار رہے گا، معاشرہ میں مجموعی طور پر شرعی احکام غالب ہوں گے۔

لیکن جب اُمت مسلمہ کے افراد میں یہ دو امراض پیدا ہو جائیں گے تو معاشرہ کا دینی تشخص پامال ہو گا، اور دین اجتماعیت سے ختم ہو کر افراد کے اندر سمٹ جائیگا، دین کی حاکمیت اور برتری باقی نہیں رہے گی، خلق خدا کی دلی خیر خواہی، ایثار و قربانی کے نیک جذبات، دوسروں کے ساتھ اخلاص اور ان کی حاجت روائی، ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کی نصرت و حمایت کرنا یہ سب کچھ تار تار ہو جائیگا، ایسے ماحول و معاشرے میں پورے دین پر عمل کرنا اور اپنی پوری زندگی شریعت کے احکامات و تعلیمات کے مطابق گزارنا ایک انتہائی مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہے، کیونکہ معاشرے میں رہتے ہوئے دوسرے لوگوں سے بے نیازی نہیں ہو سکتی، ایک انسان فطری طور پر مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اس نے لامحالہ لوگوں سے میل جول رکھنا ان کے غم و درد میں شریک ہونا ہے، غرض کسی نہ کسی طرح ضرور واسطہ پڑے گا اور اِدھر ان کی یہ حالت ہے کہ جہالت کی وجہ سے دینی تعلیمات سے کوئی واقفیت نہیں، اور خود غرضی کی برکت سے خود انسانیت کو سلام کر چکے ہیں، خصوصا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا کہ اس میں براہ راست لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جس میں اکثر لوگ خوش اخلاقی صبر و تحمل اور تشکر و امتنان کی

نعمت سے محروم ہوتے ہیں بلکہ جس قدر یہ کام مشکل ہے اتنا ہی بلکہ شاید اس سے کئی گنا زیادہ اس کا اجر وثواب ہے جو اس روایت میں درج ہے، یہ محض اس اُمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی فضل وکرم ہی ہے۔

بدکردار لوگوں کو دعوت دینے کی اہمیت

" عن عبد الله بن مسعود، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «ما من نبي بعثه الله في أمة قبلي إلا كان له من أمته حواريون، وأصحاب يأخذون بسنته ويقتدون بأمره، ثم إنها تخلف من بعدهم خلوف يقولون ما لا يفعلون، ويفعلون ما لا يؤمرون، فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراء ذلك من الإيمان حبة خردل۔" [1]

"حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کے ہر نبی کے پاس کچھ مددگار ساتھی ہوتے ہیں، پس نبی ﷺ اللہ کی مشیت کے مطابق ان میں خدا کی کتاب اور اوامر کے مطابق زندگی گزارتا ہے، پھر جب اللہ اپنے نبی کو(موت دیکر) پورا پورا قبض کرلیتا ہے تو وہ "ساتھی" اللہ کی کتاب، اس کی امر اور اپنے نبی ﷺ کے سنت کے مطابق زندگی گزارتے ہیں،

[1] صحيح مسلم ،كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان،69/1

پھر ان کے گزرنے کے بعد کچھ لوگ منبر پر بیٹھ کر اچھی باتیں کرتے ہیں، لیکن برا عمل کرتے ہیں، پس جب تم اس طرح (صورت حال) دیکھو تو ہر مسلمان پر ان کے ساتھ ہاتھ سے جہاد کرنا ضروری ہے، اگر اس (ہاتھ سے کرنے) کی طاقت نہ ہو تو زبان سے (کرنا ضروری ہے) اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (جہاد کریں) اور اس کے بعد ایمان کا کوئی حصہ نہیں۔"

معلوم ہوا کہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اپنی قدرت کے مطابق ہاتھ سے یا زبان سے معاصی و منکرات ختم کرتا رہے، اور اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود منکرات پر نکیر نہ کرے نہ ہاتھ سے نہ زبان سے، یہ اس کے دین و ایمان کی کمزوری اور حد درجہ پستی کی نشانی ہے۔

حقیقی مدد اور انصاف

"عن أنس رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:انصر أخاك ظالما أو مظلوما فقال رجل: يا رسول الله، أنصره إذا كان مظلوما، أفرأيت إذا كان ظالما كيف أنصره؟ قال: تحجزه، أو تمنعه، من الظلم فإن ذلك نصره۔"[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول: اگر وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا لیکن ظالم ہونے کی صورت میں کیسے مدد کر سکتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اس کو ظلم سے روکو، یہ اس کے

[1] أخرجه البخاري فى صحيحه ،كتاب الإكراه، باب يمين الرجل لصاحبه: إنه أخوه ، إذا خاف عليه القتل أو نحوه (9 / 22)

ساتھ مدد کرنا ہے۔"

اس بات میں کیا شبہ ہے کہ ضرورت کے وقت مسلمان بھائی کی نصرت ومدد کرنا اس کا حق اور بھائی چارگی کا تقاضہ ہے، اس حدیث میں یہ بتلایا گیا کہ جس طرح دنیوی اُمور میں اورمادی چیزوں میں نصرت ہوتی ہے، یوں ہی دینی واخروی اُمور میں بھی نصرت ومدد ہوتی ہے، لہذا اگر کوئی مسلمان بھائی کسی گناہ میں مبتلا ہے تو اس کا حق ہے کہ اس کی نصرت کی جائے اور موقع محل کی مناسبت سے اس کو گناہ سے روکا جائے، جس طرح چور ڈاکو لوگ کسی شخص کو لوٹ رہے ہوں تو اپنی استطاعت کے بقدر اس کو بچانا ضروری ہے یوں ہی اگر ڈاکو سے بڑھ کر دشمن یعنی شیطان کسی مسلمان کو معصیت میں پھنسائے تو اس کو بچانا ضروری ہے۔

پڑوسیوں کو امر و نہی کرنے کی اہمیت

"خطب رسول الله ﷺ ذات يوم فأثنى على طوائف من المسلمين خيرا، ثم قال: "ما بال أقوام لا يفقهون جيرانهم، ولا يعلمونهم، ولا يعظونهم، ولا يأمرونهم، ولا ينهونهم. وما بال أقوام لا يتعلمون من جيرانهم، ولا يتفقهون، ولا يتعظون. والله ليعلمن قوم جيرانهم، ويفقهونهم ويعظونهم، ويأمرونهم، وينهونهم، وليتعلمن قوم من جيرانهم، ويتفقهون، ويتفطنون، أو لأعاجلنهم العقوبة "۔ثم قرأ رسول الله ﷺ هذه الآية {لعن الذين كفروا من بني إسرائيل على لسان داود} الآية. "[1]

---

[1] رواه الهيثمي ثم قال: رواه الطبراني في الكبير، وفيه بكير بن معروف، قال

"نبی کریم ﷺ نے ایک دن خطاب فرمایا، مسلمانوں کے کچھ جماعتوں کی تعریف کی، پھر فرمایا: ان لوگوں کو کیا ہوا جو اپنے پڑوسیوں کو سمجھاتے سکھلاتے نہیں، ان کو وعظ و نصیحت نہیں کرتے، نیک کام کی ان کو ترغیب نہیں دیتے اور برے کاموں سے روکتے نہیں؟ اور ان لوگوں کو کیا ہوا جو اپنے پڑوسیوں سے سیکھتے سمجھتے نہیں، نہ ان سے نصیحت حاصل کرتے ہیں؟ خدا کی قسم: لوگ اپنے پڑوسیوں کو سکھلائے سمجھائے، ان کو نیکیوں کا امر کریں اور برائیوں سے منع کریں، اور وہ لوگ (جن کو علم نہیں) وہ بھی اپنے پڑوسیوں سے سیکھے سمجھے، ورنہ میں جلدی ان کو سزا دوں گا، پھر حضور ﷺ نے مندرجہ بالا آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی۔"

اس حدیث مبارکہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ ہدایت دی گئی کہ جوار (پڑوس) کے حقوق میں سے ایک اہم حق یہ بھی ہے کہ ان کو دینی احکامات سے روشناس کرایا جائے، اگر کوئی عملی کمزوری سامنے آجائے، تو شفقت و نرمی کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے، اور پڑوسی پر بھی ضروری ہے کہ داعی کی بات غور و طلب سے سنے، اس پر بھرپور طریقے سے عمل کرنے کی کوشش کرے، دینی احکامات میں ایک دوسرے کی رہنمائی اور باہمی سیکھنے سکھانے کی فضا پیدا کریں۔

روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پڑوسی کے از خود پوچھنے اور خود رہنمائی لینے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اگر وہ معروف و منکر کے حوالے سے رہنمائی کا محتاج ہے تو اس کی درست رہنمائی ضروری ہے، اس کے از خود رجوع کرنے کا انتظار درست نہیں، ویسے تو یہ

البخاري: ارم به. ووثقه أحمد في رواية، وضعفه في أخرى. وقال ابن عدي: أرجو أنه لا بأس به. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد،باب في تعليم من لا يعلم، رقم الرواية: 748،ج1/164

ہر مسلمان کا حق ہے لیکن پڑوس کی وجہ سے تاکید اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

آئندہ ابواب میں یہ بات انشاءاللہ تفصیل سے ذکر کی جائیگی کہ اس تعلیم و تعلم اور امر و نہی کا حکم ہر حال میں یکساں نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں فرض وواجب، مستحب ومباح اور بعض حالات میں ممنوع ومکروہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر ان ہدایات پر عمل کرنا ایک صالح معاشرے اور دینی ماحول کیلئے انتہائی ضروری ہے، اس سے چشم پوشی کرنا نہایت نقصان دہ ہے، اس زرین ہدایت و سبق سے غفلت ولاپرواہی ہی کا ثمرہ ہے کہ آج ایک طرف دین کے مراکز ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ گناہوں اور معاصی کے اڈے بنے ہوتے ہیں، دینی اداروں کے اندر تو اس بات کا الحمدللہ کسی حد تک انتظام کیا جاتا ہے لیکن پڑوس کی فکر شاذ و نادر کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

جب مسلمان ان ہدایات پر کماحقہ عمل پیرا تھے، اس کا نتیجہ ہوتا تھا کہ بت کدوں سے دین کے خدام اور اسلام کے علمبردار نکلتے تھے، علامہ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہی خوب فرمایا:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

آخرت کی فوقیت حاصل کرنے کا راستہ

"قام رجل إلى النبي ﷺ وهو على المنبر فقال: يا رسول الله، أي الناس خير؟ قال: خير الناس أقرؤهم وأتقاهم وآمرهم بالمعروف وأنهاهم عن المنكر وأوصلهم للرحم۔ [.1]"

[1] رواه الهيثمي في "مجمع الزوائد ومنبع الفوائد"له وأشارإلي سنديه بقوله"

"درة بنت ابی لہب سے روایت ہے کہ حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے ان کی طرف کھڑے ہو کر پوچھا کہ بہترین لوگ کون ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ تلاوت کرنے والے، ڈرنے والے اور صلہ رحمی کرنے والے، اور ان میں سے زیادہ نیک کاموں کا حکم کرنے اور برے کاموں سے روکنے والے۔"

اس حدیث میں حضور ﷺ نے تقویٰ، صلہ رحمی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کو بہترین لوگوں میں سے شمار فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت اور اخروی فوقیت حاصل کرنے کیلئے ان صفات کو حاصل کرنا کتنا ضروری ہے!

ہمارے ہاں یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ جو آدمی مخلوق خدا سے بالکل لاتعلق رہے وہی سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے، لیکن اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ عام حالات میں اُمت سے بالکل لاتعلق ہونا بہتر نہیں، بلکہ ان کو سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کرتے رہنا اللہ ہی کے ہاں قبولیت کا ذریعہ ہے۔

٩٩٩

رجالهما ثقات، وفي بعضهم كلام لا يضر"(كتاب الفتن، باب في أهل المعروف وأهل المنكر، 263/7

فصل دوم

وعیدات ونقصانات

بد ترین قوم حضور ﷺ کی نظر میں

"عن النبي ﷺ قال: «بئس القوم قوم لا يرمون بالأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وبئس القوم قوم لا يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وبئس القوم قوم يجفون من يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر. "

"بری قوم وہ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مقصد نہیں بناتی، اور بری قوم وہ (بھی) ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتی، وہ لوگ (بھی) برے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے سے منہ پھیرتے ہیں"۔[1]

[1] روى هذالحديث عمروبن مرة عن رجل من بني هاشم ولم يسمه فيماأخرجه ابن وضاح في كتابه (البدع والنهي عنها، باب: فيما يدال الناس بعضهم من بعض والبقاع ، ج2ص190) وأخرجه المقدسي في "الأمر بالمعروف"له بسنده إلي عمروبن مرة عن عبيدة السلماني عن ابن

علماء کرام کے نکیر نہ کرنے پر عتاب الٰہی

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

" لولا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يصنعون (63)۔ "

" کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور ملّا، گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے؟ کیا برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں۔"

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودی علماء ومشائخ کی اس عادت پر سخت نکیر فرمائی ہے کہ لوگوں کو گناہ کرنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، ان کی اس عادت کو بری عادت قرار دیا گیا، قرآن کریم نے گناہ کرنے والے، حرام خور لوگوں اور ان کی اس فعل پر نکیر نہ کرنے والے علماء دونوں فریق پر یکساں توبیخ وتنبیہ فرمائی ہے، بلکہ بعض مفسرین کے نزدیک علماء پر گناہگاروں کے مقابلے میں زیادہ سخت نکیر فرمائی، چنانچہ ان کیلئے "لبئس ماكانوا يعملون" فرمایا اور علماء کی مذمت کرتے ہوئے "لبئس ما كانوا يصنعون" فرمایا، اسلئے حضرت عبداللہ بن عباس بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس سے زیادہ اور سخت تنبیہ والی کوئی آیت نہیں۔

امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں باتوں کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وهذه الآية من أشد الآيات على تاركي الأمر

مسعود، انظر "الأمربالمعروف" للعلامة عبدالغني المقدسي ص41، انتهى12

بالمعروف والنهي عن المنكر، لأن الله تعالى جمع بين فاعل المنكر وتارك الإنكار في الذم. قال ابن عباس: ما في القرآن آية أشدَّ توبيخاً من هذه الآية. "[1]

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے والوں کیلئے یہ سخت ترین آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گناہ کرنے والے اور اس پر نکیر نہ کرنے کو مذمت کرتے ہوئے (یکساں) جمع فرمایا، (اسی لئے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن میں اس سے زیادہ کوئی توبیخ والی آیت نہیں ہے"

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہود کے مشائخ اور علماء کو اس پر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ ان لوگوں کو برے اعمال سے کیوں نہیں روکتے، قرآن میں اس جگہ دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں، ایک ربانیوں، جس کا ترجمہ ہے اللہ والے، یعنی عابد وزاہد، جن کو ہمارے عرف میں درویش یا پیر یا مشائخ کہا جاتا ہے، اور دوسرا لفظ احبار استعمال فرمایا، یہود کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ دوسرے علماء۔۔۔ عوام کی بد عملی کے نتیجہ میں تو صرف لفظ عمل اختیار فرمایا "لبئس ماکانوا یعملون" اور خواص مشائخ اور علماء کی غلط کاری کے نتیجہ میں لفظ صنع اختیار فرمایا لبئس ما کانوا یصنعون ۔اس میں اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان کے علماء ومشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور

---

[1] زاد المسير في علم التفسير ،سورة النساء، رقم الآية:63،ج1/ 565

باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بداعتقاد ہوجانے کے خوف سے ان کے دلوں میں حمایت حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ ان بدکاروں کے اعمال بد سے بھی زیادہ اشد ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ وعلماء کو بھی یہ اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اسلئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مشائخ وعلماء کیلئے پورے قرآن میں اس سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں، اور امام ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ علماء کیلئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے"

(معارف القرآن، ج۳ص۱۸۶)

حضرت علی کرم رضی اللہ عنہ کی ایک حکیمانہ تقریر

امام ابنِ ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کی تفسیر میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے، جس سے اس کی اہمیت مزید آشکارا ہو جاتی ہے:

"عن يحيى بن يعمر قال: خطب علي بن أبي طالب فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: أيها الناس إنما هلك من هلك قبلكم بركوبهم المعاصي ولم ينههم الربانيون والأحبار، فلما تمادوا في المعاصي ولم يمنعهم الربانيون والأحبار أخذتهم العقوبات. فامروا بالمعروف وانهوا عن المنكر قبل أن ينزل بكم مثل الذي نزل بهم،

واعلموا أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لا يقطع رزقا ولا يقرب أجلا۔"[1]

یحیٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خطبہ دینے لگے تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: اے لوگوں! تم میں سے پہلے لوگ اسلئے ہلاک ہوئے کہ اُنہوں نے گناہوں کا ارتکاب شروع کر دیا اور ان کے مذہبی علماء و بزرگوں نے ان کو نہیں روکا، پھر جب گناہ کرتے کرتے آگے نکل گئے اور علماء وبزرگوں نے نہ روکا تو ان کو (اعمال کی) سزاؤں نے آپکڑا، لہٰذا ان جیسے عذاب وسزا نازل ہونے سے پہلے پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، اور یہ یاد رکھو کہ یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کسی کی رزق کو ختم نہیں کرتا نہ ہی موت کے طے شدہ وقت کو پہلے لا سکتا ہے۔"

عمومی عذاب کا ایک بنیادی سبب

"عن العرس بن عميرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " «إن الله لا يعذب العامة بعمل الخاصة حتى تعمل الخاصة بعمل تقدر العامة أن تغيره ولا تغيره، فذاك حين يأذن الله في هلاك العامة والخاصة»۔ "[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم ،سورة النساء، رقم الأية:63،ج4 / 1166

[2] رواه الهيثمى فى "مجمع الزوائد ومنبع الفوائد" وقال " رواه الطبراني، ورجاله ثقات"

كتاب الفتن، باب ظهور المعاصى، 268/7

"حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ بعض افراد کی (ناجائز) عمل کی وجہ سے تمام افراد کو عذاب نہیں دیتا مگر جب کچھ لوگ (کوئی ایسی گناہ) کرنا شروع کریں جس کو (معاشرہ کے) دیگر لوگ ختم کر سکتے ہوں اور اس کے باوجود ختم نہ کرے تو (ایسے وقت میں) اللہ تعالیٰ عام وخاص سب لوگوں کو عذاب دینے کا حکم فرماتا ہے۔"

بہت سی احادیث سے یہ مضمون ثابت ہوتا ہے کہ جب ایک قوم ومعاشرہ میں کوئی برائی عام ہو جائے تو اس پر امکانی حد تک نکیر کرنی ضروری ہے، ورنہ عذابِ الٰہی پوری قوم کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے، نیک وبد کی تمیز کے بغیر سب لوگ عذابِ الٰہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔

آج ہمیں بھی اپنے معاشرہ اور گرد بیش ماحول کا سرسری جائزہ لینا چاہئے کہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی بغاوتیں ہو رہی ہیں، چوری، زنا، شراب خوری، جوا اور سود کے علاہ غیبت، تصویر، خلاف حقیقت مبالغہ آرائی اور اللہ کے قانون کے مقابلے میں قانون سازی جیسے طرح طرح کے کبیرہ گناہ عوام وخواص میں عام ہیں، اتنا شیوع وعموم ہے کہ کوئی اس کو عملاً گناہ کہنے کیلئے تیار بھی نہیں، اس خطرناک حالات میں اپنی امکانی حد تک ان اُمور پر نکیر کرنا ضروری ہے۔

لعنت اور مصیبتوں میں گرفتار ہونے کی وجوہات

"عن سالم بن عبد الله، عن أبيه، قال: قال رسول الله ﷺ: «أيها الناس، مروا بالمعروف، وانهوا عن المنكر، قبل أن تدعوا الله فلا يستجيب لكم، وقبل أن تستغفروه فلا يغفر لكم، إن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لا

يدفع رزقا، ولا يقرب أجلا، وإن الأحبار من اليهود، والرهبان من النصارى لما تركوا الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لعنهم الله على لسان أنبيائهم، ثم عموا بالبلاء»۔"[1]

"حضور ﷺ نے فرمایا"اے لوگو: نیک کاموں کاامر کیا کرواور برے کاموں سے روکا کرو اس سے پہلے کہ تم اللہ سے دعاء کرواور وہ قبول نہ کرے، تم اس سے اپنی گناہوں کی معافی مانگو وہ معاف نہ کرے، بے شک نیک کاموں کا حکم کرنااور برائی سے روکنا رزق کو نہیں روکتااور نہ ہی موت کاوقت قریب کرتاہے، بے شک یہودی علماءاور عیسائی راہبوں نے جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چھوڑدیاتواللہ نےان کے انبیاء (کرام) کے زبان سےان کوملعون کردیا پھروہ سب مصیبت کے شکار ہوئے۔"

معلوم ہواکہ محض لوگوں کے گناہ کرنے کی وجہ سے کسی قوم کوعمومی عذاب دیکر ختم نہیں کیاجاتالیکن جب لوگ عمومی طور پر منکرات کے عادی ہو جاتے ہیں اور علماء ومشائخ بھی اپنافرض منصبی "امر بالمعروف و نہی عن المنکر "چھوڑ بیٹھ جاتے ہیں،اس وقت ایسی قوم لعنت کی مستحق بن جاتی ہے،اور پھر وقت آجاتاہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو طرح طرح کی مصائب وآفات میں مبتلا کرتاہے، علامہ اقبال نے بہت خوب فرمایاہے کہ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے

[1] رواه ابن أبي الدنيا فی كتابه" الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر" بإسناد رجال يحتج بهم(88/1)

کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

جب عام معاصی ومنکرات کے خوگر بن جائے اور حلال وحرام کی تمیز دل سے نکل جائے اور ساتھ علماء ومشائخ بھی ان کوتاہیوں کی تلافی نہ کریں تو یقیناً یہ اُمت وملت مجرم ٹھہر جاتی ہے۔

باہمی رنجش اور اختلافات پیدا ہونے کی جڑ

"عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «إن من كان قبلكم كانوا إذا عمل العامل منهم بالخطيئة نهاه الناهي تعذيرا، حتى إذا كان الغد جالسه وواكله وشاربه، كأنه لم يره على خطيئة بالأمس، فلما رأى الله ذلك منهم ضرب قلوب بعضهم على بعض، ثم لعنهم على لسان نبيهم داود وعيسى ابن مريم، ذلك بما عصوا وكانوا يعتدون، والذي نفس محمد بيده، لتأمرن بالمعروف، ولتنهون عن المنكر، ولتأخذن على يدي الظالم، ولتأطرنه على الحق أطرا، أو ليضربن الله قلوب بعضكم على بعض، ثم ليلعننكم كما لعنهم۔"[1]

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا" تم

---

[1] المعجم الكبير للطبراني (10 / 146)ورواه الهيثمى عن الطبرانى ثم قال" رجاله رجال الصحيح" انظر"مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (كتاب الفتن باب وجوب إنكار المنكر،7 / 269)

سے پہلے لوگوں میں جب کوئی شخص برائی کرتا تو روکنے والا اس کو روک دیتا، لیکن کل اس کیساتھ ایسا اُٹھک بیٹھک، کھاتا پیتا گویا اس نے برائی کرتے ہوئے اس کو کل دیکھا ہی نہیں تھا، جب اللہ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو بعض لوگوں کے دلوں کو دوسروں کے دلوں پر مار دیا اور پھر ان کو اپنے نبی حضرت داؤد اور عیسی بن مریم کی زبان سے ملعون کیا، یہ ان کی گناہوں اور (اللہ تعالیٰ کے حدود سے) تجاوز کرنے کی وجہ سے تھا۔

اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم ضرور امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو، اور بے وقوف کا ہاتھ پکڑو، پس تو حق پر مضبوطی سے تھمے رہو ورنہ اللہ تم میں سے بعض کے دوسرے کے دلوں پر مار دے گا، پھر پہلے لوگوں کی طرح تم کو ملعون کر دے گا۔"

اس حدیث مبارکہ میں بنی اسرائیل کا حال سنا کر یہ تعلیم دی گئی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کہ پابندی ضروری ہے، حق بات پر جم کر رہنا اور ظلم ومعصیت کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کرنا لازم ہے، ورنہ تو جو لوگ اس کی پابندی نہیں کرتے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کھوٹ اور حسد وبغض وغیرہ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی ایک طرح کا عذاب ہے، اور پھر وہ مرحلہ آجاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ اس قوم کو ملعون کرتی ہے جس کے بعد وہ لوگ اللہ تعالی کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عمومی عذاب کا ذریعہ

"قال أبو بكر،: سمعت رسول الله ﷺ في ذلك المجلس يقول:"ماترك قوم القتال في سبيل الله إلا ضربهم الله بذل، ولا قر قوم المنكر بين أظهرهم إلا عمهم الله

بعقاب۔"[1]

"حضرت ابو بکر نے کہا کہ میں نے ایک مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جس قوم نے بھی اللہ کی راہ میں لڑنے (کے حکم) کو چھوڑا اللہ نے ان کو ذلت دی، اور جس قوم نے بھی اپنے درمیان کسی گناہ کو جگہ دی اللہ تعالیٰ نے ان کو عمومی سزا دی۔"

اس حدیث مبارکہ کے دو جز ہیں: ایک یہ کہ جو قوم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال چھوڑتی ہیں اللہ تعالیٰ ان پر ذلت و رسوائی ڈال دیتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ قوم کسی خاص شعبہ یا میدان زندگی میں رسوا ہو جاتی ہے بلکہ ذلت و رسوائی ان کے گلے کا ہار بن جاتی ہے، جو رفتہ رفتہ ان کا شعار بن جاتی ہے، حدیث مبارکہ کے دوسرے جز کا مطلب یہ ہے کہ جب اپنے درمیان رائج منکرات و معاصی پر نکیر کرنا چھوڑتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو عمومی عذاب کی سزا دیتے ہیں، آج اُمت مسلمہ طرح طرح مشکلات و مصائب کی آماجگاہ بن چکی ہے، یہ اس کوتاہی و غفلت کا نتیجہ ہے، لیکن یہ عذاب اُمت کو ختم کرنے کے لیے نہیں، بلکہ دعوت فکر و عمل کے اسباب ہیں، جس کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف اور پھر آئندہ زندگی میں اس کی تلافی و تدارک کرنے کی ضرورت ہے، قرآن کریم میں ہے:

"أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا

---

[1] رواه الإمام أبوبكر ابن أبي الدنيا في "الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" (1 / 120) ورواه الشيخ الإمام السيوطي في الدرالمنثور (في تفسيرسورة المائدة، رقم الأية105، 3 / 218) والمتقي الهندي في كنزالعمال (رقم الرواية،8447، 681/3) كلاهماعن ابن مرديه

يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔"

" (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال میں ایک دفعہ یا دو دفعہ آزمائے جاتے ہیں پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔)"

بدکردار حکمرانوں کے مسلط ہو جانے کا ایک بنیادی سبب

"عن نافع، عن ابن عمر، رضي الله عنه، قال: إن رسول الله ﷺ قال: «لتأمرن بالمعروف، ولتنهون عن المنكر أو ليسلطن الله عليكم شراركم، فليسومنكم سوء العذاب، ثم يدعو خياركم فلا يستجاب لهم۔"[1]

"تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم میں سے شریر لوگوں کو تمہارے اُوپر مسلط کر دیگا جو تم کو بری طرح عذاب دیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ دعاء کریں گے لیکن قبول نہیں ہوں گی۔"

---

[1] رواه ابن أبي الدنيا في كتابه"الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر "(ص53) بإسناد فيه كوثربن حكيم وهووإن كان ضعيفا عند كثيرمن المحدثين لكن رواه البزاز في مسنده ۔ ۔ بسند خال عنه (راجع مسند البزار،163/15) وفيه حبان بن علي وهو ضعيف عند المحدثين(كمافي تقريب التهذيب، رقم الراوي1076، ص188)لكن للرواية طرق متعددة يرتقي به إلي درجةيحتج به في الفضائل لاسيما وفي الترمذي رواية تويده وقدحسنه الترمذي(انظر: سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ما جاء في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، رقم الحديث، 2169)

نصرت الٰہی سے محروم ہونے کا راستہ

"عن عبد الله بن عمرو، رضي الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا رأيت أمتي تهاب فلا تقول للظالم يا ظالم فقد تودع منهم»."[1]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا"جب آپ میری اُمت کو دیکھے کہ وہ ڈر کی وجہ سے ظالم کو ظالم نہ کہے تو (نصرت غیبی اور تائید الٰہی) ان سے ختم ہو جائیگی۔"

"ودع"کا معنی چھوڑنا اور رخصت کرنا ہے، عام طور پر اہل عرب اس کا ماضی استعمال نہیں کرتے بلکہ ماضی میں اس کا مفہوم ادا کرنے کیلئے لفظ "ترک"کا سہارا لیتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن الاثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ اس لفظ کی تحقیق کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"«إذا لم ينكر الناس المنكر فقد تودع منهم» أي أسلموا إلى ما استحقوه من النكير عليهم، وتركوا وما استحبوه من المعاصي، حتى يكثروا منها فيستوجبوا العقوبة» .
"

"یعنی جس نکیر کے وہ مستحق تھے اسی کے حوالہ کردئے جاتے ہیں، اوران کواوران کے پسندیدہ گناہوں کو چھوڑ دیا جاتاہے کہ جب زیادہ ہو جائیں

[1] رواه الحاكم في المستدرك على الصحيحين، وقال" هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه " وصححه الذهبي أيضا في تعليقاته عليه (كتاب الأحكام، رقم الرواية: 7036،4/ 108)

گے تو عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔"[1]

ظالم کو ظالم کہنا نہی عن المنکر ہی کی ایک صورت ہے، اس حدیث شریف سے واضح ہوا کہ جب نہی عن المنکر کا سلسلہ ختم ہو جائیگا اور مسلمان منکر پر نکیر کرنا چھوڑ دیں گے تو یہ اُمت اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت اور غیبی امداد سے محروم ہو جائیگی جو کہ فتح وغلبہ کا اصل سرمایہ ہے۔

منافقت کی ایک شاخ

"عن عمر بن عبد الله أنه حدثه أن عبد الله بن عمر لقي ناسا خرجوا من عند مروان فقال: من أين جاء هؤلاء؟ قالوا: خرجنا من عند الأمير مروان قال: وكل حق رأيتموه تكلمتم به، وأعنتم عليه، وكل منكر رأيتموه أنكرتموه ورددتموه عليه، قالوا: لا والله، بل يقول: ما ينكر، فنقول: قد أصبت، أصلحك الله، فإذا خرجنا من عنده قلنا قاتله الله، ما أظلمه وأفجره قال عبد الله: " كنا بعهد رسول الله ﷺ نعد هذا نفاقا لمن كان هكذا۔"[2]

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ کچھ لوگوں سے ملے جو مروان کے دربار سے نکلے تھے، تو آپ نے پوچھا کہ کہاں سے آئے؟ اُنہوں نے کہا کہ ہم امیر مروان

[1] النهاية في غريب الحديث والأثر، باب الواومع الدال، مادة ودع،5 / 166

[2] مسند أحمد ، مسندعبدالله بن عمر، رقم الرواية: 5373 ،ج9 / 273 ،الرسالة

کے ہاں سے آئے، آپ نے عرض کیا کہ کیا جو حق بات بھی تم نے دیکھی وہ اس کو بتادی اوراس میں اس کا تعاون کیا؟ اور جو کچھ بھی منکر دیکھاتواس پر ردّو نکیر کیا؟ اُنہوں نے کہا: ہر گز نہیں، بلکہ وہ (بعض اوقات) کوئی منکر بات بھی کرتاتو ہم اس کی تائید کرتے اور دعا دیتے، پھر جب اس کے ہاں سے نکلے تو ہم نے کہاکہ اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کرے کتناہی بڑا ظالم وفاجر ہے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: "ہم حضور ﷺ کے دور میں اس جیسا کرنے والے کی اس کارکردگی کو نفاق سمجھتے تھے۔"

ماتحت لوگوں کے ساتھ اکثر ایسا پیش آتاہے کہ برسراقتداراور صاحب اختیار لوگ بعض ایسے حرکات کرتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہوتے ہیں، دینی علم اور مذہبی شعور کم ہونے کی وجہ سے مجالس میں اکثرایسی باتیں سامنے آجاتی ہیں جو سراسر خلاف شریعت ہوتی ہیں۔

ایسے مواقع پراوّلاً تو حکمت و مصلحت کیساتھ نکیر کرنا چاہئے جس کی تمام تفصیلات آئندہ ابواب میں بیان ہوں گی انشاء اللہ۔ اگرکسی بھی درجہ میں نکیرنہ کرسکے توکم ازکم دل میں اس کا یہ کام غلط جاننااور اپنے چہرہ سے اس کا اظہار کر دیناچاہئے، اس جیسی صورت حال میں ان کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانا چاہے وہ زبان یابیان کی شکل میں ہویااپنے عمل وکردار کی صورت میں درحقیقت ان کے ساتھ اس گناہ میں شریک ہوناہے جیساکہ آئندہ نصوص سے واضح ہو جائیگاانشاءاللہ۔

دعوت نہ دینے کی دو بنیادی وجوہات

نہی عن المنکرنہ کرنے کی بنیادی طور پر دووجوہات ہوتی ہے:

اپنی زندگی کولاحق خطرہ یعنی دیکھنے والا یہ خوف محسوس کرتاہے کہ اگرمیں کچھ

بھی نکیر کروں گا تو مخاطب مجھے نقصان پہنچائے گا اور یوں میری زندگی خطرے میں پڑ جائیگی۔

دوسری بڑی وجہ جس کے باعث اپنے سے بڑے لوگوں پر نکیر نہیں کی جاتی وہ معاش کا مسئلہ ہے، خصوصاً جب ذریعہ معاش ہی اس آدمی کے ساتھ متعلق ہو جو خود نکیر میں مبتلا ہو، ایسی صورت میں نکیر کرنا انتہائی خوفناک اور نقصان دہ تصور کیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں خاموش رہنے کی بالکل صحیح تشخیص کر کے فرمایا گیا:

"لا يمنعن أحدكم رهبة الناس أن يقول بحق إذا رآه أويذكر بعظيم، فإنه لا يقرب من أجل ولا يبعد من رزق۔"[1]

"لوگوں کا ڈر تم میں سے کسی کو حق بات کہنے سے نہ روکے۔۔ کیونکہ یہ موت کے مقررہ وقت کو بالکل قریب نہیں کرتا نہ ہی رزق دور کرتا ہے۔"

اس روایت نے ان دونوں خدشات کی بنیاد ہی کاٹ ڈالی، رزق کا ڈر ہو یا موت وتکلیف کا خوف، دونوں اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں پہلے سے مقرر کر رکھی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے نہ کرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ جہاں تک ہو سکے شریعت کا یہ حکم بجالانا چاہئے، اور زندگی وموت اسی طرح معاش کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ ہی پر توکل وبھروسہ رکھ لینا چاہیے، جب لوگوں کے ساتھ زندگی ومعاش کا تعلق ظاہر میں

---

[1] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب فيمن خاف فأنكر بقلبه ومن تكلم، رقم الرواية ، 12167 ، ج7 / 272)وكذا رواه البيهقي في (شعب الإيمان، الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، الشعبة52 ، رقم الرواية7172، ج66/10) إلا أن فيه علي بن يزيد وهومتروك۔

محسوس نظر آتا ہے وہ سب اسباب کے درجہ میں ہے اور اسباب کی وجہ سے مسبب الاسباب کا ناراض کرنا چھوڑنا بڑی حماقت اور نادانی کی بات ہے۔

منکرات پر خاموشی کے نقصانات

"عن ابن عباس، رضي الله عنهما، قال: قيل: يا رسول الله أتهلك القرية وفيها الصالحون؟ قال: نعم قيل: بم؟ قال: بدهنتهم وسكوتهم عن معاصي الله. " [1]

"حضرت ابن عباس ﷛ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ کوئی گاؤں (عذاب الہی) سے ہلاک ہوسکتا ہے جبکہ اس میں نیک لوگ بھی ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا"ہاں"پوچھا گیا کیوں؟(کن اعمال کی پاداش میں یہ عذاب نازل ہوسکتا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا"ان(نیک کہلائے جانے والے لوگوں) کی مداہنت اور اللہ تعالیٰ کے نافرمانیوں سے خاموشی کی وجہ سے۔"

کسی شرعی مصلحت کے بغیر معاصی اور منکرات پر قول وفعل اور دل وزبان سے کسی طرح نکیر نہ کرنا"مداہنت" کہلاتا ہے جو شریعت کی نگاہِ بصیرت میں ایک عظیم

---

[1] رواه البزارفي مسنده (مسندالبزار، مسندابن عباس ، رقم الرواية: 4743، وفي سنده ضعف من جهة يحى بن يعلى الأسلمى لكن لما لم يكن متعلقابالأحكام من الحلال والحرام وتويده الروايات الأخر ففي ذكره سعة إنشاءالله تعالى۔

جرم اور گناہ کبیرہ ہے، احادیثِ مبارکہ میں اس پر بڑی بڑی وعیدات وارد ہوئی، اس حدیث میں بتلایا گیا کہ اگر نیک لوگ مداہنت کرنے لگے، اللہ تعالیٰ کی کھلی نافرمانیاں اور بغاوتیں ہوتی رہے اور یہ لوگ نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دئے بغیر خاموش پڑے رہیں، تو اس قوم کو اللہ تعالیٰ کی عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

کاردعوت اور منفی پروپیگنڈیں

"عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتي على الناس زمان يكون أكثرهم وجوههم وجوه المؤمنين فقلوبهم قلوب الذئاب الضواري سفاكون للدماء لا يرعون عن قبيح فعلوه فإن تابعتهم واربوك وإن حدثوك كذبوك وإن ائتمنتهم خانوك وإن تواريت عنهم اغتابوك صبيهم عارم وشابهم شاطر وشيخم فاجر لا يأمرهم بمعروف ولا ينهاهم عن منكر الاختلاط بهم ذلة وطلب ما في أيدهم فقر الحليم فيهم غاو والغاوي فيهم حليم السنة فيهم بدعة والبدعة فيهم سنة والآمر بينهم بالمعروف متهم والفاسق فيهم مشرف والمؤمن بينهم مستضعف فإذا فعلوا ذلك سلط الله عليهم أقواما إن تكلموا قتلونهم وإن سكتوا استباحوهم يستأثرون عليهم ويطأون حريمهم ويجورون في حكمهم. "

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان میں سے اکثر کے چہرے مسلمانوں

کے ہوں گے لیکن ان کے دل خونخوار درندوں کے ہوں گے، بہت خون بہانے والے ہوں گے اپنے منکرات سے باز نہیں آئیں گے، اگرآپ ان کے تابع رہے تو تمہیں دھوکہ دیں گے اور اگرآپ ایک مرتبہ کافی گفتگو کریں تو جھوٹ بولیں گے، اگران کوامانت سپرد کریں تو خیانت کریں گے اوران سے غائب رہے تو غیبت کریں گے،ان کے چھوٹے بداخلاق ہوں گے جوان دھوکہ باز، اور بوڑھے گناہگار ہوں گے وہ ان کو نیکیوں کا حکم کریں گے اورنہ ہی برائی سے روکیں گے، (ان کی پستی کا یہ حال ہوگا کہ)ان کے ساتھ اختلاط رکھنا ذلت ہوگاان کامال وحال طلب کرنا(حقیقت میں)غربت ہے، ان کے درمیان بردبار شخص گمراہ تصور ہوگااور گمراہ آدمی بردبار شمار ہوگا،ان کے درمیان سنت بدعت شمار ہوگی اوربدعت سنت سمجھی جائےگی، ان کے درمیان نیکیوں کے حکم کرنے والے پر(طرح طرح کی) تہمتیں لگائی جائیں گی۔۔۔"[1]

اس روایت میں رحمتِ کائنات ﷺ نے جوکچھ پیش گوئی فرمائی، ہر کوئی اپنے گردوپیش ماحول اورانسانی اخلاق کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچ سکتاہے کہ تقریباً تمام فرمودات حرف بحرف پوری ہوں چکی ہیں، حدیث کے آخر میں جواس کا انجامِ بد مذکور ہے ساری ملتِ اسلامیہ اس سے دوچار ہے۔

ذلت ومسکنت اور مظلومیت وتشدد کے اس بحرِ بے کراں سے بچنے کاواحد راستہ ان ہی بہیمانہ اوصاف واخلاق، غیبت وخیانت، مکروفریب، مداہنت وبدعت اور فسق وفجور کوپاؤں تلے روندھ کر نبوی اوصاف واخلاق اورعادات واطوار کواپنانا ہے، یہی وہ آب حیات ہے جس سے ملت کے نیم مردہ جسم میں حیاتِ جاوداں پیداہو جانے کاگمان

[1] الأمر بالمعروف لعبد الغني المقدسي ،رقم الرواية،62،ص 48

بلکہ یقین وابستہ کیا جاسکتا ہے۔

بڑا سبق جو اس حدیث سے حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ جب اُمت میں مذکور بالا صفاتِ بدعام ہو جائیگی، اس زمانے میں صحیح نہج پر دعوت دینے والا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے پر طرح طرح کی تہمتیں لگے گی، اس پر انواع و اصناف کے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گی، لیکن داعی کو ان دروغ گوئیوں اور غلط بیانیوں کے رو میں بہہ کر دعوت چھوڑنا نہیں چاہئے، بلکہ " والعاقبة للمتقين" الہی قانون اور "وأما ما ينفع الناس" کے کائناتی ضابطے کو مد نظر رکھ کر اپنے مشن کو مضبوطی اور دلیری سے جاری وساری رکھنا چاہئے۔

آج وہ کونسا الزام ہے جو مجاہدینِ حق اور داعیینِ دین کے سر نہ لگایا گیا ہو؟ وہ کیا خرابی ہے، جس کا ذمہ دار ان پاکباز شخصیات کو نہ ٹھہرایا گیا ہو؟ دہشت گرد، بنیاد پرست، انسانی حقوق کے دشمن، انتہاء پسند، تشدد پسند، حالات سے نابلد، دنیا سے ناواقف، اخلاق سے کورے، رفتارِ زمانہ سے ناآشنا ۔۔۔۔ سمیت وہ کونسا لقب ہے جس سے ان حضرات کو نہ نوازا گیا ہو؟ وہ کونسی برائی ہے جس کا نزلہ ان بے گناہوں کے سر نہ اُتارا گیا؟ دنیا جہاں کا آخر وہ کونسا پروپیگنڈہ ہے جو ان کے خلاف نہ رچایا گیا؟

ان جیسے کٹھن مراحل اور فیصلہ کن حالات میں داعی حق کو مخالف پروپیگنڈے یا نامساعد حالات سے پست ہمت نہ ہونا چاہئے بلکہ اس اور اس جیسے اور متعدد احادیث کو پیش نظر رکھ کر اس کو تسلی ویقین کرنا چاہئے کہ اللہ تعالی نے اس معاشرہ کی صحیح نبض شناسی کی توفیق دی۔

غضب الٰہی کی ایک علامت

"لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (78) كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (79) "

"لعنت کھائی منکروں نے بنی اسرائیل میں سے، داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بیٹے مریم کی۔ یہ اس سے کہ گنہگار تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔ آپس میں منع نہ کرتے برے کام سے، جو کر رہے تھے۔ کیا براکام ہے جو کرتے تھے۔ "

(ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب)

بنی اسرائیل کے ملعون ہو جانے کی بنیادی وجوہات

اس آیتِ کریمہ میں خالق کائنات نے بنی اسرائیل کے کفار پر لعنت کئے جانے کا ذکر فرمایا ہے، ان کے ملعون ہونے کے اسباب کیا تھے؟ کن جرائم اور حرکات کی پاداش میں ان کو یہ سزا ملی؟ قرآن مجید نے اگلے ہی جملہ سے اس سوال کا جواب دیا، فرمایا "ذلک بما عصوا" یہ ان کی اعتقادی اور عملی گناہوں اور حد سے تجاوز کرنے کی سزا تھی، اسی کی سیاق میں فرمایا "کانوا لایتناھون" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ملعون کئے جانے کے اہم اسباب میں سے ان کا نہی عن المنکر نہ کرنا بھی تھا، جو برائیاں اور معاصی ان کے ماحول میں معمول زندگی بن گئی تھی، ان سے یہ ممانعت اور نہی کرنے کا فریضہ سرانجام نہ دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس غفلت اور لاابالی پن کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں "لبئس ماكانوا يفعلون" یہ لوگ جو کام کرتے ہیں وہ براہے۔

اللہ تعالیٰ کے ناراضگی کی نشانی

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الدرالمنثور" میں حضرت کعب احبارؒ سے نقل فرمایاہے کہ جب اللہ تعالی کسی قوم سے ناراض ہوتاہے تواس ناراضگی کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ ذلیل ہوجاتے ہیں جس کااثر مخلوق پر یہ پڑتاہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرناچھوڑدیتے ہیں، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کردیناذلت خداوندی کاثمرہ اور غضبِ الٰہی کی علامت ہے، استشہاد کے طور پر آپؒ نے مذکورہ آیت ہی کی تلاوت فرمائی، چنانچہ الدرالمنثور میں ہے:

"أخرج أبو الشيخ عن أبي عمرو بن حماس أن ابن الزبير قال لكعب: هل لله من علامة في العباد إذا سخط عليهم قال: نعم يذلهم فلا يامرون بالمعروف ولاينهون عن المنكر وفي القرآن {لعن الذين كفروا من بني إسرائيل}" [1]

"ابن زبیر نے حضرت کعب سے عرض کیاکہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے

---

[1] الدرالمنثورفي التفسير بالمأثور،سورة المائدة، رقم الآية: 78،ج3 / 126

ناراض ہو جاتے ہیں تو اس کی کوئی نشانی بھی ہے؟ حضرت کعب نے کہا: ہاں! اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کرتا ہے جس کے بعد وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے، قرآن کریم میں بھی ہے "لعن الذین""

امام ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ بھی آیتِ کریمہ کی یہی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"عن ابن عباس: لعنوا في التوراة والإنجيل وفي الزبور، وفي الفرقان. ثم بين حالهم فيما كانوا يعتمدونه في زمانهم، فقال: {كانوا لا يتناهون عن منكر فعلوه لبئس ما كانوا يفعلون} أي: كان لا ينهى أحد منهم أحدا عن ارتكاب المآثم والمحارم، ثم ذمهم على ذلك ليحذر أن يركب مثل الذي ارتكبوا، فقال: {لبئس ما كانوا يفعلون}"[1]

"حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل پر تورات وانجیل اور زبور وقرآن (چاروں کتابوں) میں لعنت کی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی کارکردگی بیان فرمائی۔۔یعنی وہ ایک دوسرے کو گناہ اور حرام کاموں سے نہیں روکتے تھے، پھر ان کی اس فعلِ بد کی مذمت فرمائی تاکہ ان جیسے کام کا کوئی ارتکاب نہ کرے۔"

افسوس: آج مسلمانوں کی ذلت اور پستہ حالی کا ہر جگہ رونا رویا جارہا ہے، اس کے نتائج وعواقب پر غور وخوض کیا جارہا ہے، اس کے زوال وانحطاط پر ہر کوئی مرثیہ خواں

---

[1] تفسير ابن كثير،سورة المائدة، رقم الآية: 78،ج3 / 160-

بیٹھا ہے، لیکن جہاں تک دیکھنے میں آتا ہے اس کے بنیادی وجوہات واسباب اور حقیقی عوامل ومحرکات پر سوچنے والے بہت کم ہیں، کاش اُمت مرحومہ کا کوئی حقیقی دردمندان مختلف احادیث کا بھی جائزہ لے جن میں حضور اقدس ﷺ نے اس مرض کے اسباب وعلاج کا تذکرہ فرمایا ہے۔

معاصی سے نہ روکنے والوں کا خطرناک انجام

"أخرج الخطيب من طريق أبي سلمة عن أبيه عن النبي ﷺ أنه قال: «والذي نفس محمد ﷺ بيده ليخرجن من أمتي أناس من قبورهم في صورة القردة والخنازير بما داهنوا أهل المعاصي وكفوا عن نهيهم وهم يستطيعون»."[1]

"حضور ﷺ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، میری اُمت میں سے کچھ لوگ اپنی قبروں سے بندروں اور خنزیر کی شکل میں نکلیں گے، اس وجہ سے کہ اُنہوں نے گناہگاروں کے ساتھ مداہنت کا رویہ اختیار کیا ہوگا اور استطاعت کے باوجود ان کو (برائی سے) منع کرنے سے رکے ہوں گے۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ محض انفرادی اصلاح کافی نہیں، بلکہ نجاتِ اُخروی حاصل کرنے اور عذابِ خداوندی سے بچنے کیلئے اس کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکامات پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، گناہوں اور منکرات کو نہ

---

[1] روح المعاني ،سورة المائدة، رقم الآية،93،ج377/3

روکنے اور مداہنت کرنے کی وجہ سے بہت ممکن ہے کہ اصل گناہ کرنے سے زیادہ عبرت ناک انجام و سزا کا سامنا کرنا پڑے۔

روز محشر کا ایک سوال

"أبا سعيد الخدري يذكر إنه سمع رسول الله ﷺ يقول: "إن الله جل وعلا يسأل العبد يوم القيامة حتى إنه ليقول له: ما منعك إذا رأيت المنكر أن تنكره؟ فإذا لقن الله عبدا حجته يقول: يا رب وثقت بك وفرقت من الناس أو فرقت من الناس ووثقت بك۔"[1]

"حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک قیامت کے دن اللہ بندے سے یہاں تک پوچھے گے کہ برائی دیکھتے ہوئے آپ نے اس پر نکیر کیوں نہیں کی؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ کسی بندے کو دلیل سکھائے تو وہ کہے گا کہ اے اللہ: میں آپ کے اعتماد پر ان سے جدا ہوا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کے متعلق قیامت کے دن پوچھ گچھ ہوگی، کہ میری نافرمانی کا ارتکاب ہوتے دیکھ کر آپ نے لوگوں کو اس سے روکا کیوں نہیں؟ یہ بھی معلوم ہوا کہ کہیں کوئی شخص اپنی قدرت کے بقدر منکر سے روکنے کی کوشش

---

[1] صحيح ابن حبان ، باب اخباره عليه السلام عن البعث، ذكر الإخبار عن سؤال الرب جل وعلا عبده عن تركه الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، 16/ 368

کرے، لیکن اس کی کوشش بارآور ثابت نہ ہو، اور منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو تو وہاں اس منکر میں بالکل شریک نہ ہو، بلاضرورت ایسا کرنا بھی مداہنت کی ایک شاخ ہے۔

نیک لوگوں کے ہلاک ہو جانے کا ایک عبرتناک واقعہ

"عن أبي هزان، قال: " بعث الله عز وجل ملكين إلى أهل قرية أن دمراها بمن فيها، فوجدا فيها رجلا قائما يصلي في مسجد فعمد أحدهما إلى الله عز وجل فقال: يا رب، إنا وجدنا فيها عبدك فلانا يصلي في مسجده، فقال الله عز وجل: «دمراها ودمراه معها، فإنه ما معر وجهه في قط»"[1]

"ابو ہزان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کی طرف دو فرشتوں کو بھیجا کہ باشندگان سمیت پورے گاؤں کو ہلاک کریں، تو اُنہوں نے اس گاؤں میں ایک شخص کو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ان میں سے ایک نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ہم نے اس گاؤں میں آپ کا فلاں بندہ دیکھا جو مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا (تو اس جیسے نیک بندے کے ہوتے ہوئے ہم کیونکر عذاب دیں؟) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گاؤں کو بھی ہلاک کرو اور اس کو بھی، کیونکہ میری وجہ سے اس کے چہرے پر کبھی بل نہیں آیا۔"

یہاں تو صرف اس بندے کا نماز پڑھنا مذکور ہے، لیکن بعض روایات میں یہاں تک مذکور ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے یہاں تک عرض کیا کہ اس بندے نے

---

[1] كذا فى الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لابن أبي الدنيا (108)

آپ کی بالکل نافرمانی ہی نہیں کی، پھر عذاب وہلاکت کا حکم کیسے؟

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "شعب الایمان" میں ایک روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے:

"عن جابر، قال: قال رسول الله ﷺ: " أوحى الله عز وجل إلى جبريل عليه السلام أن أقلب مدينة كذا وكذا بأهلها، قال: فقال: يا رب إن فيهم عبدك فلانا لم يعصك طرفة عين، قال: فقال: اقلبها عليهم، فإن وجهه لم يتمعر في ساعة قط ."

"اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ فلان فلان شہر کو اپنے باشندگان سمیت الٹ دو، جبرئیل نے دربار خداوندی میں عرض کیا کہ اے اللہ: اس میں تو آپ کا فلان بندہ بھی موجود ہے جس نے آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی آپ کی کوئی نافرمانی نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس پر شہر اُلٹ دو کیونکہ میرے (نافرمانی کئے جانے کی وجہ سے) اس کا موڈ کبھی خراب نہ ہوا۔ "[1]

اسلام ایک ہمہ گیر اور عالمگیر رشتہ ہے، احادیثِ مبارکہ میں اس کو جسمِ واحد جیسا قرار دیا گیا، جس طرح جسمِ واحد کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہونے سے پورا بدن بے

---

[1] شعب الإيمان (رقم الشعبة:52،رقم الحديث: 7189، ج74/10)وقال الهيثمي تحته: رواه الطبراني في الأوسط من رواية عبيد بن إسحاق العطار عن عمار بن سيف، وكلاهما ضعيف، ووثق عمار بن سيف ابن المبارك وجماعة، ورضي أبو حاتم عبيد بن إسحاق (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد،كتاب الفتن، باب فيمن لم يغضب لله، 7 / 270

چین رہتا ہے، صرف چھوٹے سے آنکھ میں تکلیف ہونے سے پورا بدن بے آرام رہتا ہے، اسی طرح اُمتِ مسلمہ کو بھی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک و سہیم ہونا چاہئے۔

یہ احساس و تعلق صرف ظاہری دکھ درد ہی کی حد تک محدود نہیں، بلکہ اعمال نیک وبدی میں بھی یہی صورت حال ہونا چاہئے جو حقیقی نجات و کامیابی یا دائمی الم و تکلیف کا سبب ہے، اگر کوئی مسلمان گناہ میں مبتلا ہے تو دوسرے مسلمان کو اس کی فکر کرنی چاہئے، خیر خواہی اور حکمت و مصلحت سے اس کو باز رہنے کی تبلیغ و تلقین کرتا رہے، اگر سب کچھ آزمانے کے بعد وہ اپنے ہی بد عملی پر مصر رہے تو کم سے کم یہ طریقہ اختیار کرے جو اس واقعہ میں بتایا گیا کہ ان کی اس بد عملی سے ناراضگی کا رویہ اختیار کرے۔

گزشتہ اقوام پر قرآن کریم کا اظہارِ افسوس

"فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ـ"

"سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں کہ ان میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ سے ملک میں مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچا لیا ان میں سے، اور چلے وہ لوگ جو ظالم تھے اسی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گناہگار۔" (ترجمہ حضرت شیخ الہند صاحب)[1]

اس آیت کریمہ میں سابقہ اُمتوں کی تاریخ بتا دی گئی، ان میں سے جو لوگ

[1] سورة هود، رقم الآية ١١٦

عذاب میں گرفتار ہوئے اور جن کے حصہ میں نجات لکھی گئی، ان دونوں قسم کے لوگوں کے اعمال و کرتوت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا۔

اس نجات وعذاب کے اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب بھی اسی آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے، آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ عذاب خداوندی سے حفاظت کی وجہ لوگوں کو برائی اور معاصی سے روکنا ہے، جن لوگوں نے اس کو عمل میں لایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی، دیگر لوگ عذاب میں ہلاک کردئے گئے، اور ساتھ ساتھ یہ رحمت بھرا قانون بھی بتایا گیا کہ اگر کسی قوم میں برائی عام ہو جائے، وہ منکرات و معاصی کے سیلاب میں غرق ہوں، لیکن جب تک اسی قوم میں سے ایک کثیر تعداد ایسے نیک نصیب افراد کی بھی ہوں جو لوگوں کو مسلسل ان منکرات سے روک رہے ہوں، تو ایسی قوم کو اللہ تعالیٰ عذاب دیکر ہلاک نہیں فرماتے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ پچھلوں کا حال سنا کر اُمت محمدیہ کو اُبھارا گیا کہ ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہئیں۔ گزشتہ قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش وعشرت کے نشہ میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے بااثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی تھا اُنہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا، اس طرح کفر وعصیان اور ظلم وطغیان دنیا کہ جو حالت بگڑ رہی تھی اس کا سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے امر بالمعروف کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ

ہوگئی۔"[1]

مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی اگلی اُمتوں میں اگر ایسے لوگ کثرت سے ہوتے جو دوسروں کو فساد فی الارض سے یا قانون الٰہی کی نافرمانیوں سے روکتے ٹوکتے رہتے تو ان لوگوں پر عذاب ہی کیوں آتا، وہ تو صرف معدودے چند لوگ تھے جنہوں نے اپنا یہ فرض ادا کیا اور وہ عذاب کی گرفت سے محفوظ رکھے گئے ۔"الفساد فی الأرض"قرآن مجید کی اس جامع اصطلاح میں ہر قسم کی بے دینی اور بد دینی آجاتی ہے۔"[2]

جس معاشرے میں برائی سے روک تھام نہ ہو

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ:

"قال النبي ﷺ: " مثل المدهن في حدود الله، والواقع فيها، مثل قوم استهموا سفينة، فصار بعضهم في أسفلها وصار بعضهم في أعلاها، فكان الذي في أسفلها يمرون بالماء على الذين في أعلاها، فتأذوا به، فأخذ فأسا فجعل ينقر أسفل السفينة، فأتوه فقالوا: ما لك، قال: تأذيتم بي ولا بد لي من الماء، فإن أخذوا على يديه أنجوه ونجوا أنفسهم، وإن تركوه أهلكوه وأهلكوا أنفسهم۔ "

[1] تفسیر عثمانی، ج۲ص۱۷۳

[2] تفسیر ماجدی، ص۵۱۵، پاک کمپنی، اردو بازار لاہور

"حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا " خدا کی مقرر کردہ حدود میں غفلت و سستی کرنے والے اور ان حدود میں گر پڑنے والے یعنی گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو قرعہ ڈال کر کشتی میں بیٹھے ہوں، ان میں سے بعض لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں اور بعض لوگ اس کے اُوپر کے حصے میں پھر جو لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں وہ جب پانی لینے کے لئے اُوپر کے حصے میں آئیں تو اس حصے میں بیٹھے ہوئے لوگ اس شخص کے آنے جانے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرنے لگیں (جو پانی لانے کے لئے اُوپر جائے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے) لہٰذا نیچے کے حصہ والوں میں ایک شخص (اُوپر والوں کی تکلیف و ناگواری کو دیکھ کر) یہ کرے کہ کلہاڑا لے کر کشتی کی سطح کو توڑنا شروع کردے، اور پھر اُوپر کے لوگ اس کے پاس آئیں اور کہیں کہ یہ تمہیں کیا ہوا ہے (یعنی یہ تم کیسا بے تکا کام کر رہے ہو کہ کشتی کی سطح کو توڑ رہے ہو اور تمام کشتی والوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟) اس پر وہ شخص یہ جواب دے کہ جب میں اُوپر جاتا ہوں اور تم لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوں تو تم تکلیف و ناگواری محسوس کرتے ہو اور میں پانی حاصل کرنے پر مجبور ہوں (خواہ اس کے لئے مجھے کشتی کی سطح ہی کو کیوں نہ توڑ کر پانی کی جگہ نکالنی پڑے) ایسی حالت میں (دو ہی صورتیں سامنے ہو سکتی ہیں) یا تو لوگ اس شخص کے ہاتھ کو روکیں (یعنی اس کو کشتی کی سطح نہ توڑنے دیں) تاکہ اس کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی (غرقابی اور ہلاکت سے) بچائیں یا

اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں (یعنی کشتی کی سطح توڑنے سے اس کو نہ روکیں) اور پھر اس کو بھی ہلاکت میں ڈالیں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں"۔ [1]

اس روایت میں بڑی وضاحت سے معلوم ہوا کہ اجتماعیت کے بچاؤ کیلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا انتہائی ضروری ہے، انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو اسی طرح بچایا جاسکتا ہے کہ وہاں نیکی وبدی کی تمیز ہو، برائی سے روکنے اور نیکی کی طرف ترغیب دینے کے بغیر معاشرے کا تحفظ ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود و قیود کو پامال کرنا، شریعت کے متعین کردہ احکامات کی خلاف ورزی کرنا در حقیقت ایک عظیم جرم ہے جس کی اگر بر وقت روک تھام نہ ہو، ان عناصر کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو انجام کار پورے قوم و معاشرے کو گمراہی اور عذاب خداوندی کے سمندر میں ڈبو دیں گے۔

---

[1] الصحيح للإمام البخاري، كتاب الشهادات، باب القرعة فی المشكلات قبيل كتاب الصلح، رقم الحديث: 2686

باب سوم

- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط
- جواز کی شرائط
- وجوب کی شرائط
- معروف و منکر کے لحاظ سے امر و نہی کے واجب ہونے کی شرائط
- مخاطب کے اعتبار سے امر اور نہی کے واجب ہونے کی شرائط
- خود امر و نہی کی شرائط و مراتب
- داعی کے اخلاق و صفات

باب دوم کے اندر حضور ﷺ کے فرامین کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دنیوی اور اُخروی فوائد کا ذکر ہوا، یہ فوائد اور برکات تب ہی حاصل ہوں گے جب اس کام میں شریعت کی طرف سے مقررہ تمام اُصول وضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے، دین اسلام کا مزاج ہی اعتدال وتوازن کا ہے کسی بھی معاملہ میں افراط وتفریط اور غلو وتقصیر سے بچ نکل کر درمیان کا راستہ اختیار کرنا شریعت کا منشا ہے۔

اسی وجہ سے ہر معاملہ کے لئے کچھ شرائط مقرر کئے جاتے ہیں جس سے مثبت اور منفی تمام پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں اور معاملہ کے اندر اعتدال وتوازن بھی برقرار رہتا ہے، ان بنیادی شرائط کو بالائے طاق رکھ کر اگر معاملہ وجود میں لایا جائے تو وہ شارع کا منشا نہیں کہلائے گا نہ ہی اس پر وہ اثرات مرتب ہوں گے جو تمام شرائط کے ساتھ کام کرنے سے متعلق ہیں، اسلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بیش بہا فضائل کے بعداب ضروری ہے کہ اس کی شرائط بھی ذکر کئے جائیں۔

متعدد فقہاء کرام اور محدثین حضرات نے نصوص کو مد نظر رکھ کر مختلف شرائط ذکر فرمائے ہیں، چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع پر براہ راست علم فقہ میں یکجا کوئی زیادہ بحث نہیں کی گئی اسلئے مربوط اور منظم انداز میں یہ شرائط بھی بہت کم فقہاء کرام کے ہاں ملتے ہیں۔

ترتیب اور آسانی کیلئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل جب بھی خارج میں وجود پذیر ہو گا تو اس میں یہ چار چیزیں ضرور موجود ہوں گی:

۱۔ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے والا۔

۲۔ مخاطب: جس کو امر یا نہی کی جا رہی ہے۔

۳۔ وہ نیکی جس پر مخاطب عمل نہیں کر رہا جس کی وجہ سے داعی کو دعوت دینے کی ضرورت پیش آئی، یا وہ منکر اور برائی جس کا مخاطب ارتکاب کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے داعی اس کو نہی عن المنکر کر رہا ہے۔

۴۔ خود امر و نہی، جس انداز سے امر یا نہی کیا جا رہا ہو اس کی شرائط، مختلف صورتیں اور مراتب۔

ان شرائط میں سے بعض وہ ہیں جن کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا شرعاً جائز ہی نہیں ہوتا، اس قسم کی شرائط کو "شرائط جواز" کہا جاتا ہے، اور بعض شرائط وہ ہیں جن کے بغیر امر یا نہی کرنا جائز تو ہے مگر واجب نہیں، یعنی اگر امر اور نہی کرے گا تو گناہگار تو نہیں ہوگا تاہم ایسا کرنا اس کیلئے ضروری نہیں رہتا، اس قسم کی شرائط کو "شرائط وجوب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جواز کی شرائط

یہاں ان شرائط کو ذکر کیا جاتا ہے جن کے بغیر دعوت دینا جائز ہی نہیں، جن کو شرائط جواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جواز کیلئے تو بنیادی شرط ایک ہی ہے جس کی مکمل وضاحت ذیل میں مذکور ہے۔

ممکنہ مصالح ومفاسد کا جائزہ اور موازنہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے ضروری ہے کہ دعوت دینے سے پہلے مصالح و مفاسد کا موازنہ کیا جائے، دینی مصالح و منافع اور فوائد و مفاسد کا مقارنہ کیا جائے، اگر کہیں امر یا نہی کرنے کی صورت میں کسی دینی ضرر و نقصان کا خوف و خدشہ نہ ہو تو ذکر کردہ تفصیل کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب یا جائز رہے گا، لیکن اگر کسی صورت میں امر اور نہی کرنے کی صورت میں اس منکر سے زیادہ دینی ضرر یا فساد کا یقین ہو جس سے نہی کی جارہی ہے، تو اس صورت میں دین و دانش دونوں کا بالاتفاق تقاضا یہ ہے کہ ایسی صورت میں دعوت نہ دی جائے، بلکہ خاموشی اختیار کر کے قلبی نکیر پر اکتفاء کر لیا جائے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عقل و دین دونوں کا یہ مسلّمہ ضابطہ ہے کہ:

"الضرر لايزال بمثله" اور "إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما۔"

یعنی اگر کہیں دو مفاسد میں سے کوئی ایک اختیار کرنا ضروری پڑ جائے تو جس شق میں فساد کم ہو اسی کو اختیا کر لیا جائیگا، اس پر فقہاء کرام نے بہت سے مسائل متفرع فرمائے ہیں۔

نیز دین و مذہب سے ہٹ کر عقل سلیم کی بھی یہی صدا ہے، دنیادار اور دیندار کی تفریق و تمیز کے بغیر ہر عقل مند آدمی یہی کرتا ہے کہ اگر کہیں دو نقصانات کا سامنا کرنا پڑ جائے، جہاں کسی ایک کو برداشت کرنے سے لابدی ہو تو کم تر نقصان ہی کو گوارا کر لیا جاتا ہے اور اسی کو دانشمندی اور ہنر مندی کا زیور پہنایا جاتا ہے، ایسا کوئی نہیں

کرتا کہ چھوٹے نقصان سے بچنے کی خاطر بڑے نقصان کا ارتکاب کرے، نہ ہی ایسا کرنا کوئی کمال یا عقلمندی ہے کہ کسی نقصان سے بچاؤ کیلئے اس کے برابر نقصان کو اپنے سر لینے میں بلاوجہ وقت صرف کیا جائے۔

علامہ محمد خالد الاتاسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

المادة25:الضرر لايزال بمثله: إن الضرر مهما كان واجب الإزالة، فإزالته إما بلاضرر أصلا، أو بضرر أخف منه، وإما إزالته بضرر مثله أو أشد فلا يجوز، و هذا غير جائز عقلا أيضا، لأن السعي في إزالته بمثله عبث۔"[1]

"دفعہ رقم ۲۵: کسی ضرر کو اس جیسے ضرر کے ساتھ ختم نہیں کیا جائیگا، ضرر جہاں بھی ہو، اس کو ختم کرنا ضروری ہے، کبھی بغیر کسی دوسرے ضرر کا ارتکاب کئے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے، کبھی اس سے کم تر ضرر کے ساتھ، اور کبھی اس جیسے یا اس سے بھی زیادہ سخت ضرر کے ساتھ اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور یہ (تیسری) صورت عقلاً درست نہیں، کیونکہ اس جیسے ضرر کے ساتھ ختم کرنے میں کوشش کرنا فضول ہے۔"

لٰہذا جہاں کہیں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے کی صورت میں اس منکر سے زیادہ شدید منکر پیدا ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو، وہاں اس منکر پر نکیر کرنا شرعاً جائز نہیں، مثلاً نماز چھوڑنے والے یا دیگر منکرات کے مرتکب بادشاہ وقت کے خلاف

---

[1] شرح المجلة، المادة25:ج1ص63

مسلح خروج و بغاوت کے ذریعہ انکار کرنا۔

فقہاء کرام نے اس کو ناجائز لکھا ہے کیونکہ یہاں اگرچہ ایک منکر پر نکیر کیا جارہا ہے اور اس کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن انکار میں اس شرط کا لحاظ نہیں کیا گیا جو ابھی بیان ہوا کہ اس انکار کے نتیجہ میں اس سے بڑھ کر منکر بلکہ کئی منکرات کا مجموعہ جنم لے گا جو معاشرہ کیلئے وبال جان ثابت ہوگا جو بجائے خود ایک عظیم منکر ہے۔

لہٰذا ایک منکر کو ختم کرنے کیلئے کئی منکرات کو کیسے گوارا کیا جاسکتا ہے، جبکہ یہ مقدار اور کیفیت میں اس سے کہیں بڑھ کر ہوں جس پر نکیر کی جارہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نکیر وانکار کرنے کی صورت میں منکر ختم ہونے یا کم ہوجانے کی اُمید ہوتو انکار کرنا ضروری ہے اور اگر اس کی اُمید تو نہ ہو البتہ اس جیسے دوسرے منکر پیدا ہونے کا خدشہ ہوتو پھر حالات کو سامنے رکھ کر مصالح کا موازنہ کیا جائے اور پھر جس طرف مصالح کا پلہ بھاری ہو اس کو اختیار کرلیا جائے، اور اگر اس انکار کے نتیجے میں مزید کسی بڑے منکر کے پھوٹ جانے کا یقین یا ظن غالب ہو تو اس صورت میں نکیر کرنا شرعاً نادرست نہیں۔

علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الفروق" کے اندر اس پر ایک مستقل باب باندھا ہے کہ کن منکرات پر نکیر کرنا ضروری ہے اور کن معاصی سے روکنا ممنوع ہے؟

اس باب کے ضمن میں انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تین بنیادی شرائط ذکر فرمائے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جہاں کہیں کسی منکر پر نکیر

کرنے کی صورت اس سے بڑے منکر کے پیدا ہو جانے کا خدشہ ہو وہاں نکیر کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

للأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ثلاثة شروط:۔۔(الشرط الثاني) : أن يأمن من أن يكون يؤدي إنكاره إلى منكر أكبر منه مثل أن ينهى عن شرب الخمر فيؤدي نهيه عنه إلى قتل النفس أو نحوه۔۔فعدم أحد الشرطين الأولين يوجب التحريم ۔"

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کی تین شرائط ہیں:۔ دوسری شرط یہ ہے کہ امر و نہی کرنے والا اس بات سے مطمئن ہو کہ اسکا نکیر اس سے بڑے منکر کا سبب بنے مثلاً کوئی شراب پینے سے منع کرنا چاہتا ہو اور اس کا منع کرنا قتل جیسے منکر کا ذریعہ بنے، اگر یہ شرط موجود نہ ہو تو نکیر کرنا حرام ہے۔"[1]

فوائد و نقصانات کے جائزہ لینے کی عجیب مثال

علامہ ابن القیم (المتوفی ۷۵۱ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ علامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اس باب میں مصالح کے موازنے کی بڑی عجیب مثال لکھی ہے، چنانچہ آپ اپنی مشہور و مفید کتاب "إعلام الموقعين عن ربّ

---

[1] الفروق للقرافي،الفرق السبعون والمائتان بين قاعدة ما يجب النهي عنه من المفاسد، وما يحرم وما يندب،4 / 255،

العلمین" میں اپنے شیخ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

" مررت أنا وبعض أصحابي في زمن التتار بقوم منهم يشربون الخمر، فأنكر عليهم من كان معي، فأنكرت عليه، وقلت له: إنما حرم الله الخمر لأنها تصد عن ذكر الله وعن الصلاة، و هؤلاء يصدهم الخمر عن قتل النفوس وسبي الذرية وأخذ الأموال فدعهم۔"[1]

"میں نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ فتنہ تاتار کے زمانے میں میں اپنے کچھ ساتھیوں سمیت تاتاریوں کے ایک قوم پر گذرے جو کہ شراب پی رہے تھے، میرے ساتھیوں نے ان پر انکار کیا، میں نے انکار کرنے والوں کو ٹوکا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو اسلئے حرام قرار دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے، لیکن ان لوگوں کو شراب انسانیت کو قتل کرنے، بچوں کو قید کرنے اور دوسروں کے مال ناحق لینے سے منع کر رہی ہے، اسلئے ان کو اپنی حال پر چھوڑ دو۔"

٩٩٩

---

[1] إعلام الموقعين عن رب العلمين، تغيير الفتوى واختلافها، إنكار المنكر وشروطه 3 / 12-

وجوب کی شرائط

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کی صورت میں زیادہ مفاسد اور منکرات پیدا ہو جانے کا خدشہ نہ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر لینا چاہئے، البتہ چونکہ یہ کوئی اختیاری معاملہ نہیں بلکہ شرعی ذمہ داری ہے، اسلئے اب ان شرائط و تفصیلات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن کے ہوتے ہوئے یہ واجب ہو جاتا ہے اور اگر وہ اُمور موجود نہ ہوں تو وجوب بھی ساقط رہتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے کیلئے مجموعی طور پر پانچ شرائط بتائے جاتے ہیں جو یہاں بیان کئے جاتے ہیں، ان میں سے بعض شرائط کو جمہور اُمت نے غیر ضروری قرار دیا جس کی تفصیل یہاں بیان کی جاتی ہے۔ پانچوں شرائط بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کا مکلف ہونا۔

۲۔ دعوت دینے کی قدرت و استطاعت رکھنا۔

۳۔ مخاطب کی طرف سے یہ یقین نہ ہونا کہ وہ اس امر اور نہی کو قبول نہ کرے گا، اگر داعی کو اس بات کا یقین یا ظن غالب ہو کہ مخاطب میری دعوت قبول نہیں کرے گا اور میرے روکنے کے باوجود وہ منکر کا ارتکاب کر بیٹھے گا تو ایسی صورت میں دعوت دینا واجب نہیں۔

۴۔ داعی کا عادل ہونا۔

۵۔ حاکم یا حکومت کی طرف سے امر اور نہی کرنے کی اجازت حاصل ہونا۔

یہ کل پانچ مباحث ہیں، ذیل میں ہر ایک کی ضروری تفصیلات ذکر کردی جاتی ہیں۔

ا۔ تکلیف: داعی کا مکلف ہونا

تکلیف کا معنی یہ ہے کہ امر یا نہی عن المنکر کرنے والا مکلف ہو یعنی عاقل بالغ مسلمان ہو کیونکہ عقل اور بلوغ کے بغیر تو انسان شرعاً مکلف ہی نہیں، تمام احکامات اسلام عقل اور بلوغ کے بعد ہی لاگو ہو جاتے ہیں، اور اسلام کی شرط اسلئے ضروری ہے کہ امر اور نہی کرنا ایک گونہ تسلط و ولایت ہے، جو کہ مسلمان کے اُوپر غیر مسلم کو حاصل نہیں۔

۲۔ قدرت واستطاعت

امر یا نہی کے واجب ہونے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر قدرت ہو، اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس پر قادر ہی نہ ہو تو وجوب باقی نہیں رہے گا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کے جتنے بھی احکام بندوں پر عائد ہوتے ہیں، اس میں ان کی استطاعت کا لحاظ رکھا جاتا ہے، شریعت نے بندے کو انہی احکامات کا مکلف بنایا ہے جس پر اس کو قدرت واستطاعت بھی حاصل ہو، جس چیز کی اس میں قدرت ہی نہیں شریعت نے اس کا مکلف بھی نہیں بنایا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی چونکہ ایک دینی فریضہ ہے، اسلئے بندہ تب ہی اس کے ادا کرنے کا ذمہ دار ہے، جب وہ اس کے کرنے پر قادر ہو، یہی وجہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں جہاں نہی عن المنکر نہ کرنے پر کوئی وعید سنائی گئی تو بعض روایات میں اس کے ساتھ " قدرت" کی قید بھی لگائی گئی (جس کی تفصیل باب دوم میں گزر چکی)، یعنی قدرت رکھنے کے باوجود جو لوگ بلاوجہ کسی معتبر عذر کے منکرات کو دیکھ

کر خاموشی اختیار کرتے ہیں، اس کے حق میں یہ وعید ہے۔

قدرت سے صرف حسی قدرت رکھنا مراد نہیں کیونکہ ایسی قدرت تو تقریباً ہر انسان کو حاصل ہوتی ہے جب تک کہ وہ مفلوج اور گونگا نہ ہو جائے، بلکہ فقہاءِ کرام نے قدرت نہ ہونے کی مندرجہ ذیل تین صورتیں لکھی ہے، ان تینوں میں سے کوئی بھی صورت داعی کے سامنے پیش آجائے تو اس کو عاجز تصور کیا جائے گا اور اس کے بعد اس پر دعوت دینا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا شرعاً ضروری نہیں رہے گا۔

الف۔ داعی کا حساً عاجز آجانا

یعنی کوئی حساً ہی امر بالمعروف یا نہی عن المنکر نہ کر سکے مثلاً جو آدمی کسی حرام کا مرتکب ہو، اس تک کی رسائی ہی نہ ہو سکے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ وجوب ساقط ہو جائیگا۔

ب۔ حکماً عاجز آجانا

یعنی کسی شخص کی یہ حالت ہو کہ اس کیلئے بظاہر دعوت دینے سے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو، مثلاً اعضاء بھی صحیح سالم ہیں مخاطب بھی موجود ہے لیکن اس کو یہ خدشہ ہے کہ اگر میں ایسا کروں گا تو مخاطب کی طرف سے مجھے کوئی نا قابل برداشت تکلیف پہنچے گی، اس قسم کی صورت حال کو "عجز حکمی" سے تعبیر کیا جاتا ہے ایسی صورت میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب باقی نہیں رہے گا۔

کس تکلیف کے خوف سے امر اور نہی چھوڑنا جائز ہو جاتا ہے؟

البتہ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ : تکلیف سے مراد یہ ہے کہ اپنے

چاہت اور پسند کے خلاف اُمور کا سامنا کرنا پڑے، یعنی جو چیز انسان کو عام طور پر مطلوب و مقصود ہوتی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے اس کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول عام طور پر انسان کو چار چیزیں مطلوب ہوتی ہیں:

(۱)۔ علم۔

(۲)۔ جسم کی صحت اور تندرستی۔

(۳)۔ مال و دولت۔

(۴)۔ جاہ و جلال۔

پھر ان چاروں اشیاء کی دو دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ انسان ان چاروں اشیاء کو حاصل کر چکا ہو اور اب امر یا نہی کرنے کی صورت میں ڈر ہو کہ یہ حاصل شدہ نعمتیں فوت ہو جائیں گی، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ابھی تک ان اُمور کو حاصل تو نہیں کیا تاہم آئندہ حاصل ہونے کی امید ہے اور امر یا نہی کرنے کی صورت میں خدشہ ہے کہ یہ اُمور حاصل نہ ہو سکیں گے۔

جن جن صورتوں میں یہ اُمور حاصل نہیں ہوئے، مستقبل میں حصول کی صرف اُمید ہو، مثلاً ایک شخص کسی استاد سے علم سیکھ رہا ہے، اس کا استاد یا اس کا کوئی قریبی عزیز کسی منکر میں مبتلا ہے اور اس متعلم کو یہ خدشہ ہے کہ اگر میں اس پر نکیر کروں گا تو اُستاد مجھے مزید علم نہیں سکھائے گا، یا کوئی شخص فقیر و محتاج ہو اور اس کا کوئی کرم فرما ہو جو اس کے ضروریات کو پورا کرتا ہو، یہ کرم فرما یا اس کا کوئی متعلق کسی منکر کا مرتکب

ہو، اور اس پر نکیر کرنے کی صورت میں اس محتاج آدمی کو خوف ہو کہ کہیں کفالت کا یہ ظاہری راستہ ہی بند نہ ہو، اسی طرح کسی ڈاکٹر و طبیب یا اس کے قریبی رشتہ دار پر نکیر کرنے کی صورت میں مریض کو متوقع صحت حاصل نہ ہو جانے کا ڈر ہو، یا امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے کی صورت میں مستقبل میں اپنے جاہ و جلال ختم ہونے یا کم ہو جانے کا خوف ہو۔

توان تمام صورتوں میں ان اُمور کے فوت ہو جانے کے خدشہ سے عام حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب ساقط نہیں ہو گا، کیونکہ یہاں درحقیقت دو مطالبے جمع ہو رہے ہیں، ایک مطالبہ اس گناہ پر نکیر کرنے کا ہے جس کا ارتکاب کیا جارہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ نقد اور فی الحال موجود ہے اور دوسری طرف آئندہ حاصل ہونے والے موہوم مصالح ہیں اور ظاہر ہے کہ متیقن وجوب کو متوقع خدشہ کی بناء پر ساقط نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا عام حالات میں ان خدشات و احتمالات کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدستور واجب رہے گا۔

تاہم ان جیسے حالات میں دیانتدارانہ غور و فکر اور انتہائی تدبر و اجتہاد سے کام لینے اور نفع و نقصان کے درمیان موازنہ کی ضرورت ہے کہ امر بالمعروف کرنے میں مصلحت زیادہ ہے یا چھوڑنے کی صورت میں؟ ان خدشات کو مد نظر رکھتے ہوئے امر اور نہی ترک کرنے میں فائدہ زیادہ ہے یا سرے سے ان احتمالات کو پس پشت ڈالنے میں؟

ان اُمور کا دیانتدارانہ جائزہ لینے کے بعد اگر دعوت دینے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں زیادہ فائدہ محسوس یا معلوم ہو جائے تو اس صورت میں یہ فریضہ بدستور مکلف کے ذمہ باقی رہے گا، اس کا وجوب ساقط نہیں ہو گا، اور اگر اس تجزیہ

کے بعد زبان سے خاموش رہنے میں مصلحت زیادہ معلوم ہو تو اس صورت میں زبان سے خاموش رہنا بھی کافی ہے، تاہم دل سے اس منکر کو برا جاننا اور قبیح خیال کرنا بہر حال ضروری ہے، جیساکہ آئندہ مستقل عنوانات کے تحت اس کی پوری کیفیت تفصیل سے ذکر کردی جائیگی۔

مثلاً کوئی شخص بالکل لاعلم ہے، ضروریات کی حد تک دین سے ناواقف ہے اور اس کے پاس علم حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ "اُستاد" ہے وہاں حصولِ علم کے اور ذرائع اور دیگر اساتذہ موجود نہ ہوں، ایسی صورت حال میں اس نے اپنے اُستاد یا اس کے رشتہ دار، قریب وعزیز کو کسی منکر میں مصروف عمل پایا، اور اس کو قوی ڈر ہے کہ تنبیہ کرنے کی صورت میں اُستاد ناراض ہو جائے گا اور دین سیکھنے کا یہ واحد ذریعہ بھی ختم ہو جائیگا، تو یہاں نکیر کرنے کی صورت میں اگرچہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ ایک منکر ختم ہو جائیگا، اگر بالفرض اس کی دعوت کار گر نہ بھی ہو اور وہ منکر بدستور ہوتا رہے تو بھی یہ ایک واجب سے سبکدوش ہو جائے گا، لیکن دوسری طرف ضروریات دین کی حد تک سے ناواقف رہنا اور ضروری مسائل سے لاعلم رہنا خود ایک بڑا دینی نقصان ہے جو کہ بے شمار مفاسد کی جڑ ہے۔

اسلئے ایسی صورت حال میں اگر زبان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کردی جائے اور صرف قلبی نکیر پر عمل کیا جائے تو بھی گنجائش ہے۔

بعض حضرات اس کو "مداہنت" کے حدود میں داخل کرکے ناجائز سمجھتے ہیں، لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ دینی مصلحت سے زبانی امر بالمعروف یا نہی عن المنکر نہ کرنا مداہنت نہیں، بلکہ مدارات ہے۔ اگر توفیقِ الٰہی شامل

حال رہی، توانشاءاللہ آئندہ ایک مستقل عنوان کے تحت مداہنت اور مدارات کی تفصیل ذکر کردی جائیگی۔

یقینی مصلحت کے فوت ہوجانے کی ڈر سے دعوت نہ دینا

یہ ساری تفصیل تواس وقت ہے جب کہ یہ چاروں اُمور حاصل نہ ہوں، بلکہ مستقبل میں حاصل ہونے کی صرف امید ہو، لیکن اگر یہ اُمور حاصل ہوچکے ہوں اور پھر ایسی صورت پیش آجائے کہ انکار منکر کی صورت میں ان اُمور کے ضائع اور ختم ہوجانے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کیا اس صورت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدستور واجب رہے گا یا وجوب ساقط ہوجائیگی؟ کیا مکلف پر یہ ضروری ہے کہ ان اُمور کی قربانی دیکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے؟ یا خاموش رہنے کی بھی گنجائش ہے؟

تواس میں یہ تفصیل ہے کہ مال ودولت اور بدن کی صحت اور تندرستی کے ضائع ہونے کا اگر غالب گمان یا یقین ہو توامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب ساقط ہوجائیگا، مثلاً اگر کسی مالدار یا صحت مند آدمی نے کسی کو منکر کرتے ہوئے پایا اور اس پر نکیر کرنے کی صورت میں یہ یقین ہو کہ وہ اس کا مال چھین لے گا یا اس کو ضائع کرے گا یا اس کو اتنا زدوکوب کرے گا جس سے اس کی صحت اور تندرستی متاثر ہوجائیگی، تو ان دونوں صورتوں میں شخص مذکور سے یہ ذمہ داری ساقط ہوجائیگی، اور اب اس پر زبانی امر یا نہی کرنا ضروری نہ رہے گا۔

تاہم واضح رہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کہ مال یا صحت ضائع ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو، جیسا کہ کتاب میں بار بار اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا، لہٰذا اگر غالب گمان کی حد تک یہ خطرہ نہ ہو تو محض فرضی خدشات اور احتمالی داستان سے وجوب

ساقط نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہ فریضہ عائد رہے گا۔

بہت سے لوگ محض دور دراز تاویلات اور بے ربط احتمالات کی وجہ سے امر بالمعروف کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اور اپنے آپ کو معذور خیال کرتے ہیں، یہ بالکل درست نہیں، شرعاً اُن اُمور کا دار مدار یقین یا ظنِ غالب پر ہے، ان اُمور میں دیانتدارانہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ حکم تو مال و دولت اور بدن کے صحت و سلامتی کا تھا۔ علم چونکہ ایک معنوی چیز ہے جس کو چھین لینا یا بالکل ضائع کرنا انسانی اختیار میں نہیں، اسلئے حاصل شدہ علم کے ختم کرنے کے خوف سے امر اور نہی کا عائد فریضہ ساقط نہیں ہوگا چنانچہ علم کے بہت سے فضائل و خصائل اور امتیازات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح آخرت میں باقی رہے گا، فوت اور زائل نہیں ہوگا، اسی طرح دنیا میں بھی خود علم دینے والے کے علاوہ اور کوئی ہستی اس کو ختم یا ضائع نہیں کر سکتی۔

لفظ "جاہ" کی تحقیق

جہاں تک جاہ و جلال اور عزت و دبدبہ ختم ہونے کی ڈر سے امر یا نہی ترک کرنے کا مسئلہ ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ لفظِ "جاہ" دراصل "وجہ" سے مقلوب ہے، وجہ اس چیز کو کہا جاتا ہے، جس کے ساتھ کسی چیز کا سامنا کیا جاتا ہے چنانچہ چہرہ کو عربی زبان میں اسی لئے "وجہ" کہتے ہے کہ اس سے انسان آگے والے چیز کا سامنا کرتا ہے، لغت کے مشہور عالم علامہ ابوالحسن مرسی رحمۃاللہ علیہ (المتوفی ۴۵۸ھ) نے ذکر

کیاہے کہ "وجہ" کو مقلوب کرکے "جاہ" بنادیا، اس کا معنی ہے، مقام، مرتبہ۔ [1]

"جاہ" کا استعمال عام طور پر عزت ودبدبہ اور مقام ومرتبہ کیلئے ہوتاہے، اور ہر شخص کے ذاتی احوال وکوائف اور مختلف سوچ وفکر وغیرہ وجوہات کی بناء پر اس کامقام ومرتبہ بھی مختلف ہوتا رہتاہے،اسی لئے "جاہ" کی کوئی جامع ومانع قانون تعریف وتحدید ممکن نہیں،اوراس کیلئے کوئی معیار مقرر نہیں کیاجاسکتا۔

عزت اور دبدبہ کم ہونے کی خوف سے دعوت نہ دینے کا حکم

اگر مطلق "جاہ" کے کم ہونے کی وجہ سے امر اور نہی جیسے اہم فریضے کاوجوب ساقط کرلیا جائے تو خطرہ ہے کہ یہ فریضہ بالکل متروک ہی نہ ہوجائے، کیونکہ جب کسی منکر پر نکیر کی جائے اور مرتکب کے مرضی کے خلاف مؤقف اپنایا جائے توکم ازکم اس کے دل میں تواس کا "جاہ" متاثر ہوگا مخاطب کے دل وجگر میں اس کی پہلے کی طرح مقام ومرتبہ کہاں باقی رہ سکتاہے؟

اس کااعتماد واعتقاد یقیناً مجروح ہوگا، جس کی وجہ سے وہ قدر نہیں رہے گی جوپہلے تھی، یہ انسانی طبیعت اور فطری جبلت ہے۔

یقیناً بعض اوقات اس طرح کرنے سے کرنے والے کی پیار ومحبت مزید بڑھ جاتی ہے اور مخاطب اگر عقل منداوراپنا حقیقی خیر خواہ ہوتو پہلے کے مقابلے میں داعی کی زیادہ عزت و توقیر کرنے لگتاہے، لیکن پہلے توایسے نیک صفت انسان

---

[1] المخصص ،الجاه مقلوب، ج٣/ 397، دارإحياء التراث العربی، بیروت۔

ہوتے ہی کم ہیں، اور اگر بالفرض ملے بھی تو بعض اوقات ایسی صورت میں بھی امر اور نہی کی ضرورت پیش آتی ہے جب کوئی شخص جاننے کے باوجود کسی منکر پر اصرار و مداومت کرتا ہے ایسی صورت میں امر اور نہی کرنے والے کا مرتبہ یقیناً کم ہوگا، اسلئے مطلقاً "جاہ" کم ہونے کے خطرہ سے وجوب کا ساقط ہونا عملاً اس کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔

جاہ و جلال ختم ہونے کی ڈر سے دعوت نہ دینا

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات "جاہ" متاثر ہونے کی صورت میں اس منکر سے زیادہ مسائل و مشکلات جنم لیتے ہیں، جس پر نکیر کرنے کیلئے اس کو گوارا کیا جاتا ہے، اسلئے دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرین انصاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن صورتوں میں امر یا نہی کرنے کی صورت میں "جاہ" اس قدر متاثر ہو کہ خلافِ مروت اُمور و احوال کا سامنا کرنا پڑے جس کی برداشت نہ ہو، تو اس صورت میں وجوب باقی نہ رہے گا، اور اگر اس قدر کمی نہ آتی ہو، بلکہ صرف حد سے زیادہ رعب و دبدبہ ختم ہو رہا ہو تو یہ کوئی ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے ایک عائد فریضہ کو ساقط کر دیا جائے، نہ ہی یہ ایسا مطلوب و مقصود ہے جس کی وجہ سے پورے نظام میں خلل برداشت کیا جاسکے۔

مثلاً اگر کسی کو یقین یا ظن غالب ہو کہ منکر پر انکار کرنے کی صورت میں مخاطب لوگ مجرم کی طرح اس کا چہرہ سیاہ کر کے گدھے پر بٹھا کر شہر میں گھمائیں گے یا اس کیساتھ اور کوئی ایسا رویہ رکھیں گے جو بالکل خلافِ مروت ہوگا، تو ایسی صورت میں اس کے ذمہ امر یا نہی کا وجوب باقی نہ رہے گا، کیونکہ وجوب کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ

داعی کو مخاطب کی طرف سے توقع ہو کہ وہ اس پر عمل کرے گا جبکہ یہاں قبولیت کی امید نہیں، نیز یہ اذلالِ نفس ہے جو شرعاً پسندیدہ نہیں۔

سننِ ترمذی کی ایک مرفوع روایت ہے:

"عن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ: «لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه» قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق۔"

"حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "مسلمان کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کردے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کیسے اپنے نفس کو ذلیل کردیگا؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایسی مشقتوں کی طرف تعرض کرے جس کی اس میں طاقت نہ ہو۔"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اس رویہ کو برداشت نہ کرسکتا ہو تو اس کیلئے ایسے اوقات میں امر یا نہی نہیں کرنی چاہئے۔

وجوب ساقط ہونے کے بعد عزیمت کی راہ

سابقہ تفصیل کے مطابق جن جن صورتوں میں مسلمان کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب باقی نہیں رہتا، بلکہ معروضی حالات کی وجہ سے وجوب ساقط ہوجاتا ہے، ان حالات میں یہ تو واضح ہے کہ اگر وہ دعوت نہیں دے گا تو گناہگار نہیں ہوگا، کیونکہ شریعت نے ان صورتوں میں مسلمان کو یہ ذمہ داری

[1] سنن الترمذي،أبواب الفتن،رقم الحديث2254،ج4 ص 523۔

نہیں سونپی، لیکن بہتر کیا ہے؟ ایسی صورت میں دعوت دینا افضل ہے یا خاموشی اختیار کر لینا؟ عزیمت کی راہ کونسی ہے؟

فقہاءِ کرام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

اگر داعی کو معلوم ہے کہ:

۱۔ دعوت دینے کی نتیجہ میں مخاطب مزید منکرات کا ارتکاب کرے گا۔

۲۔ یا مخاطب اس کو کوئی ایسی تکلیف و مصیبت پہنچائے گا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے نتیجہ میں انتقامی کاروائی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو اس سے زیادہ منکرات پر مشتمل ہو گا۔

ان دونوں صورتوں میں داعی کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ دعوت نہ دے، بلکہ دل میں برا جاننے پر اکتفاء کر کے خاموشی اختیار کرے، کیونکہ ایسی حالات میں دعوت دینا شرعاً کوئی ضروری تو ہے نہیں، بلکہ ایک جائز کام ہے ۔اور ایک جائز عمل کے نتیجہ میں جب اور منکرات پیدا ہو رہے ہیں تو اس کو چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

اور اگر داعی کو یقین ہو کہ دعوت کے نتیجہ میں جو تکلیف و مشقت اس کو پہنچے گی اس کو وہ بخوبی سہہ لے گا، اس کے نتیجہ میں مخاطب کی طرف سے شکوہ و شکایت، غیبت و برائی اور ناجائز انتقامی جذبات پیدا ہو جانے کا ڈر نہ ہو، تو ایسی صورت میں داعی کوئی بھی پہلو اختیار کرنے کا مجاز ہے، البتہ اگر مخاطب کی طرف سے زیادہ مار پٹائی اور گالم گلوچ کا ڈر نہ ہو اور اس کے مقابلے میں جس منکر کا ارتکاب کیا جا رہا ہو وہ بھی اس سے زیادہ قابل نکیر ہو تو ایسی صورت میں داعی کیلئے بہتر یہ ہے کہ دعوت دیدے، یہی عزیمت کی راہ ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ حکم ہر داعی کیلئے نہیں کہ وہ ان جیسے مواقع میں دعوت

دیدے بلکہ جو لوگ صاحبِ عزیمت ہوں، جن کی راہ میں ایسی مشقتیں حائل نہ ہوں، راہ حق میں پیش آنے والے ان جیسے مصائب ومشکلات سے پیچھے ہونے کی بجائے آگے ہو جانے، عزیمت ختم ہو جانے کی بجائے حوصلہ افزا ہو جانے اور اعمال میں سست پڑ جانے کی بجائے مزید ترقی کرنے کا ذریعہ ہو، اگر وہ ان اُمور کو بالائے طاق رکھ کر یہ کارنامہ سر انجام دیدے تو یہ ان کا کمال، ایک گونا جہاد اور واقعہ طائف تازہ کرنے کی بہترین یاد ہے۔

فقہ حنفی کے مشہور فقیہ علامہ ابن مازہ البخاری (التوفی ٦١٦ھ) رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب بستان العارفین میں لکھاہے کہ امر بالمعروف کی کئی صورتیں ہیں: اگر کسی کو غالب گمان ہو کہ اگر وہ نیکی کا حکم کرے گا تو لوگ اس کی بات مانیں گے اور اس گناہ سے باز آئیں گے تو اس پر امر بالمعروف واجب ہے جس کے چھوڑنے کی گنجائش نہیں۔ اور اگر غالب گمان ہو کہ دعوت دینے کی صورت میں وہ اس پر تہمتیں لگائیں گے اور گالی گلوچ کریں گے تو اس صورت میں دعوت چھوڑنا ہی بہتر ہے اسی طرح اگر معلوم ہو کہ مخاطب لوگ مارپٹائی کریں گے اور وہ اس پر صبر نہیں کر سکے گا بلکہ دشمنی پیدا ہو جائے گی جس میں قتل تک نوبت پہنچتی ہے تو اس صورت میں بھی دعوت نہ دینا ہی بہتر ہے۔

اور اگر داعی کو یقین ہے کہ اگر مخاطب نے مارپٹائی کی تو وہ اس پر صبر کرے گا اور کسی سے اس کی شکایت نہیں کرے گا تب اس صورت میں (دعوت دینے میں) کوئی قباحت نہیں اور اگر دعوت دے گا تو مجاہد ہو گا۔ اور اگر اس کو یقین ہے کہ لوگ میری بات قبول نہیں کریں گے لیکن اس یقین کے ساتھ ان کی طرف سے ضرب وشتم کا بھی ڈر نہ ہو تو اس کو اختیار ہے لیکن

دعوت دینا بہتر ہے۔"[1]

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وإن كان بحال لو نهاهم شتموه أو ضربوه ولا يصبر على ما يصيبه فالأفضل أن يترك فإن كان يعلم أنه يقدر أن يصبر على ما أصابه فإن تحمل به فإنه يشبه بالأنبياء عليهم السلام. "[2]

"اگر دعوت دینے کی صورت میں مخاطب کی طرف سے گالم گلوچ یا مار پیٹ کا خدشہ ہو اور داعی اس پر صبر نہ کر سکتا ہو تو بہتر یہ ہے کہ دعوت نہ دے اور اگر داعی کو اطمینان ہے کہ وہ ان چیزوں پر صبر کرے گا (تو پھر دعوت چھوڑ دینے کی ضرورت نہیں ہے) ایسا شخص حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے مشابہ ہے۔)"

فتاویٰ ہندیہ میں تاتارخانیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ان جیسے حالات میں عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں اگر کسی کی جان چلی جائے تو وہ شہید کہلائے گا:

"إذا استقبله الآمر بالمعروف وخشي أن لو أقدم عليه قتل فإن أقدم عليه وقتل يكون شهيدا كذا في التتارخانية.
"

---

[1] المحيط البرهاني، كتاب الكراهية والاستحسان، الفصل الثامن عشرفي الغناء واللهو، ج8ص80، إدارة القران والعلوم الإسلامية، كراتشي

[2] عيون المسائل ،باب الاستحسان،ص: 478.

"اگر امر بالمعروف کرنے والے کو ڈر ہو کہ امر کرنے کی صورت میں اس کو قتل کیا جائے گا تو بھی اگر اس پر اقدام کرے اور قتل ہو جائے تو شہید ہو گا۔"[1]

دعوتِ دین کا ایک ایمان افروز داستان

ان جیسے خدا ترس اور درد دل رکھنے والے اولوالعزم شخصیات میں سے ایک نام نامی " حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید صاحب " (المتوفی۱۲۴۶ھ) رحمۃاللہ علیہ کا بھی ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃاللہ علیہ (المتوفی ۱۴۰۲ھ) اپنی "آپ بیتی" میں آپ کا ایک واقعہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت مولانا عشاء کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے اس دروازے سے باہر تشریف لے گئے جو قلعہ کی طرف ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃاللہ علیہ نے اُٹھ کر لپک کر ان کو پکڑا کہ کہاں جاتے ہو؟ میں اس وقت تم کو تنہا نہ جانے دوں گا، اگر تم کہیں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا، مولانا نے فرمایا: میں ایک خاص ضرورت سے جا رہا ہوں تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ، میں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے اور تنہا چلدیئے۔

میں ذرا فاصلہ سے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا، خانم کے بازار میں ایک بڑی مالدار اور مشہور رنڈی کا مکان تھا اس کا نام "موتی" تھا، مولانا اس مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر میں مکان سے ایک لڑکی نکلی، اور پوچھا کہ تم

[1] الفتاوى الهندية ، كتاب الكراهية ، الباب السابع عشر في الغناءواللهو،ج 5ص 353

کون ہو؟ اور کیا کام ہے؟ اُنہوں نے کہا میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دئے اور کہا کہ جا کر دیدے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی، مولانا نے کہا میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جا کر کہدیا۔

رنڈی نے کہا کہ بلالے وہ بلا کر لے گئی، مولانا جا کر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور سورۃ والتین، ثم رددنٰه أسفل سافلین تک تلاوت فرمائی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا، مولانا نے اس قدر مؤثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا، اس رنڈی کے یہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں، ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا، اُنہوں نے ڈونک ستار وغیرہ توڑنے شروع کئے اور موتی اور اسکے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہو گئیں۔

اس کے بعد مولانا اُٹھ کر چلدئے، میں بھی پیچھے پیچھے چلدیا، جب مولانا جامع مسجد کے سیڑھی پر پہنچے تو میں نے مولانا سے کہا کہ میاں اسماعیل: تمہارے دادا ایسے تھے، تمہارے چچا ایسے تھے، اور تم ایسے خاندان کے ہو جس کی سلامی بادشاہ رہے ہیں، مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کر لیا اتنی ذلت ٹھیک نہیں۔

اس پر مولانا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حیرت سے میری طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے، مجھ سے فرمایا، مولانا: آپ نے یہ کیا فرمایا؟ آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں، یہ تو کچھ بھی نہیں، میں تو اس روز سمجھوں گا کہ آج میری عزت ہوئی ہے جس روز دلی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے اور میں کہتا ہوں گا۔ قال الله

كذا وقال رسول الله ﷺ كذا۔

یہ سن کر میری یہ حالت ہوئی کہ میں کہنے کو تو کہہ گیا مگر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور زبان بند ہو گئی، اس کے بعد کبھی مجھے ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نصیب نہ ہوئی۔[1]

بحث کا نچوڑ

خلاصہ یہ ہے کہ نفسِ "جاہ وجلال" کے ختم ہونے کے اندیشے سے امر بالمعروف یا نہی عن المنکر ترک کر دینا بالکل درست نہیں، تاہم اگر خلاف مروت حد تک مصائب ومشکلات پیش آجانے کا یقین یا ظن غالب ہو تو ایسی صورت حال میں وجوب ساقط ہو جائیگا، تاہم ایسی صورت میں بھی اگر کوئی صبر واستقامت کے خصلت سے باوصف ہو کر کسی معصیت پر نکیر کرے تو اس کیلئے بالکل گنجائش ہے۔

ج۔ مسئلہ کا علم نہ ہونا

بعض حضرات نے قدرت نہ ہونے کے ضمن میں "عجزِ علمی" کو بھی داخل فرمایا ہے، یعنی جس بات کا علم نہ ہو اس کا امر اور نہی کرنا ممنوع ہے، اسلئے اگر کوئی شخص ناواقف ہے تو اس کیلئے صرف ان ہی اُمور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے جو معروف ومشہور ہوں اور اس کے علم میں ہوں، جن باتوں سے ناواقف ہو اس کو از خود سرانجام دینے کے بجائے علماء کے حوالہ کر دے، کیونکہ علم نہ ہونے کے باوجود امر یا نہی کرنے کی صورت میں فائدہ کے بجائے نقصان کا زیادہ خدشہ ہے جیسا کہ تجربہ سے بارہا اس کی تائید ہو چکی ہے۔

---

[1] آپ بیتی، حصہ چہارم، صفحہ نمبر ۲۴۳، معہد الخلیل الاسلامی، کراچی

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ علم سے اصطلاحی باضابطہ علم مراد نہیں، بلکہ مسئلہ سے پورے طور پر واقف ہونا مقصود ہے لہٰذا جس شخص کو مکمل طور پر مسئلہ معلوم ہو اس کیلئے امر یا نہی کرنا شرائط کو دیکھتے ہوئے واجب یا جائز ہے چاہے وہ باضابطہ عالم اور کسی جامعہ کا فاضل نہ ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

"ثم إنه إنما يأمر وينهى من كان عالما بما يأمر به وينهى عنه وذلك يختلف باختلاف الشيء فإن كان من الواجبات الظاهرة والمحرمات المشهورة كالصلاة والصيام والزنا والخمر ونحوها فكل المسلمين علماء بها وإن كان من دقائق الأفعال والأقوال ومما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه ولا لهم إنكاره بل ذلك للعلماء۔"

"نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اسی شخص کا کام ہے جس کو اس نیکی اور برائی کا علم ہو، (لہٰذا) اگر وہ عام اور مشہور مسئلہ ہو مثلاً نماز و روزے کا فرض ہونا، شراب حرام ہونا وغیرہ، تو (چونکہ) تمام مسلمانوں کو اس کا علم ہے (اس لئے سب کی امر و نہی کرنا سب پر ضروری ہے) اور اگر قول و فعل یا اجتہاد کے متعلق کوئی باریک مسئلہ ہو جس کا عوام کو درک نہیں تو اس کا اختیار علماء کو حاصل ہے عوام اس کے مجاز نہیں۔"[1]

---

[1] شرح النووي على مسلم ، كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن

۳۔ تیسری شرط: مخاطب کی اصلاح کی اُمید

امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کے واجب ہونے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ کرنے والے کو اُمید ہو کہ اس امر یا نہی کے نتیجہ میں اصلاح ہو جائے گی، اگر بالکل یقینی طور پر معلوم ہو یا غالب گمان یہ ہو کہ مخاطب کے حق یہ امر یا نہی سود مند نہیں، مخاطب بہر حال اس منکر کا ارتکاب کرے گا اور امر یا نہی اس کیلئے کار گر نہیں، تو ایسی صورت میں بھی وجوب باقی نہ رہے گا۔

علامہ سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لو كان بحال أو نهاهم علم أنهم لا يمتنعون عن ذلك فهو في سعة من تركه، ولو نهاهم كان أفضل وينال الثواب. "[1]

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا قرآن وحدیث میں جو حکم دیا گیا وہ کوئی امر تعبدی یا سمجھ سے بالاتر حکم نہیں، جس کی علت نا قابل فہم ہو، بلکہ جیسا کہ بعض قرآنی آیات اور بہت سے احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے اس کی اصل علت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر حتی الامکان خالق کی کوئی نافرمانی نہ سر انجام دی جائے، چنانچہ آیت قتال سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

سورۃ انفال میں ارشاد ہے:

" وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ

المنكر من الإيمان، رقم الحديث:49

[1] عيون المسائل،ص: 478-

كُلُّهُ لِلّٰهِ۔ [الأنفال : 39] "

"اور تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔" (ترجمہ از بیان القرآن، ۲/۹۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اس حکم کی علت یہی ہے کہ حتی الامکان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ختم ہو یا کم از کم امکانی حد تک کم ہو، اور جب یقین ہو کہ امر کرنے یا نہی کا فریضہ سرانجام دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وجوب بھی برقرار نہیں رہے گا۔

جمہور فقہاء کا یہی مؤقف ہے کہ اگر داعی کو مخاطب کی طرف سے یہ یقین یا ظن غالب ہو کہ وہ میری بات نہیں مانے گا، بلکہ بدستور اپنی گناہ پر ڈھٹا رہے گا تو ایسی صورت میں اس کو نیکی کا حکم دینا یا برائی سے منع کرنا کوئی ضروری نہیں۔

فقہاءِ شافعیہ کا مؤقف

حضرات شوافع میں سے بعض فقہاء کرام کے نزدیک ایسی صورت حال میں بھی امر و نہی کرنا ضروری ہے، "فذكر إنما أنت مذكر" اور "فذكر فما أنت بملوم" وغیرہ جیسے نصوص کو مدنظر رکھ کر ان حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ داعی کا کام احکام پہنچانا، نیک کام کا حکم دینا، اور ناجائز اُمور سے منع کرنا ہے، قبول کرنا یا نہ کرنا مخاطب کا کام ہے اس سے دعوت دینے والے کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے، شوافع میں سے امام نووی اور حنابلہ میں سے علامہ ابن مفلح مقدسی تصحیح و تنقیح یہی ذکر فرمایا ہے۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام کا قابل قدر فیصلہ

لیکن دلائل و براہین پر غور کرنے سے جمہور کے مؤقف کی تائید ہوتی ہے، نیز حضرات صحابہ کرام اور سلف صالحین کے طرز عمل سے اسی کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام (المتوفی ٦٦٠ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بہترین کتاب "القواعد الکبریٰ" میں اس پر اپنے خاص انداز میں روشنی ڈالی، اور شافعی ہونے کے باوجود جمہور کے قول کے ایسے دلائل و مصالح ذکر فرمائے جس سے اس کی صحت و توثیق مزید مؤکد ہو جاتی ہے۔

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"فإن علم الآمر بالمعروف والناهي عن المنكر أن أمره ونهيه لا يجديان ولا يفيدان شيئا، أو غلب على ظنه، سقط الوجوب لأنه وسيلة ويبقى الاستحباب، والوسائل تسقط بسقوط المقاصد، وقد كان - ﷺ - يدخل إلى المسجد الحرام وفيه الأنصاب والأوثان ولم يكن ينكر ذلك كلما رآه. وكذلك لم يكن كلما رأى المشركين ينكر عليهم، وكذلك كان السلف لا ينكرون على الفسقة والظلمة فسوقهم وظلمهم وفجورهم، كلما رأوهم، مع علمهم أنه لا يجدي إنكارهم. وقد يكون من الفسقة من إذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم فيزداد فسوقا إلى فسوقه، وفجورا إلى فجوره۔"

"اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کو یقین یا ظن غالب ہو کہ اس کا امر و نہی کوئی فائدہ نہیں دے گی، تو وجوب ختم ہو جائے گا اور استحباب باقی رہے گا کیونکہ یہ تو (منکر ختم کرنے یا نیکی کروانے کا) ایک وسیلہ ہے، اور مقصد کے فوت ہونے سے وسائل بھی ساقط ہو جاتے ہیں۔

بعض اوقات حضور ﷺ مسجد حرام میں داخل ہو جاتے اور اس میں بت رکھے ہوتے تھے، لیکن حضور ﷺ ہر مرتبہ نکیر نہ فرماتے، اسی طرح مشرکین کو (شرک کے منکر میں مبتلا) دیکھ کر ہر بار آپ ﷺ نکیر نہیں کرتے تھے، یہی حال سلف (صالحین) کا رہا کہ وہ فسق و ظلم کرنے والوں کو ہر وقت نکیر نہیں کرتے تھے جبکہ ان کو معلوم تھا کہ ان کا انکار کوئی فائدہ مند نہیں۔ بلکہ بعض فساق تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی بات کی جاتی ہے تو (ان کی خیالی) عزت ان کو گناہ پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے تو اپنے گناہوں کے ساتھ دوسرے گناہ بھی زیادہ ہو جاتے ہیں (اسلئے ایسی صورت میں تو فائدہ کے بجائے نقصان ہی نقصان ہے، لہٰذا ایسے شخص کو امر اور نہی کرنا کوئی ضروری نہیں۔)"[1]

ایک ضروری قید

تاہم اس میں بھی پہلے ذکر کی ہوئی بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ یہ حکم تب ہی ہے جب فائدہ نہ ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو، محض مفید نہ ہونے کے خیال سے یا وہم و گمان سے وجوب ساقط نہیں ہو گا، اسلئے اس معاملہ میں بھی احوال و قرائن کو مد نظر رکھ

---

[1] قواعد الأحكام في مصالح الأنام، فصل في بيان وسائل المفاسد، 1/128-

کر پوری دیانتداری کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری ہے، اگر اس طرح کرنے کے نتیجہ میں فائدہ نہ ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو جائے تو وجوب ساقط ہو جائیگا، ورنہ اگر فائدہ ہو جانے کا یقین یا ظن غالب ہو یا دونوں میں تردد ہو کہ امر یا نہی کرنا کارگر اور سود مند ثابت ہو گا یا نہیں؟ تو ان تمام صورتوں میں وجوب برقرار رہے گا۔

اکثر اوقات یہی صورت حال پیش آتی ہے کہ بغیر کسی دلیل اور قرینہ کے یہ اٹل فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ میرے کہنے سے مخاطب باز نہیں آئیگا، میرے کہنے سے اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا، میرے کہنے کی طرف وہ التفات نہیں کرے گا وغیرہ وغیرہ، ان حیلوں بہانوں اور ناعاقبت اندیش فیصلوں کی وجہ سے امر یا نہی کے وجوب میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔

چوتھی شرط: عدالت

معتزلہ میں سے بعض حضرات نے امر یا نہی جائز ہونے کیلئے ایک یہ شرط بھی ذکر کی ہے کہ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا عادل ہو، گناہگار نہ ہو، اگر وہ خود ہی گناہ کا مرتکب ہو تو دوسروں کو بھی دعوت نہیں دے سکتا۔ ان حضرات کے دلائل یہ ہے:

ا۔ آیت کریمہ:

"أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون۔"

"کیا لوگوں کو تم نیکی کا حکم کرتے ہوں اور اپنے آپ کو بھول

جاتے ہوں حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہوں پھر کیوں نہیں سمجھتے۔"[1]

۲۔آیت کریمہ:

" وما أريد أن أخالفكم إلى ما أنهاكم عنه إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب۔"

"میں یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تجھے منع کروں میں اس کے خلاف کروں میں تو اپنی طاقت کے مطابق اصلاح ہی چاہتا ہوں اور مجھے تو صرف اللہ ہی سے توفیق حاصل ہوتی ہے میں اسی پر بھروسہ کرتاہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔[2]

۳۔آیت کریمہ:

"يا أيها الذين آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون. كبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون۔"

"اے ایمان والوایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو ۔خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں ۔ "(ترجمہ حضرت تھانوی صاحب)[3]

ان تین آیات کے علاوہ مندرجہ ذیل احادیث سے بھی اس مؤقف پر استدلال کیا جاتا ہے۔

---

[1] سورة البقرة:44

[2] هود: 88

[3] سورة الصف:2،3

حدیث نمبر ا:

"عن أبي وائل، قال قيل لأسامة ۔ قال: سمعته يقول: " يجاء بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار، فتندلق أقتابه في النار، فيدور كما يدور الحمار برحاه، فيجتمع أهل النار عليه فيقولون: أي فلان ما شأنك؟ أليس كنت تأمرنا بالمعروف وتنهانا عن المنكر؟ قال: كنت آمركم بالمعروف ولا آتيه، وأنهاكم عن المنكر وآتيه۔ "

"حضرت اُسامہ فرماتے ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا پھر اسے جہنم میں ڈالا جائے گا تو اس کی آنتیں آگ میں نکل پڑیں گی پس وہ اس طرح گردش کرے گا جس طرح گدھا ایک چکی کو لے کر (اس کے گرد) گھومتا ہے پھر دوزخی اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ اے فلاں تیرا یہ حال کیوں ہے کیا تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا نہ تھا وہ کہے گا (ہاں) میں تمہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا تھا مگر خود اپنی باتوں پر عمل نہ کرتا تھا اور تم کو بری باتوں سے روکتا تھا مگر خود برائیوں میں مبتلا ہو جاتا تھا۔[1]

حدیث نمبر ۲:

[1] صحيح البخاري، كتاب بدءالخلق،باب صفة النار، وأنها مخلوقة رقم الرواية: 3267

"قال جندب، قال رسول الله ﷺ: «مثل العالم الذي يعلم الناس الخير وينسى نفسه كمثل السراج يضيء للناس ويحرق نفسه»"

"اس عالم کی مثال جو لوگوں کو بھلائی سکھاتا ہے اور اپنے آپ کو بھولتا ہے (یعنی خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا) اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کیلئے روشنی پیدا کرتا ہے اور خود اپنے آپ کو جلاتا ہے"۔[1]

حدیث نمبر ۳:

"عن أنس بن مالك، أن رسول الله ﷺ قال: " رأيت ليلة أسري بي رجالا تقرض شفاههم بمقاريض من نار، قلت: من هؤلاء يا جبريل؟ قال: هؤلاء خطباء من أمتك يأمرون الناس بالبر وينسون أنفسهم وهم يتلون الكتاب أفلا يعقلون۔ "

"معراج کی رات میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹوں کو جہنم کی قینچیوں سے کاٹا جارہا تھا، میں نے جبرئیل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ تیری اُمت کے وہ خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکیوں کا حکم کرتے ہیں اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن کریم پڑھتے ہیں۔ کیا وہ عقل نہیں رکھتے؟[2]

---

[1] المعجم الكبير للطبراني، أبو تميمة الهجيمي، عن جندب، رقم الرواية: 1681، 2/ 165

[2] شرح السنة للبغوي ، كتاب الرقاق، باب وعيد من يأمر بالمعروف ولا يأتيه، 14/ 353

حضرت عبداللہ بن عباس بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے ایک واقعہ سے بھی اس مؤقف کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ان کا واقعہ درج ذیل الفاظ کیساتھ نقل کیا۔

"عن الضحاك، عن ابن عباس، قال: جاء رجل فقال: يا ابن عباس، إني أريد أن آمر بالمعروف وأنهى عن المنكر، قال: " أو بلغت؟ " قال: أرجو، قال: " فإن لم تخش أن تفتضح بثلاثة أحرف في كتاب الله عز وجل فافعل " قال: وما هن؟ قال: " قوله عز وجل: {أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم}أحكمت هذه الآية؟ " قال: لا، قال: فالحرف الثاني؟ قال: " قوله عز وجل: " {لم تقولون ما لا تفعلون كبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون} أحكمت هذه الآية؟ " قال: لا، قال: فالحرف الثالث؟ قال:" قول العبد الصالح شعيب عليه السلام: {ما أريد أن أخالفكم إلى ما أنهاكم عنه}أحكمت هذه الآية؟ " قال: لا، قال: " فابدأ بنفسك. "[1]

حضرت ضحاک نے نقل کیا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس آکر عرض کیا کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں، آپ نے پوچھا کیا خود تم کو (معروف اور منکر کی تعلیمات) پہنچی ہیں؟ اس نے عرض کیا مجھے تو یہی اُمید ہے، آپ نے فرمایا اگر آپ اللہ کی کتاب کی تین آیتوں (کو

[1] شعب الإيمان، الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، 60/10

سننے) سے شرمندہ نہ ہو، تو کرو، اس نے عرض کیا، وہ کونسی آیتیں ہیں؟ (آپ نے جواب میں وہی تین آیتیں ذکر فرمائی، جب آنے والے نے نفی میں جواب دیا) تو آپ نے فرمایا" پھر پہلے اپنے نفس سے شروع کرو۔"

یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آنے والے شخص کو لوگوں کے سامنے امر اور نہی کرنے سے منع فرمایا، اور بطور دلیل مندرجہ بالا تین آیتیں تلاوت فرمائی، ان تینوں آیتوں میں یہی مفہوم وارد ہے کہ دوسروں کو امر یا نہی کرنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح ضروری ہے، اپنے نفس کو گناہ اور معصیت سے پاک کرنے سے پہلے دوسروں کو ترغیب و ترہیب دینے سے منع فرمایا گیا۔

اس کے علاوہ آپ کے شاگرد رشید امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام نخعی کا بھی یہی مؤقف تھا۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

"قال إبراهيم النخعي: إن لأكره القصص لثلاث آيات: قوله تعالى: أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وقوله: يا أيها الذين آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون. كبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون وقوله إخبارا عن شعيب: وما أريد أن أخالفكم إلى ما أنهاكم عنه إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب. "[1]

---

[1] تفسير ابن كثير ،سورة البقرة، آية"أتأمرون الناس بالبر"1 / 152-

" (امام) ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ میں تین آیات کی وجہ سے وعظ و نصیحت اور قصہ گوئی کو ناپسند کرتا ہوں (پھر آپ نے وہی تین آیتیں ذکر فرمائیں)۔ "

عدالت کے شرط ہونے کے متعلق جمہور اُمت کا مؤقف

جمہورِ اُمت کے نزدیک یہ مؤقف اختیار کرنا درست نہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے عدالت کوئی لازمی شرط نہیں، گناہگار اور معاصی کے ارتکاب کرنے والے پر بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، محض گناہگار ہونے سے امر اور نہی کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔

اس مؤقف کی بنیاد وہ تمام قرآنی آیات اور نبوی ارشادات ہیں، جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا، ان آیات واحادیث میں اس کی کوئی قید و شرط نہیں لگائی کہ یہ حکم صرف عدل کے ساتھ مقید ہے، عادل لوگ ہی اس کے مخاطب ہیں، گناہگار لوگوں کا استثناء کہیں ثابت نہیں، اس سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح عادل پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، اسی طرح گناہ کے مرتکب افراد بھی اسکے مخاطب ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا معقول کلام

متعدد مفسرین، محدثین اور فقہاء کرام نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، اختصار کی خاطر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فلسفیانہ اور معقولانہ کلام پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے جو آپ نے اپنی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذکر فرمایا۔

اس کی مختصر سی وضاحت یہ ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے لئے عادل ہونے کو شرط قرار دیا جائے اور فسق کی وجہ سے امر اور نہی کو ممنوع

قرار دیا جائے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کیاامر اور نہی کرنے والے کیلئے تمام گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے یا بعض گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے؟

عصمت تو صرف حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا امتیازی وصف ہے جس میں ان کا کوئی انسان شریک و سہیم نہیں، اسلئے یہ قید تو بالکل باطل ہے، نیز یہ اُمت کے اجماعی تعامل اور اتفاقی روش کے بھی سراسر خلاف ہے، ہمیشہ سے افواج اسلام کفار سے نبرد آزما ہوئے اور سیف وسنان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے، حالانکہ یقیناً اُن میں بعض اوقات گناہگار افراد نے بھی شرکت کی سعادت حاصل کی، لیکن تمام اُمت نے ان کی اس قربانی کو سراہا، کسی نے یہ کہہ کر نکیر کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ خود تو گناہگار ہے دوسروں کو راہ راست پر لانے کیلئے تلوار کیوں اُٹھا رہے ہو! نہی عن المنکر اور جہاد و قتال کے لیے تو عادل ہونا ضروری ہے!

اور اگر بعض گناہوں سے بچنے کو لازمی شرط قرار دیا جائے تو اس کی تحدید و تعین میں وقت صرف کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ کیا یہ تعین شارع کی طرف سے ثابت ہے؟ کیا مندرجہ بالا دلائل میں یا اس جیسے دیگر دلائل میں اس کا کوئی سراغ ملتا ہے؟

اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو لا محالہ یہ تحدید اپنی رائے اور اجتہاد سے ہوگی، حالانکہ فرائض وواجبات اور شرائط وارکان کا تعلق عبادات سے ہے جس کی تقرری کا حق صرف شارع کو ہے، اس کی تعیین اور تشریع میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اصل عبارت یہ ہے:

"المسألة الثالثة الفقهية: فمثل اختلافهم في أن الفاسق

هل له أن يحتسب؟ وهذا نظر فقهي، فمن أين يليق بالكلام ثم بالمختصرات. ولكنا نقول الحق أن له أن يحتسب وسبيله التدرج في التصوير؛ وهو أن نقول: هل يشترط في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر كون الآمر والناهي معصوماً عن الصغائر والكبائر جميعاً؟ فإن شرط ذلك كان خرقاً للاجماع، فإن عصمة الأنبياء عن الكبائر إنما عرفت شرعاً، وعن الصغائر مختلف فيها، فمتى يوجد في الدنيا معصوم؟

وإن قلتم إن ذلك لا يشترط حتى يجوز للابس الحرير مثلاً وهو عاص به أن يمنع من الزنى وشرب الخمر، فنقول: وهل لشارب الخمر أن يحتسب على الكافر ويمنعه من الكفر ويقاتله عليه؟ فإن قالوا لا، خرقوا الاجماع إذ جنود المسلمين لم تزل مشتملة على العصاة والمطيعين ولم يمنعوا من الغزو لا في عصر النبي ﷺ ولا في عصر الصحابة رضي الله عنهم والتابعين، فإن قالوا نعم، فنقول: شارب الخمر هل له أن يمنع من القتل أم لا؟ فإن قيل لا، قلنا: فما الفرق بين هذا وبين لابس الحرير إذا منع من الخمر والزاني إذا منع من الكفر؟ وكما أن الكبيرة فوق الصغيرة فالكبائر أيضاً متفاوتة، فإن قالوا نعم، وضبطوا ذلك بأن المقدم على

شيء لا يمنع من مثله ولا فيما دونه وله أن يمنع مما فوقه، فهذا الحكم لا مستند له إذ الزنى فوق الشرب ولا يبعد أن يزني ويمنع من الشراب ويمنع منه، ربما يشرب ويمنع غلمانه وأصحابه من الشرب، ويقول: ترك ذلك واجب عليكم وعلي والأمر بترك المحرم واجب علي مع الترك فلي أن أتقرب بأحد الواجبين، ولم يلزمني مع ترك أحدهما ترك الآخر، فإذن كما يجوز أن يترك الآمر بترك الشرب وهو بتركه يجوز أن يشرب ويأمر بالترك فهما واجبان فلا يلزم بترك أحدهما ترك الآخر۔" [1]

"تیسرا فقہی مسئلہ (جو علم کلام میں بیان کر دیا جاتا ہے) یہ ہے کہ فاسق شخص احتساب (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک فقہی مسئلہ ہے، علم کلام سے اس کی کیا مناسبت ہے؟ پھر علم کلام کے بھی مختصر کتابوں کے ساتھ؟ (لیکن اس کے باوجود مسئلہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے) ہم کہتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ فاسق بھی احتساب کر سکتا ہے، وہ یہ کہ کیا امر و نہی کرنے والے کا تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے؟

اگر اس (معصومیت کی) شرط کو ثابت مانا جائے تو یہ اجماع کے خلاف ہے

---

[1] الاقتصاد في الاعتقاد للغزالي، القطب الرابع، الباب الثاني، المسألة الثالثة الفقهية،ص 124۔

کیونکہ (عام انسان تو در کنار خود) انبیاء کرام علیہم السلام کا کبیرہ گناہوں سے معصوم ہونا تو شرعاً معروف (وثابت) ہے مگر صغیرہ گناہوں سے معصوم ہونے میں اختلاف ہے، تو (جب انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں یہ اختلاف ہے تو عام افراد کی) دنیا میں کہاں کوئی معصوم پایا جا سکتا ہے؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ (تمام گناہوں سے معصوم ہونے کی) شرط ثابت نہیں بلکہ مثلاً ریشم پہننے والا اگرچہ خود معصیت کر رہا ہے لیکن وہ دوسروں کو زنا اور شراب خوری سے منع کر سکتا ہے، تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا شراب خور کیلئے کافر پر احتساب کرنا، اس کو کفر سے منع کرنا اور اس پر قتل وقتال کرنا درست ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ تو (بالکل) ہی خلاف اجماع ہے کیونکہ مسلمانوں کے لشکر ہمیشہ سے نیک وبد دونوں قسم کے لوگوں پر مشتمل رہا ہے، اور ان (گناہگاروں) کو نہ حضور ﷺ کے زمانے میں (اس بنیاد پر) جہاد سے روکا گیا اور نہ ہی صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے میں۔ اور اگر جواب "ہاں" میں ہو تو ہم کہتے ہیں کہ کیا شراب خور کیلئے دوسرے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کرنا درست ہے یا نہیں؟۔

اگر جواب میں کہا جائے کہ نہیں، تو ہم (سوال کرتے ہوئے) عرض کرتے ہیں کہ اس میں اور ریشم پہننے والے میں کیا فرق ہے جب وہ زنا سے لوگوں کو منع کرے، یا زنا کرنے والا جب لوگوں کو قتل سے منع کرے؟

اور جس طرح کبیرہ گناہ صغیرہ سے بڑھ کر ہے اسی طرح کبیرہ گناہوں کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اگر کوئی شخص منضبط بات بنا کر کہے کہ جو شخص کسی معصیت میں مبتلا ہو تو وہ اپنے جیسے گناہ اور اس سے کم تر گناہوں سے لوگوں کو منع نہیں کر سکتا ہے اور جو لوگ اس سے بڑھ کر گناہ کر رہے ہوں ان کو منع کر سکتا ہے، تو (اگرچہ ظاہر نظر میں یہ بڑا اچھا ضابطہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، کیونکہ) ہم کہتے ہیں کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں،

(مثلاً) زنا شراب سے بڑھ کر گناہ ہے لیکن یہ کوئی بعید نہیں کہ زنا کرنے والا شراب نوشی سے منع کرے، یا کوئی شخص خود شراب پیتا ہے مگر اپنے خدام و غلمان کو یہ کہہ کر اس سے منع کرتا ہے، کہ شراب نوشی چھوڑنا ہم سب پر واجب ہے اور حرام کام کو چھوڑنے کا حکم کرنا بھی مجھ پر واجب ہے، (پس اگر میں ایک واجب نہ کر سکوں تو دوسرا کیوں چھوڑوں؟) مجھے اختیار ہے کہ ایک حکم کو بجالا کر قرب خداوندی حاصل کروں، ایک واجب کے چھوٹ جانے سے دوسرا چھوڑنا ضروری نہیں، (تو اس میں کیا اشکال یا کونسا بعد ہے ؟)

یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفیانہ کلام تھا جو اپنے جیسے مخاطبین کو سمجھانے کیلئے آپ نے لکھا تھا اس سے یہ مسئلہ بڑی حد تک سلجھ جاتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ کا ایک قیمتی ملفوظ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی وزنی بات نقل فرمائی ہے جو امام غزالیؒ کے مذکورہ تفصیل کا خلاصہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر ایسے افراد ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے جو بالکل ہی عیوب و نقائص، معاصی اور نافرمانی سے بری اور منزہ ہوں، اسلئے امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کیلئے یہ شرط مقرر کرنا در حقیقت عملی طور پر اسکا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے۔

مشہور مالکی فقیہ علامہ ابوالولید محمد بن احمد رشد القرطبیؒ (المتوفی ۵۲۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قال مالك: قال ربيعة سمعت سعيد بن جبير يقول: لو كان المرء لا ينهى عن المنكر ولا يأمر بالمعروف حتى

لا يكون فيه شيء ما أمر أحد بمعروف ولا نهى عن منكر. قال مالك: وصدق، ومن هذا الذي ليس فيه شيء؟

قال محمد بن رشد: هذا بين على ما قاله إنه ليس من شرط الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر أن يكون القائم بذلك سالما من مواقعة الذنوب والخطايا إذ لا يسلم أحد من ذلك۔"[1]

"ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیرؒ کو فرماتے ہوئے سنا " اگر (ہر) کوئی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تب تک چھوڑ دے، جب تک اس میں کوئی (قابل اعتراض) چیز باقی نہ رہے تو (دنیا میں) نہ کوئی امر کرتا نہ ہی (کسی کو) نہی عن المنکر (کی توفیق نصیب ہوتی)۔

محمد بن رشد (قرطبیؒ) کہتے ہیں کہ یہ ان کے قول کی واضح دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ کرنے والا گناہوں اور غلطیوں سے پاک ہو کیونکہ (عام حالات میں) ان (تمام گناہوں اور ہر قسم کی غلطیوں) سے کوئی نہیں بچتا۔"

کیا خود گناہگار ہونے کی وجہ سے دعوت دینا چھوڑ دے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہگار کیلئے دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے اپنی اصلاح کر لینی چاہئے، جب تک آدمی خود عمل کے زیور سے آراستہ نہ

[1] البيان والتحصيل، الكتاب الثامن، صفة الأمر بالمعروف، 330/18۔

ہو تب تک عام طور پر اس کی بات میں تاثیر نہیں ہوتی، دوسروں پر کوئی بات منوانے کیلئے ضروری ہے کہ منوانے والا خود اس صفت سے متصف ہو۔

لیکن دراصل اس کی طرف دو الگ الگ احکام متوجہ ہیں، ایک حکم یہ ہے کہ خود اپنے نفس کو گناہوں میں آلودہ ہونے سے باز رکھے، دوسرا حکم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے، اب اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ایک حکم کی بجاآوری سے قاصر ہے تو یہ کونسی دانشمندی ہے کہ اس کو دوسرے حکم سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے!

کیا ایک معصیت کی بنیاد پر دوسرے فرض یا واجب کو ٹالا جا سکتا ہے؟ اگر کسی شخص سے خدانخواستہ نماز قضاء ہو جائے تو کیا اس جرم کی پاداش میں اس کو روزہ یا زکوۃ سے بھی محروم کیا جا سکتا ہے؟

اسی نکتہ کو بیان کرتے ہوئے امام جصاص رازی (المتوفی ۳۷۰ھ) رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"لما ثبت بما قدمنا ذكره من القرآن والآثار الواردة عن النبي ﷺ وجوب فرض الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وبينا أنه فرض على الكفاية إذا قام به البعض سقط عن الباقين وجب أن لا يختلف في لزوم فرضه البر والفاجر; لأن ترك الإنسان لبعض الفروض لا يسقط عنه فروض غيره ألا ترى أن تركه للصلاة لا يسقط عنه فرض الصوم وسائر العبادات؟ فكذلك من لم يفعل سائر المعروف ولم ينته عن سائر المناكير فإن فرض الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر غير ساقط

عنه." [1]

"جب ہمارے ذکر کردہ قرآن وحدیث کے دلائل سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت ثابت ہو چکی، اور یہ بات بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ فرض کفایہ ہے اگر بعض لوگ بھی کریں گے تو دیگر لوگوں سے وجوب ساقط ہو جائے گا، تو (ان دونوں مقدمات کے بعد) یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے لازم اور فرض ہونے میں نیک وبد کا کوئی فرق نہ ہو۔

کیونکہ کسی انسان کا بعض فرائض کو چھوڑنا دوسرے فرائض کو اس سے ساقط نہیں کرتا، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کسی شخص کے نماز چھوڑنے سے روزہ وغیرہ عبادات ساقط نہیں ہوتے، (بالکل) اسی طرح جو شخص تمام نیکیوں کو عمل میں نہ لا سکے نہ تمام برائیوں سے اپنے آپ کو بچا سکے اس سے امر ونہی کی ذمہ داری ختم نہیں ہو گی۔"

فتاوی ہندیہ میں اسی نکتہ کو بیان فرمایا:

"رجل رأى منكرا وهذا الرائي ممن يرتكب هذا المنكر يلزمه أن ينهى عنه لأن الواجب عليه ترك المنكر والنهي عنه فبترك أحدهما لا يسقط عنه الآخر."

"کسی شخص نے منکر دیکھا حالانکہ خود یہ دیکھنے والا بھی اس منکر کا ارتکاب کرتا ہو، (پھر بھی) اس پر لازم ہے کہ مخاطب کو اس منکر سے روکے، کیونکہ اس پر (دو چیزیں واجب ہیں، ایک خود) وہ منکر چھوڑنا اور (دوسرا واجب) اس

[1] أحكام القرآن للجصاص، سورة آل عمران، رقم الآية:104،42/2۔

سے روکنا، تو ایک واجب کے چھوڑنے سے دوسرا ساقط نہیں ہوگا۔"[1]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ومن رأى منكراً وهو ممن يفعله: يلزمه النهي عنه) أي عن ذلك المنكر، لأن في الامتناع عنه يرتكب محظورين: فعل المنكر، وترك النهي عن المنكر، وفي إقدامه: يكتسب ثواب النهي عن المنكر. "[2]

تلبیسِ ابلیس

امام ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہے کہ شیطان انسانیت کے گمراہی کیلئے مختلف ہتکھنڈے استعمال کرتا رہتا ہے، ان میں سے ایک بڑا حربہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص کسی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہوا دیکھے تو اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ آپ خود گناہگار ہے آپ کے اندر اتنی اہلیت کہاں ہے کہ دوسروں کو گناہوں سے روکے، ان جیسے وساوس کو دینی خیال بنا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے منع کرتا ہے۔

حالانکہ جیسا کہ اُوپر تفصیل سے واضح ہوا یہ دو الگ الگ فریضے ہیں، دونوں کو مستقل طور پر بجالانا ضروری ہے، ایک ذمہ داری میں کوتاہی یا سستی اور غفلت کی وجہ

---

[1]الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب السابع عشرفي الغناءواللهووسائر المعاصي والأمربالمعروف،5 / 353-

[2] منحة السلوك في شرح تحفة الملوك،كتاب الكراهيةص: 424.

سے دوسری ذمہ داری سے اپنے آپ کو عہدہ برا سمجھنا امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے مطابق تلبیسِ ابلیس اور شیطانی چال ہے۔[1]

پیش کردہ دلائل کا جواب

عدالت نہ پائے جانے کی وجہ سے امر اور نہی کرنے کی تردید و مذمت میں جتنی بھی آیات یا احادیث ذکر کی گئی ہیں، ان میں دراصل مذمت کا نکتہ خود عمل نہ کرنا ہے، دوسروں کو امر یا نہی کرنے پر وعید بیان کرنا مقصود نہیں، لہٰذا ان دلائل کا حاصل یہ ہوا کہ دوسروں کو ترغیب و ترہیب کے باوجود تمہارا خود بے عمل ہو جانا اور بے راہ روی کا شکار ہو جانا انتہائی قابلِ مذمت اور لائقِ ترک حرکت ہے، اور یہ بالکل اتفاقی امر ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔

اُمت کے اکابر و اسلاف کا فہم

پیش کردہ دلائل میں غور و فکر کرنے سے یہ معاملہ بخوبی سلجھ جاتا ہے، اور اس بات میں مزید کوئی پوشیدگی یا پیچیدگی باقی نہیں رہ پاتی، جن دلائل سے یہ استدلال کیا گیا تھا اس سے امت کے اکابر و اسلاف نے یہی کچھ سمجھا جس کی مختصر تفصیل تحریر کی گئی۔

ذیل میں نمونہ کے خاطر ان مفسرین کرام میں سے چند ایک کی نشاندہی کی جاتی ہے جنھوں نے آیت کی تفسیر میں یہ مؤقف اختیار کیا، اور جن آیات سے عدالت کے

---

[1] تلبيس إبليس، الباب الثامن، ذكرتلبيسه علي الأمرين بالمعروف والناهين عن المنكر، ص134

شرط ہونے پر استدلال کیا گیا، ان کا تسلی بخش جواب دیا۔

۱۔ قاضی عبداللہ بن عمر البیضاوی الشافعی (۶۸۵ھ): تفسیر ابن کثیر، تحت قوله تعالیٰ "أتامرون الناس بالبر" ج ص ۔

۲۔ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد الخفاجی الحنفی (۱۰۶۹ھ) نے قاضی بیضاویؒ کے اس کلام پر تفصیل سے کلام کیا ہے، ملاحظہ ہو: عناية القاضی وكفاية الراضی ، ج۲ص ۵۳۔

۳۔ امام اسماعیل بن عمر ابن کثیر الدمشقی (۷۷۴ھ): تفسیر ابن کثیر، تحت قوله تعالیٰ "أتامرون الناس بالبر" ج۱ص۱۵۲۔

۴۔ امام ابوالسعود محمد بن محمد المصری الحنفی (۹۸۲ھ): إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم، ج۱ص۹۷

۵۔ امام شہاب الدین محمود بن عبداللہ الآلوسی الحنفی (المتوفی: ۱۲۷۰ھ) روح المعانی، تحت قوله تعالیٰ "أتامرون الناس بالبر" ج۱ص۲۵۰۔

پانچویں شرط: اذنِ امام (حاکم کی طرف سے اجازت)

بعض حضرات کے نزدیک امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ کرنے والے کو حاکم وقت کی طرف سے امر یا نہی کی اجازت بھی حاصل ہو، حاکم کی طرف سے پروانہ اجازت لئے بغیر اس کو اپنے آپ ہی نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا درست نہیں۔

اذنِ امام شرط نہ ہونے کی متعدد وجوہات

لیکن یہ مؤقف متعدد وجوہات کی بناء پر درست نہیں۔

۱: اسلئے کہ امر اور نہی کے متعلق نصوص واحکام آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، یہ نصوص اپنے الفاظ کے اعتبار سے عام اور مطلق ہے، اذنِ امام کی قید کیساتھ اس کو مقید نہیں کیا گیا، اسلئے محققین حضرات نے اس شرط لگانے کو بالکل تحکم قرار دیا۔

البتہ امر یا نہی کے بعض خاص صورتوں میں اگر کسی بھی طرح یہ ذمہ داری نبھانے کی صورت میں اس سے زیادہ فتنہ وفساد یا قتل وغارت گری کا خطرہ ہو تو اس صورت میں مصالح کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر صالح حکومت کو مطلع کر دیا جائے اور اس کے توسط سے کام کیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

نیز کتاب کے آخر میں مستقل باب کی شکل میں نہی عن المنکر اور تغییر منکر کی مختلف شکلیں ذکر کی جائیں گی، ان میں جن جن صورتوں میں حکومتی اجازت حاصل ہوئے بغیر فساد بڑھنے اور شر انگیزی کا خطرہ ہو وہ حکومتی اذن لئے بغیر سرانجام نہیں دینا چاہئے۔

لیکن اس کو یہ عنوان دینا یقیناً غلط ہے کہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر بغیر اذن امام جائز نہیں، بلکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ امر اور نہی کرنا ضروری ہے، تاہم ان مراتب پر اکتفاء کر لینا چاہئے جن میں فتنہ زیادہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

۲: بعض نصوص میں صراحتاً اذنِ امام تو کیا، بلکہ امام کے منشاء کے بالکل خلاف بھی امر اور نہی کی بے پناہ فضیلت مذکور ہے، چنانچہ سنن کی روایت ہے "أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" اس روایت میں ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق

اور اعلان انصاف کو بہترین جہاد قرار دیدیا گیا، اور بہتری اور فضیلت اسی لئے ہے کہ اس میں خوف و مشقت زیادہ ہے، ظالم حکمران کی طبیعت و مزاج اس قدر متحمل نہیں ہوتی جو اپنے خلاف ندائے احتجاج کو برداشت کر سکے۔

یہ کلمہ حق بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ایک حصہ ہے، تو گویا یہاں حاکم کی اجازت تو کیا اس کے اجازت کے بالکل برعکس امر اور نہی کی یہ عظیم فضیلت بیان فرمائی گئی، جس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اذنِ امام کوئی ضروری نہیں، بلکہ ضرورت کے وقت شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے حکمت وبصیرت کے ساتھ اذنِ امام کے خلاف بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔

۳: اُمت کے اجماعی تعامل اور اتفاقی طرزِ عمل کا دقت نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو بھی اس بات کا بخوبی تصفیہ ہو جاتا ہے۔

خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں جب تک اسلامی حکومت رہی، جس میں خاص اسی مقصد کیلئے حکومت ہی کی طرف سے "نظام حسبہ" کا قابل تقلید محکمہ موجود تھا، اور کافی حد تک یہ کام خوش اسلوبی کیساتھ نبھایا بھی جاتا رہا، اُمت کے انفرادی اور اجتماعی اعمال اسی محکمہ کے افراد کے دائرہ عمل میں داخل تھے، عام و خاص کو امر اور نہی کرنا نہ صرف ان کے زیر دست تھا، بلکہ ان کی ذمہ داری میں داخل تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ افراد بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے جن کو یہ سرکاری طور پر عمل سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ بعض اوقات امراء وسلاطین تک کو امر اور نہی کرتے رہیں، نیک اور خداترس خلفاء اور سلاطین کی طرف سے اس کارکردگی پر ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی رہی، اُمت

کے دیگر علماء و محدثین نے ان فکر مند حضرات کے اس طرز عمل کے بارے میں عزیمت اور رخصت کی بحث تو فرمائی، لیکن جواز و عدم جواز کی نکتہ چینی کی کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی، اذنِ حاکم نہ ہونے کی وجہ سے اس طرز عمل کو کسی نے ناجائز یا غلط نہیں کہا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام نیکیوں کا حکم دینے یا برائی سے منع کرنے میں اذن امام کوئی شرط نہیں۔

۴: نصوص میں ادنی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم افراد پر بھی عائد ہوتا ہے، تغییر یا تقلیل منکرات صرف حکومت ہی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ افرادِ اُمت بھی اس حکم کے مخاطب ہیں، اسلئے حکومت کی اجازت کے بغیر عام افراد پر سے یہ وجوب ساقط کرنا بالکل درست نہیں۔

۵: شریعت مطہرہ میں جن اہم مصالح و مقاصد کیلئے اس فریضہ کو اُمت پر عائد کیا گیا، اذن حاکم کے شرط ہونے کی صورت میں عام طور پر ان مصالح کے حاصل ہونے کی اُمید بالکل کم ہے، کیونکہ جیسا کہ تاریخ گواہ ہے کرسی صدارت اور منزل امارت پر "فائز" ہو جانے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کو دینی مزاج وطبیعت اور فکر و فلسفہ سے کوئی خاص واسطہ اور لگاؤ نہیں ہوتا، اسلئے صرف ایسے ہی افراد کو اسکے متعلق خود مختار بنانے میں یقیناً شریعت کے وہ نیک مصالح مفقود ہوں گے جن کے حصول کیلئے شریعت نے اُمت کے کندھوں پر یہ بوجھ ڈال دیا تھا۔

راجح قول

ان معروضات کی بناء پر راجح یہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جائز ہونے یا بعض صورتوں میں واجب ہونے کیلئے حاکم وقت کی طرف سے اجازت

حاصل ہونے کی شرط لگانا درست نہیں، بلکہ حاکم کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں بھی یہ احکامات متوجہ ہوتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"قد شرط قوم هذا الشرط ولم يثبتوا للآحاد من الرعية الحسبة وهذا الاشتراط فاسد فإن الآيات والاخبار التي أوردناها تدل على أن كل من رأى منكرا فسكت عليه عصى إذ يجب نهيه أينما رآه وكيفما رآه على العموم فالتخصيص بشرط التفويض من الإمام تحكم لا أصل له۔"[1]

"بعض لوگوں نے یہ (اذن امام کی) شرط لگائی ہے اور (اس شرط کے مطابق) عام رعایا کیلئے احتساب کا حق نہیں دیا، لیکن یہ شرط لگانا غلط ہے، کیونکہ جو آیات واحادیث ہم ذکر کر چکے وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص بھی کسی منکر کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرے وہ گناہگار ہے، اسلئے کہ وہ جہاں بھی اور جیسے بھی دیکھتا، نہی کرنا اس پر ضروری تھا (قرآن وحدیث سے یہ حکم عموم کے ساتھ ملتا ہے، حاکم وسلطان کی کوئی قید نہیں، لہذا) امام کی طرف یہ منصب سپرد ہونے کی شرط لگانا بالکل بے سند اور بے بنیاد ہے۔"

علامہ عبدالقادر عودہ شہید رحمۃ اللہ علیہ اذنِ حاکم کے شرط ہونے اور نہ ہونے کے متعلق مندرجہ بالا دونوں قول ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے بیان کرتے ہوئے

---

[1] إحياء علوم الدين، كتاب الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، الشرط الرابع، 2/ 315

رقمطراز ہیں:

"والرأي الأخير هو الرأي الذي جرى عليه العمل في كل العهود حتى في الأوقات التي خصص فيها الخلفاء والولاة رجالاً معينين للأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، فإن هذا الخصيص لم يمنع أي فرد من أفراد الأمة عن القيام بهذا الواجب، بل لقد كان بعض الأفراد يتصدون إلى الولاة والخلفاء يأمرونهم بالمعروف وينهونهم عن المنكر، ويتصدون لتغيير المنكر بأيديهم فلا يستطيع الخلفاء والولاة أن يقولوا لمن فعل شيئاً من ذلك إنك مخطئ۔"[1]

"اور یہ آخری رائے ہی وہ رائے ہے جس پر تمام زمانوں میں عمل ہوتا رہا، یہاں تک کہ جس زمانے میں خلفاء اور اصحاب سلطنت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے مخصوص افراد مقرر کر رکھے تھے یہ تخصیص بھی اُمت کے کسی فرد کیلئے اپنے اس فرض منصبی کو نبھانے کی راہ میں مانع نہ رہا، بلکہ (اُمت کے) بعض افراد تو ارباب حکومت اور اصحابِ ولایت کے پاس جا کر ان کو نیکی کا حکم اور برائی سے روکتے تھے، اور منکر و معصیت کو (ختم کرنے اور) اپنے ہاتھوں سے بدلنے کی کوشش کرتے تھے اور حکام اس طرح کرنے والے کو غلط نہیں کہہ سکتے تھے۔"

---

[1] التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي،الباب الثالث، المطلب الثاني الدفاع الشرعي العام، 500/1۔

اُمت کا اجماعی تعامل

علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کچھ تحریر فرمایا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اُمت کے اس اجماعی تعامل سے اجماع کا دعوی فرمایا۔

آپ لکھتے ہیں:

"وأما عدم توقف جوازه علي استنابة الإمام فيدل عليه أن كل واحد من آحاد الصحابة كان يشتغل بالأمربالمعروف والنهي عن المنكر بلا استنابة وإذن من الإمام، وكان ذلك شائعا ذائعا فيما بينهم ولم يوجد نكير فكان إجماعاعلي جوازه۔"[1]

"رہی یہ بات کہ اس کا جواز حاکم کی طرف سے نیابت واجازت پر موقوف نہیں، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر کوئی صحابیؓ حاکم کی اجازت کے بغیر ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشغول رہتا تھا، اور یہ (طرز عمل) ان کے درمیان شائع وموجود رہا، کسی کی طرف سے اس پر نکیر نہیں کی گئی جو کہ اس کے جائز ہونے پر اجماع ہے۔"

[1] شرح المواقف، خاتمة للمرصد الرابع، ج8ص407، دارالكتب العلمية۔

نیکی اور برائی (معروف اور منکر) کے اعتبار سے شرائط کا بیان

امر بالمعروف تو ایک وعظ و نصیحت ہے جس کا مقصود حکمت و بصیرت کے ساتھ نیک کام کی ترغیب اور اس کا حکم دینا ہے، اسلئے اس اعتبار سے اس کے لیے کچھ خاص شرائط مقرر نہیں، بلکہ جب داعی میں امر بالمعروف کرنے کی شرائط موجود ہوں تو اس کیلئے امر بالمعروف کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب اور ضروری ہو جاتا ہے جس کی تفصیلات سابقہ ابحاث میں ذکر کی جاچکی ہیں، اسلئے اس میں مزید تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جس کام سے روکا جارہا ہے اس کے اعتبار سے مندرجہ ذیل تین شرائط ہیں۔

پہلی شرط: منکر کا ہونا

پہلی شرط یہ ہے کہ خود منکر موجود ہو، منکر سے کیا مراد ہے؟ موضوع کے تعارف کے ضمن میں منکر کا مفہوم تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا گیا، اسلئے دوبارہ تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ منکر سے مراد ہر وہ کام ہے جس کا کرنا شرعاً ممنوع ہے، یعنی وہ کام شریعت کی روشنی میں ناجائز ہو چاہے کرنے والا کوئی ہو۔

اس تفصیل کے مطابق لفظ "منکر" معصیت سے عام ہے، مثلاً اگر نابالغ بچہ راستہ میں شراب پیتا پھرے تو یہ منکر ہے، اگرچہ نابالغ خود مکلف نہیں، لیکن اس کا یہ فعل معصیت نہیں، اس کے فعل کو دائرۂ تکلیف میں داخل کر کے حرام یا ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن چونکہ منکر کی تعریف اس پر منطبق ہو رہی ہے لہٰذا اس پر نکیر کی جائے گی۔

کیا منکر سے مراد صرف گناہ کبیرہ ہے ؟

منکر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف گناہِ کبیرہ سے روکنا ہے یا گناہ صغیرہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اس سے بھی روکنا ضروری ہے؟۔

اس سلسلہ میں راجح بات یہی ہے کہ مطلقاً ہر گناہ اور منکر سے منع کرنا نہی عن المنکر کے ضمن میں داخل ہے چاہے گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، بعض حضرات نے منکر کو گناہ کبیرہ کیساتھ مقید کیا، گناہ صغیرہ سے روکنے کو یہ حضرات ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ایسا کرنے کو تشدد وغیرہ کہہ کر مذمت کرتے ہیں، لیکن یہ مؤقف بالکل درست نہیں۔

جن نصوص میں نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا، ان میں ایسی کوئی قید نہیں، بلکہ گناہ اور منکر کا ذکر ہے جو کہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں کو شامل ہے۔

علامہ احمد بن محمد ابن النحاس شہید رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"يشترط في الفعل الذي يجب انكاره أن يكون منكرا سواء كان صغيرة أوكبيرة، إذلا يختص وجوب الإنكار بالكبائر دون الصغائر۔"[1]

"جس کام پر نکیر کی جارہی ہے اس کا منکر (گناہ) ہونا ضروری ہے، چاہے صغیرہ ہو یا کبیرہ، کیونکہ نکیر کا واجب ہونا کبیرہ گناہوں کے ساتھ خاص نہیں۔"

---

[1] تنبيه الغافلين عن أعمال الجاهلين، الباب الأول، الفصل الرابع، ٣٧

اجتہادی مسائل میں نکیر کرنے کے حدود

منکر سے مراد وہ کام ہے جو شرعاً ممنوع و ناجائز ہو یعنی اس کی ممانعت قرآن وسنت سے ثابت ہو، اجتہادی مسائل میں چونکہ یقینی طور پر کسی ایک مجتہد کے مؤقف ومذہب کو صحیح یا غلط نہیں قرار دیا جاسکتا، اسلئے ان مسائل میں ایک دوسرے پر نکیر کرنا بھی درست نہیں، لہٰذا اگر شافعی المسلک شخص کوئی ایسا کام کررہا ہو جو اس کے اپنے مسلک کے مطابق درست ہو لیکن حنفیہ کے ہاں اس طرح کرنا ناجائز ہو، تو حنفی کیلئے اس پر نکیر وانکار کرنا درست نہیں ہوگا، اس طرح اگر حنفی المسلک شخص اپنے مسلک کے مطابق کوئی کام سرانجام دے رہا ہو اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہاد و تحقیق کے مطابق وہ کام کرنا ناجائز ہو تو کسی شافعی المسلک کا حنفی کو اس کے روکنے کا اختیار حاصل نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اجتہاد کی بنیاد پر، یا اگر وہ مقلد ہے تو اپنے امام کے اجتہاد و تحقیق کی بناء پر کوئی جائز کام کررہا ہو لیکن دیکھنے والے کے اجتہاد یا مذہب کے مطابق وہ عمل جائز نہ ہو تو اس پر نکیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نکیر تو منکر و گناہ پر ہوتی ہے جبکہ مخاطب کے خیال میں بجا طور پر وہ عمل گناہ نہیں ہے، البتہ اگر وہ مخاطب کے مذہب میں بھی صرف جائز ہو اور دیکھنے والے کے مذہب کے مطابق حرام یا مکروہ تحریمی، تو اختلافی اُمور میں رعایت رکھنے کی ترغیب دی جاسکتی ہو۔

اس سے بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجتہادی یا اختلافی مسائل میں نکیر کرنا بہر حال درست نہیں ہے حالانکہ یہ بالکل درست نہیں ہے یہ تو تبھی ہے جب مخاطب کے اجتہاد یا مذہب کے مطابق اس کا عمل جائز ہو یعنی اجتہادی مسائل میں نکیر نہ کرنے کا

ضابطہ اس پر محمول ہے کہ ان جیسے مسائل میں دوسرے حضرات مجتہدین اور ان کے مقلدین پر بلاوجہ نکیر کرنا درست نہیں ہے۔

دوسری شرط: برائی کا ظاہر ہونا

نہی عن المنکر کے جواز کیلئے دوسری شرط یہ ہے کہ جس برائی کی ممانعت کی جارہی ہو، وہ ظاہر اور آنکھوں کے سامنے ہو، اسکے پہچاننے اور پتہ لگانے کیلئے سراغ لگانے اور دیوار پھلاندنے کی ضرورت نہ پڑے۔

دراصل اس شرط لگانے کی وجہ یہ پیش آئی کہ تجسس کرنا اور خفیہ طریقہ سے کسی کے پوشیدہ راز معلوم کرنا شرعاً ناجائز اور گناہ ہے، قرآن کریم میں اس سے منع فرمایا گیا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے "لَا تَجَسَّسُوا" تجسس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے نہ چاہتے ہوئے اس کی پوشیدہ اُمور یا عیوب کا سراغ لگایا جائے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"وقوله (وَلا تَجَسَّسُوا) يقول: ولا يتتبع بعضكم عورة بعض، ولا يبحث عن سرائره، يبتغي بذلك الظهور على عيوبه. "

"یعنی ایک دوسرے کے خفیہ باتوں کے پیچھے نہ پڑو، لوگوں کے رازوں کے کھوج میں نہ لگو جس سے ان کی کمزوریاں ڈھونڈلی جائے، بلکہ لوگوں کے ان حالات پر قناعت اختیار کرو جو تمہارے سامنے ہو۔"[1]

---

[1] جامع البيان،سورة الحجرات، رقم الأية:12،ج22 / 304 ،ت شاكر

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی خفیہ طور پر کسی گناہ میں ملوث ہو تو کسی مسلمان کو اس کے کھوج میں پڑنا اور گناہ کا سراغ لگانا شرعاً جائز نہیں۔

دعوت کے باب میں جائز و ناجائز تجسس کے حدود

البتہ یہاں یہ بحث ضروری ہے کہ خفیہ اور علانیہ کا کیا معیار ہے؟ یعنی کس گناہ سے منع کرنا ضروری ہے اور کس گناہ کے کھوج میں پڑنا تجسس میں داخل ہے؟

تو اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مکان وغیرہ کے پیچھے لوگوں سے چھپ کر کوئی گناہ کر رہا ہو ہے اور اس کے اثرات وعلامات لوگوں پر ظاہر نہ ہو تو وہ خفیہ گناہ شمار ہوگا، اس کی تلاش میں پڑنا تجسس کہلاتا ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

اسلئے نہی عن المنکر کرنے والے کو چاہیئے کہ لوگوں کے خفیہ مشاغل و مصروفیات کے جستجو میں قصداً نہ پڑے، کیونکہ خفیہ رازوں پر اس طرح اپنے آپ کو مطلع کرنا بجائے خود منکر اور ناجائز ہے یہ ایک ایسا اقدام ہے جو کہ بہت سے مفاسد کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے، شاید اسی لئے حضور ﷺ نے غالباً حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"عن معاوية، قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «إنك إن اتبعت عورات الناس أفسدتهم، أو كدت أن تفسدهم» "

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر آپ لوگوں کے پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑے رہے تو انہیں خراب کردے گا یا فرمایا کہ قریب ہے کہ تو انہیں

بگاڑ دے۔"[1]

اگر کوئی شخص لوگوں کے سامنے ہی کسی منکر کا ارتکاب کر رہا ہو، یا سامنے تو نہیں، بلکہ کسی چیز کی آڑ میں رہ کر کسی گناہ میں مصروف ہو لیکن اس کے اثرات لوگوں کے سامنے ہوں تو ان دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ اس پر نکیر کی جائے، اس کو نرمی وحکمت کے ساتھ اس برائی کرنے سے منع کرے، یہ خفیہ گناہ نہیں، بلکہ علانیہ منکر کا ارتکاب سمجھا جائیگا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کی تشریح فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"فإن قلت فما حد الظهور والاستتار؟ فاعلم أن من أغلق باب داره وتستر بحيطانه فلا يجوز الدخول عليه بغير إذنه لنعرف المعصية إلا أن يظهر في الدار ظهورا يعرفه من هو خارج الدار كأصوات المزامير والأوتار إذا ارتفعت بحيث جاوز ذلك حيطان الدار، فمن سمع ذلك فله دخول الدار وكسر الملاهي وكذا إذا ارتفعت أصوات السكارى بالكلمات المألوفة بينهم بحيث يسمعها أهل الشوارع فهذا إظهار موجب للحسبة فإذن إنما يدرك مع تخلل الحيطان صوت أو رائحة۔"[2]

"پس اگر کہے کہ پوشیدہ ہونے اور ظاہر ہونے کے حدود کیا ہیں؟ تو جان لو کہ

---

[1] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النهي عن التجسس، رقم الحديث: 4888

[2] إحياء علوم الدين،باب الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، 2 / 325۔

جو شخص گھر کا دروازہ بند کرے اور اس کی درودیوار میں چھپے تو معصیت کا سراغ لگانے کیلئے اس کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔

البتہ اگر کوئی شخص گھر کے اندر اتنے علانیہ طور پر منکر کا ارتکاب کرے کہ جس کو باہر لوگ بھی پہچان سکے، مثلاً گانے بجانے کے آواز اتنی تیز ہو کہ گھر کے باہر افراد بھی سن سکیں تو اس صورت میں جو شخص بھی یہ آواز سنے، اس کے لئے اندر گھس جانا اور گانے کے آلات توڑنا جائز ہے، اسی طرح اگر نشہ کرنے والے افراد کی خاص آوازیں اور مخصوص کلمات اتنے بلند ہو جائیں جس کو راستے میں گزرنے والے افراد بھی سن سکیں تو اس کو "گناہ کا اظہار" سمجھا جائیگا جو کہ احتساب کا موجب ہے۔"

ذکر کردہ اُصول سے معلوم ہوا کہ اگر کسی منکر کے اثرات لوگوں تک پہنچتے ہوں تو اس پر نکیر کرنا ضروری ہے، اس کو خفیہ گناہ سمجھ کر نہیں چھوڑا جا سکتا، مثلاً اگر کسی مکان سے باہر گانے بجانے کی آواز آرہی ہو، یا شراب وغیرہ حرام نشہ آور اشیاء کی بو کہی سے آرہی ہو اور اندر سے حالت نشہ کی مخصوص صدائیں بھی بلند ہو رہی ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شراب پی جارہی ہے تو ایسی صورت میں نہی عن المنکر کرنا چاہئے، جب اس گناہ کے علامات وقرائن درودیوار سے متجاوز ہو کر لوگوں کو بھی اپنے منحوس لپیٹ میں لینے لگے تو اس پر نکیر کرنا ضروری ہے۔

علامہ ابن مفلح مقدسی حنبلی (المتوفی ۷۶۳ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں پہلو کی خوب وضاحت کی ہے، ان کی بات پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"معتقد ابن عقیل نامی کتاب میں ہے کہ جو معاصی ظاہر نہ ہو اس کی تلاش نہ کرے، امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر میں چھپ کر گناہ کرے اور اپنا دروازہ بند کردے، تو اس کی تجسس کرنا (اور کھوج

میں پڑنا) ناجائز ہے، تاہم اگر وہ خود اس کا اظہار کرے مثلاً گانے بجانے کے آواز (اتنا تیزی بجائے کہ باہر لوگ بھی سن سکیں) تو جو شخص بھی یہ آواز سنے، اس کیلئے جائز ہے کہ اندر گھس کر آلات کو توڑ ڈالے، اسی طرح اگر شراب کی بدبو پھیل جائے تو صحیح قول کے مطابق نکیر کرنا درست ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ ولید بن عقبہ کے داڑھی سے شراب ٹپک رہا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ ہمیں تجسس سے (شرعاً) منع کیا گیا، اگر کوئی بات خود بخود ظاہر ہو گی تو ہم اس پر مؤاخذہ کریں گے۔ اور جو شخص راستے میں گانے کی آواز سنے اس کے بارے میں حضرت جعفر سے منقول ہے کہ (اس حد تک ظاہر کرنے سے) معصیت ظاہر ہو چکی، اب سننے والے پر نکیر کرنا ضروری ہے، اور اس کی رائے میں ڈرم وغیرہ آلات معصیت کی آواز پر بھی نکیر کرنا ضروری ہے۔" [1]

تیسری شرط: منکر کا فی الحال موجود ہونا

نہی عن المنکر کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس برائی سے کسی کو روکا جا رہا ہو وہ منکر فی الحال موجود ہو، اگر کوئی منکر ماضی میں ختم ہو چکا ہو یا آئندہ ہونے کی توقع ہو تو اس کی بنیاد پر کسی خاص شخص پر نکیر کرنا درست نہیں ہو گا، کیونکہ سابقہ کاروائی پر نکیر کرنا یا تو تعزیر اور سزا ہے جو ارباب حکومت کی ذمہ داری ہے، یا عار دلانا اور طعن دینا ہے جو کہ ممنوع ہے اسی طرح کسی کو ایسی سزا دینا کہ مستقبل میں کسی

[1] الآداب الشرعية والمنح المرعية، فصل في إنكار المنكر الخفي والبعيد والماضي، 1 / 261

امر ممنوع کا ارتکاب نہ کرے یہ بھی حکومت ہی کا فرضِ منصبی ہے، افراد و رعایا اس کے مجاز نہیں ہیں، جب کہ نہی عن المنکر ایک عبادت ہے جس کا ہر مسلمان مکلف ہے اسلئے نہی عن المنکر کے سلسلہ میں یہ شرط لگائی گئی کہ ارتکاب کے وقت روکا جائے۔

البتہ اگر کسی شخص کے بارے میں غالب گمان ہو کہ کسی منکر کا ارتکاب کرے گا تو اس کو زبانی طور پر ترغیب دینے اور متوقعہ گناہوں کے نقصانات و مفاسد بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ماضی کے منکرات پر نکیر کرنا

ماضی میں جو معاصی و منکرات کسی سے صادر ہوئے، اس پر نکیر کرنا درست نہیں، بلکہ حتی الامکان اس پر پردہ ڈالنا چاہیئے کہ ایک مسلمان کے انفرادی عیوب و نقائص کو چھپانے کے بہت سے فضائل احادیث صحیحہ میں موجود ہیں، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مواقع پر اس کی ترغیب دی ہے، خصوصاً جب کہ کرنے والا اس سے توبہ و ندامت بھی اختیار کر چکا ہو کہ ایسی صورت میں اس پر نکیر کرنا بالکل غلط اور خلافِ مصلحت بلکہ کئی ایک شرعی اور معاشرتی مفاسد کا پیش خیمہ ہے، اسلئے اس سے بچنا ضروری ہے، حدیث شریف میں ہے" التائب من الذنب کمن لاذنب له"۔

ایک انوکھا اشکال اور اس کا جواب

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بعض حضرات کو اس تحقیق پر اشکال ہے، اشکال کی وجہ وہ روایت ہے جس میں سیدنا حضرت آدم اور سیدنا حضرت موسی (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا باہمی مکالمہ مذکور ہے، اس میں حضرت موسی بسم اللہ الرحمن الرحیم نے حضرت آدم بسم اللہ الرحمن الرحیم پر انکار کیا کہ آپ کی وجہ سے ہم جنت سے نکالے گئے، یہاں

گویا حضرت موسی ﷽ نے سابقہ گناہ کی بنیاد پر نکیر کیا، جس سے معلوم ہوا کہ ماضی میں کیئے گئے گناہوں پر بھی نکیر کرنا ضروری ہے۔

اس اشکال کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ روایت ذکر کردی جاتی ہے، تاکہ اس کو سمجھنا آسان رہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

"عن النبي ﷺ قال: " احتج آدم وموسى، فقال له موسى: يا آدم أنت أبونا خيبتنا وأخرجتنا من الجنة، قال له آدم: يا موسى اصطفاك الله بكلامه، وخط لك بيده، أتلومني على أمر قدره الله علي قبل أن يخلقني بأربعين سنة؟ فحج آدم موسى، فحج آدم موسى " ثلاثا۔"

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدم اور موسیٰ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بحث کی ،چنانچہ موسیٰ نے کہا اے آدم، آپ ہمارے باپ ہیں، ہمیں آپ نے محروم کیا اور جنت سے نکلوایا، آدم ﷽ نے کہا اے موسی، تم کو اللہ نے اپنے کلام کے ذریعہ برگزیدہ بنایا اور اپنے ہاتھ سے تمہارے لئے لکھا تم مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہو جو اللہ نے میری تقدیر میں میری پیدائش سے چالیس سال پہلے لکھ دیا تھا؟ چنانچہ آدم موسیٰ ﷽ پر اس بحث میں غالب رہے، یہ تین بار آپ نے فرمایا۔"[1]

اس حدیث میں تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے درجہ بالا دعوی پر استدلال کرنا درست نہیں، استدلال درست نہ ہونے کی بعض وجوہات مندرجہ ذیل

[1] صحيح البخاري،كتاب القدر،باب تحاج آدم وموسى عند الله، رقم الحديث: 6614

ہیں:

۱: کہ یہاں حضرت موسی ﷷ حضرت آدم ﷷ پر گندم کھانے کی وجہ سے نکیر نہیں فرما رہے، کیونکہ جب حضرت موسی ﷷ کو بھی علم ہے کہ ان کی توبہ قبول ہو چکی ہے، بارگاہ خداوندی سے "فتلقی آدم من ربه کلمات" کا اعلان ہو چکا، تو اب ان پر نکیر کرنا درست ہی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے "التائب من الذنب کمن لاذنب له" گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

یہاں تو معمولی لغزش تھی، اور پھر صرف توبہ ہی نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس توبہ کو قبول کرنے کا انعام اور پھر اس کا اعلان بھی فرمایا، اس سب کچھ کے بعد بھی نکیر کرنے کا کیا معنی؟۔

۲: اگر حضرت موسی ﷷ کے اس کلام کو نکیر وانکار ہی تصور کریں، تو بھی اشکال ہوتا ہے کہ حضرت آدم نے اس کے جواب میں تقدیر کو کیوں حجت بنایا؟

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کو گناہ کیلئے آڑ بنانا اہل الحاد اور باطل لوگوں کا رویہ اور شیوہ رہا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

"سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّى ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (148) قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ۔"

"اب مشرک کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ اُنہوں نے ہمارا عذاب چکھا کہہ دو تمہارے ہاں کوئی ثبوت ہے تو اسے ہمارے سامنے لاؤ تم فقط خیالی باتوں پر چلتے ہو اور صرف تخمینہ ہی کرتے ہو۔ کہہ دو پس اللہ کا الزام پورا ہو چکا پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا۔ "(ترجمہ از حضرت لاہوری صاحب)[رحمۃ اللہ علیہ [1]]

ایک دوسری جگہ بھی یہی ارشاد ہے:

"وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔"

"اور مشرک کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور اس کے حکم کے سوا ہم کسی چیز کو حرام نہ ٹھیراتے اسی طرح کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے "۔[2]

حضرت آدم بسم اللہ الرحمن الرحیم جیسی معصوم شخصیت کے بارے میں یہ احتمال یقیناً غلط ہے، اسلئے معلوم ہواکہ یہاں حضرت موسی بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مقصود نکیر کرنا نہیں۔

---

[1] الأنعام : 148 ، 149

[2] سورة النحل، ٣٥

۳: اگر حضرت موسی ﷺ کے اس کلام پر سنجید گی سے غور کیا جائے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے، موسی ﷺ کا سوال یہ تھا "یاآدم أنت أبوناخیبتنا وأخرجتنا من الجنة" یہاں گندم کھانے یا "گناہ" کرنے کا کوئی ذکر نہیں، نہ ہی حضرت موسی ﷺ دار التکلیف میں ہیں کہ حضرت خضر کی طرح حضرت آدم پر بھی نکیر فرمائیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت موسی دراصل انسانیت کی حرمان وخسران پر اظہار افسوس کررہے ہیں، کہ اے آدم: آپ کی وجہ سے انسانیت کس ذلت کا شکار ہوئی، کہ جنت سے نکال کر دنیا کے مصائب کے دلدل میں پھنس گئی، یہاں گناہ یا اس پر نکیر کرنا مقصود ہی نہیں، بلکہ اپنا درد دل اپنے جدامجد کے سامنے رکھنا ہے، اگر نکیر کرنا ہی پیش نظر تھا تو " لم أكلت؟ " "كيف أكلت والله نهاک؟" وغیرہ الفاظ استعمال کرتے، یا وہی الفاظ دہراتے جو آپ نے حضرت خضر پر نکیر کرتے ہوئے کہے تھے۔

چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

"هذا الحديث ضلت فيه طائفتان: طائفة كذبت له لما ظنوا أنه يقتضي رفع الذم والعقاب عمن عصى الله لأجل القدر، وطائفة شر من هؤلاء جعلوه حجة. وقد يقولون القدر حجة لأهل الحقيقة الذين شهدوه، أو الذين لا يرون أن لهم فعلا۔ وكل هذا باطل. ولكن وجه الحديث أن موسى عليه السلام لم يلم أباه إلا لأجل

المصيبة التي لحقتهم من أجل أكله من الشجرة، فقال له: لما أخرجتنا ونفسك من الجنة؟ لم يلمه لمجرد كونه أذنب ذنبا وتاب منه، فإن موسى يعلم أن التائب من الذنب لا يلام، وقد تاب منه أيضا، ولو كان آدم يعتقد رفع الملام عنه لأجل القدر لم يقل: {ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين}۔"[1]

"اس حدیث کے متعلق دو قسم کے لوگ راہ راست سے پھر گئے، ایک (طرف)وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس بناء پر سرے سے حدیث ہی کا انکار کیا کہ اس کا منشأ تقدیر کے بہانے گناہ گار لوگوں سے سزا و مذمت ختم کرنا ہے، اور دوسری (طرف وہ) لوگ ہیں جو ان سے بدتر ثابت ہوئے جنہوں نے اس حدیث کو دلیل بنایا، اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ تقدیر ان اہل حقیقت کیلئے حجت ہے جنہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہو، یا جو لوگ افعال کو اپنے (اپنی طرف سے صادر ہونے والے) نہیں سمجھتے۔۔

(حقیقت میں) یہ سب باتیں غلط ہیں، حضرت موسی (علیہ السلام) نے اپنے جدامجد کو صرف اس تکلیف و مصیبت کی وجہ سے ملامت کیا جو ان کے خاص درخت کھانے کی وجہ سے انسانوں کو جھیلنا پڑی، (گویا) موسی علیہ السلام نے یہ کہا کہ آپ نے اپنے آپ کو اور ہم سب کو جنت سے کیوں نکالا؟ حضرت موسی علیہ السلام کے ملامت کرنے کی بنیاد صرف وہ گناہ نہیں جس سے (حضرت آدم) توبہ

---

[1] الفرقان بين أولياء الرحمن وأولياء الشيطان، حديث " احتج آدم وموسى"، ص134

کر چکے تھے کیونکہ حضرت موسی بسم الله الرحمن الرحيم کو معلوم تھا کہ جو شخص کسی گناہ سے توبہ کرے اس کو ملامت نہیں کیا جا سکتا، اور حضرت آدم بسم الله الرحمن الرحيم بھی اگر تقدیر کو آڑ بنانا چاہتے تو یہ دعا ہر گز نہ کرتے "کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کرینگے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

۴: اگر حضرت موسی کا مقصود اس کلام سے نکیر کرنا ہی تھا تو بھی جب خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ سنایا" فحج آدم موسی "کہ حضرت آدم بسم الله الرحمن الرحيم حضرت موسی بسم الله الرحمن الرحيم پر غالب ہو گئے، تو اس فیصلہ کے بعد حضرت موسی کے کلام سے استدلال کرنا کیونکر درست ہو گا۔

علامہ قرطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ صحیح مسلم کی شرح "المفھم" میں تحریر فرماتے ہیں:

إنما توجهت حجته عليه لأنه قد علم من التوراة ما ذكروا: إن الله تاب عليه واجتباه وأسقط عنه اللوم والعتب، فلوم موسي وعتبه له مع علمه بأن الله قدر المعصية و قضي بالتوبة و بإسقاط اللوم والمعاتبةحتي صارت تلك المعصية كأن لم تكن، وقع غيرمحله وعلي غيرمستحقه، وكان هذا من موسي نسبة جفاءفي حالة صفاءكما قال بعض أرباب الإشارات ذكر الجفاء في حال

الصفاء جفاء، وهذا الوجه أشبه ما ذكر إنشاءالله۔" [1]

"حضرت آدم کی دلیل اسلیئے کام کرگئی کہ حضرت موسی کو تورات میں ذکر کردہ یہ باتیں معلوم تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انکی توبہ قبول کی ان کو منتخب کیا اوران سے لوم وعتاب ختم کردیا، تو موسی ﷺ کا ان سب باتوں کے باوجود ان کو ملامت بیجا اور غیر مستحق کو ملامت کرنا ہے،(اور یہ حضرت موسی ﷺ کی کوئی دانستہ غلطی نہ تھی بلکہ) حضرت موسی کا یہ کہنا صفاء کی حالت میں جفاء کی نسبت کرنے کے مترادف ہے جیساکہ اہل حقیقت فرماتے ہیں کہ صفاء (بسط) کی حالت میں جفاء(قبض) کا تذکرہ کرنا خود جفاء(قبض) ہے، اور انشاءاللہ مذکورہ توجیہات میں سے یہ توجیہ بڑی مناسب ہے۔ "

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عام افراد کیلئے بلاوجہ کسی کے ماضی کا احتساب کرنا، اس کے منکرات اور گناہوں پر نکیر وانکار کرنے کا اختیار حاصل نہیں، یہ عقاب وعتاب درحقیقت اس فعل کی سزا ہے جس کی ذمہ داری ارباب حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

تاہم اگر کسی نے تقریر یا تحریر میں کسی غلط نظریہ یا باطل عقیدہ کا اظہار کیا اور ابھی تک اس کا توبہ یا رجوع سامنے نہ آیا ہو بلکہ قرائن بتارہے ہوں کہ ابھی تک وہ اسی نظریہ پر ڈٹا ہے تو ایسی صورت حال میں اس پر نکیر کرنا بالکل درست ہے، اور یہ در حقیقت صرف ماضی کے فعل پر نکیر نہیں، بلکہ موجودہ نظریہ پر رد کرنا ہے۔

اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو، مثلا داعی کو کسی شخص کے متعلق یقین ہے کہ کہ ماضی میں اس نے منکرات کا ارتکاب کیا تھا، لیکن اس کے بعد اس کی توبہ و

---

[1] المفهم، ج ٦ ص ٦٦٨

رجوع معلوم ہو تو اس کے بعد ماضی کے منکرات یاد دلانا یا اس کو بنیاد بنا کر عار دلانا اور بدنام کرنا نہی عن المنکر ہر گز نہیں، بلکہ اب کرنا سخت گناہ اور بالکل حرام ہے احادیث میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ اس لئے اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔

آئندہ ہونے والے منکر پر نکیر کرنا

جو منکر ابھی وجود میں نہیں آیا اس کی بنیاد پر کسی خاص شخص پر درج بالا طریقہ سے نکیر کرنے کی ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر اس میں بلاوجہ کسی مسلمان پر بدگمانی شاملِ حال رہتی ہے، ممکن ہے اس کا ارادہ ہی منکر کرنے کا نہ ہو، یا ارادہ تو ہے لیکن مسئلہ اور حکم شرعی کا علم نہیں اسلئے ارادہ کر بیٹھا، یا کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ رک جائے۔

اس پر نکیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا نکیر کرنے والے کو علم ویقین ہے کہ مخاطب یہ کام کر بیٹھے گا، یہ چونکہ ایک گونا بدگمانی ہے اسلئے شرعا اس کو منع کیا گیا۔

لیکن اگر کہیں منکر کرنے کا پختہ عزم کیا گیا، اس کے تمام اسباب وسائل اکھٹے کردئے گئے، پروگرام طے کر دیا گیا، تاریخ وغیرہ اُمور متعین ہو چکے، محض مقررہ تاریخ آنے کی دیر ہے، تو ایسی صورت میں مسئلہ کے دونوں پہلو پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق نکیر کرنا ضروری قرار دیا جائے، کیونکہ یہاں نکیر کرنے والے مردِ مومن کی طرف سے بدگمانی کا کوئی اقدام نہیں پایا جاتا۔

نیز جہاں منصوبہ اس حد تک نہ بنا ہو، منکر کرنے کے اتنے قوی شواہد اور ٹھوس علامات موجود نہ ہوں، لیکن کسی کے بارے میں اس طرح کام کرنے کا شبہ ہو اور اس کی کوئی بنیاد بھی موجود ہو گو پہلے کی طرح یقینی نہ ہو، تو ایسی صورت میں بہتر یہ

ہے کہ حکمت و مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو نرم اور خیر خواہانہ لب ولہجہ سے سمجھادیا جائے، لیکن اس کے بارے میں بدگمانی نہ کی جائے اور نہ ہی اس کو یہ تاثر دیا جائے کیونکہ یہ بلادلیل بدگمانی اور دل آزاری ہے جو کہ شرعاً ممنوع و مذموم ہے، نیز عام طور پر ان جیسے مواقع میں خطاب خاص کے بجائے عمومی خطاب زیادہ کار گر ثابت ہوتا ہے اور جہاں کہیں خصوصی خطاب کی نوبت پیش آئے بھی تو وہاں ایسا انداز اختیار کر لینا چاہیے جس کے ساتھ مخاطب غیر شعوری طور پر متنبہ ہو جائے تنقید، اتہام اور رد و قدح کا طرز اپنانا غیر معقول اور خطرناک ہے جس کے نتیجہ میں کئی منکرات پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ منکر ابھی سامنے نہیں آیا بلکہ اس کی تیاری اور مقدمات چل رہے ہیں، لیکن تیاری بھی ناجائز اُمور پر مشتمل ہوتی ہے، ایسی صورت میں اس بڑے برائی کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی نکیر کرنا ضروری ہے، بڑے منکر سامنے آنے کا انتظار کرنا کوئی ضروری ہے۔

علامہ عبدالقادر عودہ شہید رحمۃ اللہ علیہ اس شرط کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "دوسری شرط یہ ہے کہ منکر فی الحال موجود ہو یعنی منکر پر نکیر کرنے اور اس کو ختم کرنے کے وقت وہ موجود ہو اور مخاطب اس کا ارتکاب کر رہا ہو، مثلاً شراب پی رہا ہو یا نامحرم عورت کے ساتھ خلوت میں بیٹھا ہو (تب ہی نکیر کرے ورنہ) جب وہ معصیت سے فارغ ہو جائے تو اس کے بعد نہی عن المنکر کا کوئی موقع نہیں بلکہ اب تو صرف اس معصیت پر سزا کا موقع ہے جو کہ حکومت کا حق ہے عام افراد کا نہیں۔ لہٰذا (اگر معصیت ختم ہو جانے

کے بعد) کسی نے (نہی عن المنکر کی غرض سے) گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو اپنے قول و فعل سے کوئی تکلیف پہنچائی اس کو گالم گلوچ دیا یا زخمی کیا تو یہ جرم شمار ہو گا، حالانکہ اگر عین معصیت کے ارتکاب کے وقت اگر ایسا کرتا اور وہ جرم بھی ایسا تھا جو اس اقدام کا تقاضا کر رہا تھا تو اس کا یہ فعل جرم نہ تھا بلکہ یہ اس کی ذمہ داری تھی اسلئے (اس کو مجرم نہیں بلکہ) امر بالمعروف کرنے والا اور منکر کو ختم کرنے والا سمجھا گیا۔

جب کوئی معصیت متوقع ہو مثلا کوئی دستر خوان تیار کر رہا ہو اور شراب پینے کیلئے تیاری کے طور پر مجلس سجا رہا ہو تو اس کو صرف وعظ و نصیحت ہی کی جا سکتی ہے، اس سے بڑھ کر اقدام جرم شمار ہو گا مثلا سخت کلامی یا گالم گلوچ وغیرہ۔ بلکہ اگر وہ شراب پینے کے ارادے کا انکار کرے تو (اس خیال کے تحت) وعظ و نصیحت بھی درست نہیں کیونکہ اس میں مسلمان پر بد گمانی ہے۔"[1]

---

[1] التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي، الباب الثالث، المبحث الأول، 502/1

جس شخص پر نکیر کی جارہی ہو اس کے اعتبار سے شرائط کا بیان

جس شخص کو برائی سے منع کیا جارہا ہو اس کیلئے اتنا کافی ہے کہ وہ انسان ہو، تاکہ اس کے فعل کو منکر کہا جاسکے، مکلف ہونا بھی ضروری نہیں، جیسا کہ لفظ "معروف" "منکر" کے تعارف میں تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے، کہ بعض اوقات نابالغ بچے اور مجنون کے کسی منکر پر نکیر کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ یہ دونوں غیر مکلف ہیں، مگر چونکہ انسانیت میں شریک ہیں، اسلئے نکیر کی جاتی ہے۔

علم کے باوجود معصیت کرنے والے پر نکیر کا حکم

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے معصیت پر تب ہی نکیر کرنا ضروری ہے جب خود اس کو مسئلے کا علم نہ ہو، اگر خود اس کو معلوم ہو کہ یہ کام جائز نہیں اور اس کے باوجود اس کا ارتکاب کر رہا ہے تو اس کو منع کرنا ضروری نہیں، چنانچہ بہت سے عوام و خواص اسی بنیاد پر متعدد مواقع پر صرف اسلئے نکیر نہیں کرتے کہ ان کی خیال میں مخاطب جاننے اور مسئلہ کا حکم سمجھنے کے باوجود ایسا کر رہا ہوتا ہے۔

لیکن یہ تصور بالکل درست نہیں، مسلمان کیلئے شرعاً یہ ضروری ہے کہ اگر وہ اپنے سامنے کوئی منکر ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو منع کرے، منکر کرنے والے کو اس فعل کے ناجائز ہونے کا علم ہو یا نہیں دونوں صورتوں میں اس ذمہ داری پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جو نصوص ابتداءِ کتاب میں ذکر ہو چکی ہیں ان میں اس قید کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

نیز اگر اس کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر زبانی وعظ و نصیحت کے بعد نہی عن المنکر کے جتنے درجات و مراحل ہیں، سب یوں ہی بیکار پڑ جائیں گے، کیونکہ جب زبانی طور پر منع کرنے سے اس کو علم ہوا اور اس کے باوجود وہ رک نہیں رہا، تو داعی پر خواہ مخواہ ہاتھ سے روکنے کی ذمہ داری کیوں ڈالی جائے؟

امر اور نہی کے مراتب و شرائط

امر اور نہی کرنے کے کچھ خاص مراتب ہیں، جن کی رعایت رکھنا ضروری ہے، اصل مقصود چونکہ برائی کو روکنا یا کم کرنا ہے، اسلئے جس طریقہ سے یہ مطلوب حاصل ہو جائے، اسی پر اکتفاء کرنا ضروری ہے، اس کے بعد والے مرتبہ کو آزمانا درست نہیں ہے۔ ہم علی الترتیب یہ مراتب ذکر کرتے ہیں:

1. مخاطب کو اصل مسئلہ سمجھانا۔
2. نرم لب و لہجہ سے نصیحت کرنا۔
3. حقیقت اور تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے سخت کلام کرنا۔
4. ہاتھ سے اس منکر کو ختم کرنا۔
5. مار پیٹ کی دھمکی دینا۔
6. ہاتھا پائی کرنا۔
7. اسلحہ کے زور سے ڈرانا۔
8. منکر کے ازالہ کیلئے اعوان و انصار کو جمع کرنا۔

پہلا درجہ

جب کسی کو منکر کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو سب سے پہلے اس کو اصل مسئلہ سے آگاہ کرنا ضروری ہے، برائی کی حقیقت اس پر ظاہر کر دی جائے، کیونکہ بسا اوقات گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو مسئلہ کا علم نہیں ہوتا اور اسی ناواقفیت کی وجہ سے وہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، اگر اس کو نرمی کیساتھ اصل مسئلہ سمجھا دیا جائے تو وہ اس

منکر کو چھوڑ دیتا ہے، اسلئے ضروری ہے کہ باقی درجات سے پہلے اس کو اصل مسئلہ بتادیا جائے۔

آج کل چونکہ معاشرہ میں دینی علوم وفنون کی کمی ہے، دینی مطالعہ کا رجحان مفقود ہوتا چلا جارہا ہے، اہل علم کی مجالس میں شرکت کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے، اسلئے عام طور پر منکر کا ارتکاب کرنے کا ایک بڑا سبب بے علمی اور ناواقفیت ہے، خصوصاً عبادات کے سلسلہ میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں کہ عبادت کرنے کے باوجود اس کے سنن و آداب بلکہ فرائض واجبات تک کا خیال نہیں رکھا جاتا، اسی طرح غیر شعوری طور پر بہت سے منکرات و معاصی کا بھی ارتکاب ہوتا ہے جس میں کرنے والے کو دین و دنیا کا کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا جن کو گناہ بے لذت کہنا زیادہ موزون ہے، یہ سب کچھ دین اور اہلِ دین سے دوری، علم اور علماء سے لاتعلقی ہی کا ثمرہ ہے، اسلئے نہی عن المنکر کرتے وقت نرمی اور حکمت و مصلحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

دوسرا درجہ: نرم لب ولہجہ سے نصیحت کرنا

اگر کوئی شخص مسئلہ کا علم ہونے کے باوجود گناہ کر رہا ہو یا مسئلہ بتائے جانے کے بعد بھی وہ اپنے منکر سے باز نہ آئے بلکہ بدستور اس کو جاری رکھے، تو تیسرا درجہ اور طریقہ یہ ہے کہ اس کو وعظ و نصیحت کی جائے۔

دعوت دینے کے متعلق حضرات انبیاء کرام ؑ کی سنت

اس سلسلہ میں انبیاء کرام ؑ کی سنت یہ رہی ہے کہ بڑی شفقت آمیز اور نرم لب ولہجہ کیساتھ حقیقتِ حال واضح کردی جائے، ایسی ہر پہلو سے مکمل

اجتناب کیا جائے جس سے مخاطب میں شرم وانتقام یا ضداور مدافعت کا جذبہ ابھر آئے کیونکہ اصل مقصود منکراور برائی کو ختم کرنا ہے۔

لہٰذا اس کیلئے ایسے وسائل اختیار کرنا ضروری ہے جس سے وہ روکنے والے کو اپنا خیر خواہ سمجھے، اس کی بات سن کروہ ازخود گناہ سے باز آجائے، ایسے ہر طریقہ کار سے گریز کرنا چاہئے جس سے مخاطب کے نفسیات میں ایسی جذبات کی تخم ریزی ہو جس کا پھل اس کے حق میں مضر یا غیر مفید ثابت ہوسکے، اور جس کی وجہ سے جذبات یا تعصب میں آکر دعوت حق کرنے سے انکار کرے۔

نرم لب ولہجہ کی ضرورت ماہرین نفسیات کی نظر میں

حکماء اور ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ دوسروں کو مسئلہ سمجھانے کا لازمی مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ مخاطب اس سے ناواقف یا جاہل ہے، اور انسان طبعی طور پر اپنی طرف جہل کی نسبت برداشت نہیں کر سکتا، اسلئے سمجھانے والے کو انسان کی اس طبیعت کا خیال رکھنا چاہئے، مخاطب کو اپنی برتری اور اس کے جہل کا احساس نہ دلائے، بلکہ ایسا اسلوب نگارش اپنائے جس سے اس جذبہ کی ذرا برابر آبیاری نہ ہو ورنہ خطرہ ہے کہ برائی ختم ہونے کے بجائے مزید فساد پیدا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جب موسی اور ہارون لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ فرعون کی طرف مبعوث بنا کر بھیجا تو فرمایا" فقولا له قولا لينا"۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ موسی وہارون لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ زیادہ داعی اور پاکباز نہیں، ہمارے مخاطب فرعون سے زیادہ کافر نہیں، جب ان حضرات کو نرم گفتگو اختیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے تو ہم

کیوں اس اکسیر کو ہاتھ سے جانے دے۔

تیسرا درجہ: حقیقت اور تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے سخت کلام کرنا

اگر نرمی کیساتھ سمجھانے سے مخاطب گناہ سے باز نہ آئے، بلکہ ہنوز اپنے منکر کو جاری رکھے تو ایسی صورت حال میں کسی قدر سخت اور درشت لہجہ سے پیش آنا چاہئے، لیکن اس میں یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ درشت لہجہ سے گالی دشنام دینا مراد نہیں، نہ ہی ضرورت سے زیادہ سخت کلام کرنا مقصود ہے، بلکہ حدود میں رہتے ہوئے بقدر ضرورت کوئی ایسا سخت کلمہ استعمال کرے جو مخاطب کے دل میں اثر کرے اور یوں وہ برائی سے باز آجائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم جب بار بار سمجھانے کے باوجود سدھر نہیں آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مخاطب بنا کر فرمایا" أف لکم" یہ ہے سخت کلام کی حقیقت۔ کہ نہ تو ضرورت سے زائد چرب زبانی ہے نہ ہی گالی کا نام ونشان ہے بلکہ غم ودرد سے بھرپور ایک صدا ہے جس میں بے مثال شفقت ورحمت پنہاں ہے، یہی انبیاء کرام ؑ کا طریقہ دعوت اور اندازِ نکیر ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں عوام اور خواص میں یہ مرض بڑھتا جارہا ہے کہ ایسی مواقع پر مخاطب کو گالیاں تک دی جاتی ہیں، یہ طریقہ کار بالکل غلط ہے، گالی بذات خود ایک منکر اور ناجائز امر ہے، یہ کیا عقل ودانش ہے کہ ایک منکر سے روکنے کیلئے کئی ایک برائیوں کا ارتکاب کرنا پڑے! اور پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ مخاطب بھی انسان ہے جو اپنے اندر انتقام کی حرارت رکھتا ہے، وہ بھی بدلہ لینے کے جذبہ سے سرشار ہو کر گالیوں ہی سے نوازتا ہے، اسی طرح ایک منکر کو ختم کرنے کے بجائے منکرات کا ایک انبار لگ

جاتا ہے، اس طرح نکیر کرنا ہر گز جائز نہیں، بلکہ یہ طریقہ کار بجائے خود قابل نکیر و اصلاح ہے۔

چوتھا درجہ: ہاتھ سے اس منکر کو ختم کرنا

منکرات کی ایک قسم وہ ہے جن کا تعلق صرف دل یا زبان کیساتھ ہوتا ہے، اس میں تو ہاتھ سے روکنے کی کوئی صورت نہیں، البتہ برائی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو صرف کرنے والے کے ذات کیساتھ ہی متعلق نہیں ہوتے، بلکہ آلات واشیاء وغیرہ کسی مادے کیساتھ بھی ان کا ربط ہوتا ہے، اس دوسری قسم منکرات کو ختم کرنے میں اگر نکیر کرنے کے سابقہ تمام درجات اور طرق کار آمد ثابت نہ ہوں، مثلاً مخاطب اصل مسئلہ بتانے، نرمی کیساتھ وعظ ونصیحت کرنے اور سخت کلامی سے باز نہ آئے بلکہ خیر خواہی کے ان تمام مظاہر کو کچل ڈالے اور اللہ کے نافرمانی سے دور نہ ہو تو ایسی صورت میں نکیر کرنے والے کو اختیار ہے کہ گناہ کے ان آلات کو توڑ ڈالے۔

مثلاً کوئی شراب پی رہا ہے، نکیر کرنے والے نے گزشتہ تمام حربیں آزمالئے، لیکن اس اللہ کے بندہ نے سب کو سنی ان سنی کر دیا اور پینے پر آمادہ ہے تو اس صورت میں اگر ہو سکے تو شراب بہادے، اگر برتن تنگ ہے بہانے میں زیادہ وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے یا مخاطب کے قابو کرنے کی وجہ سے نہ بہانے جاسکنے کا ڈر ہو تو ان جیسی صورتوں میں برتن کو توڑ ڈالنا بھی جائز ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بندہ خدا گانے بجانے کے تمام آلات لئے ہوئے گانا گانے/سننے میں غرق ہے تو نہی عن المنکر کرنے والے کو اولاً سابقہ تمام درجات استعمال کرنے چاہیئے، لیکن اگر کوئی ان تمام تر نصیحت وخیر خواہی کے باوجود رک نہ جائے اور اللہ

تعالیٰ کی نافرمانی کو جاری رکھے، اللہ و رسول کا کچھ پاس نہ رکھے تو ایسی صورتوں میں داعی کیلئے یہ چوتھا طریقہ بھی وجود میں لانا چاہئے کہ ہاتھ سے ان آلات کو توڑ ڈالے، اس درجہ کو کام میں لانے سے منکر لامحالہ ختم ہو جائیگا۔

ہاتھ سے معصیت روکنے کے لئے دو بنیادی شرائط

لیکن اس درجہ کو استعمال کرنے کیلئے دو شرائط ہیں:

۱۔ پہلی شرط تو یہی ہے کہ اس سے تب ہی کام لیا جائے جب کوئی داعی سابقہ تمام درجات آزما چکا ہو اور وہ کارآمد ثابت نہ ہوں، اگر ان میں سے کسی حکمت عملی کے ساتھ منکر ختم ہو سکتا ہو تو یہ درجہ استعمال کرنا بالکل جائز نہیں ہو گا، کیونکہ مقصود منکر ختم کرنا ہے جو کہ ہو چکا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں قدرِ ضرورت سے کام لیا جائے، ضرورت سے زیادہ ہاتھ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر شراب بہالینے سے کام چل سکتا ہے تو برتن نہ توڑ ڈالے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے دوسرے کی زمین پر ناحق غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور زبانی وعظ و نصیحت نرمی و سختی کسی طرح وہ قبضہ ختم نہیں کر رہا تو نکیر کرنے والا اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی وہاں سے نکالے، اگر اس طور پر نکالنا ممکن ہو تو کان سے پکڑنا یا کھینچ اور گھسیٹ کر نکالنا جائز نہیں ہو گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم کو سمجھانے اور بت پرستی چھوڑنے کیلئے طرح طرح کا اسلوب اختیار کیا، نرمی و سختی ہر ڈھنگ سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن قوم نے ان تمام کوششوں پر اپنی حد تک پانی پھیر دیا اور بت پرستی کو زور و شور کیساتھ جاری و باقی رکھا، بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ہی

مبارک ہاتھوں سے ان کے بتوں کو توڑ ڈالا، قرآن کریم نے اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا:

"تَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ (57) فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ۔"

"اللہ کی قسم میں تمہارے بتوں کا علاج کروں گا جب تم پیٹھ پھیر کر جا چکو گے۔ پھر ان کے بڑے کے سوا سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ اس کی طرف رجوع کریں"۔[1]

ایک ضروری قید

اس سے معلوم ہوا کہ داعی ہاتھ کو بھی استعمال کر سکتا ہے، تاہم اس سلسلہ میں وہ بات یاد رکھ لینی چاہئے جو تمہید کے ضمن میں ذکر ہو چکی کہ نہی عن المنکر کے جواز کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ نکیر کرنے کی صورت میں اس سے زیادہ مفاسد پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو ورنہ نہی المنکر جائز نہیں۔

لہٰذا ان تمام درجات میں یہ قاعدہ ملحوظ رہے۔ آج کل چونکہ دینی مزاج ومذاق کی کمی ہے، مادیت کا دور ہے اسلامی اخلاق واقدار کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی، رضائے خداوندی کی خاطر تحمل وبرداشت اور عفو ودرگذر کرنے کا جنازہ نکلنے کو ہے، اسلئے بعض اوقات اس طرح کرنے سے کافی مفاسد ومشکلات پیدا ہو جاتے ہیں، ایسی صورت حال میں احتیاط رکھنی چاہئے، ایک منکر کو ختم کرنے کیلئے اس سے بڑھ کر مفاسد ومنکرات کو گوارا کر لینا کوئی دینی خدمت یا عقل سلیم کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] سورة الأنبياء، رقم الآية: 57،58

پانچواں درجہ: مارنے پٹائی کرنے یا پھر قتل کرنے کی دھمکی

منکر کو ختم کرنے کیلئے بعض اوقات اس کی بھی ضرورت پیش آتی ہے کہ مثلاً منکر کا تعلق صرف زبان واعضاء ہی کے ساتھ ہے، نکیر کرنے والے نے روکنے کے لئے درج بالا سب حربے آزمالئے، لیکن مخاطب پھر بھی برائی کرنے سے رک نہیں رہا، تو ایسی صورت میں داعی کو چاہیئے کہ اولاً اس کو مارنے اور پٹائی کرنے کی دھمکی دیدے، اگر اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو قتل کرنے کی بھی دھمکی دے سکتا ہے، البتہ دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرنے کی صورت میں دو باتوں کا خیال رکھ لینا چاہیئے:

ایک تو یہ کہ کسی ایسے ناجائز کام کی دھمکی نہ دے جس کا کرنا شرعاً ممنوع ہو، مثلاً باپ کے گناہ کرنے پر اس کو یہ دھمکی دی جائے کہ میں آپ کے بیٹے کو ماروں گا، شوہر کے غلطی پر اس کو یوں ڈرا جائے کہ میں آپ کے بیوی کی پٹائی کروں گا، اس طرح دھمکی دینا درست نہیں، کیونکہ اگر واقعۃً دھمکی دینے والے نے بیٹے اور بیوی مارنے کا عزم کیا تو یہ گناہ ہے، باپ کے جرم کی سزا بیٹے یا شوہر کے تجاوز کرنے کی سزا بیوی کو نہیں دی جاسکتی، ہر شخص اپنے قول و فعل کی سزا خود پاتا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے بڑے واضح الفاظ میں یہ اعلان فرمایا:

" ألا لا يجني جان إلا على نفسه، ولا يجني والد على ولده، ولا ولد على والده، ألا إن المسلم أخو المسلم، فليس يحل لمسلم من أخيه شيء إلا ما أحل من نفسه۔"

" جان لو کہ انسان کے جرم کا وبال اس پر ہے سن لو انسان کے جرم کا وبال نہ اس کے اولاد پر ہے اور نہ باپ پر، سن لو کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے پس کسی مسلمان کیلئے اپنے بھائی کے حق میں

صرف وہی کچھ حلال ہے جو اپنے لئے حلال ہے۔"[1]

اور اگر داعی کا ارادہ ان اُمور کا نہ تھا صرف مخاطب کی روک تھام کیلئے اس کو استعمال کیا تو بھی درست نہیں، کیونکہ یہ اپنے ارادے اور ضمیر کی غلط ترجمانی اور خلافِ واقع کا اظہار ہے۔

دوسری اس بات کی بھی رعایت رکھنی چاہیئے کہ دھمکی دینے میں اتنے ہی مار پٹائی ذکر کرنے پر اکتفاء کرے جتنے کا ارادہ ہو، اس سے زیادہ کا اظہار نہ کیا جائے۔

مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرنے کا حکم

تاہم ہر زبان میں ان جیسے مواقع کیلئے بعض ایسے محاورات ایسے استعمال کئے جاتے ہیں، جن کا حقیقی معنی مقصود نہیں ہوتا، ہر صاحبِ زبان کو اس کا علم ہوتا ہے، ایسے کلمات کا استعمال جائز ہے یہ کذبِ ممنوع میں داخل نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: [2]

"(اور نہی عن المنکر کے) اس درجہ میں اچھا طریقہ ضروری ہے کہ اس کو کسی ایسے کام کی دھمکی نہ دی جائے جس کا کرنا جائز ہی نہ ہو، مثلاً کوئی داعی یہ کہے کہ (یہ منکر چھوڑ دو ورنہ) میں آپ کا گھر لوٹ لوں گا یا یہ کہے کہ آپ کے بچے ماروں گا یا یہ کہ میں آپ کی بیوی قید کروں گا یا اس طرح کے اور دھمکیاں، بلکہ اگر ان اُمور کا ارادہ کر کے اس طرح کہا تو یہ حرام ہے، اور اگر

---

[1] سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ما جاء دماؤكم وأموالكم عليكم حرام، 5/ 124 ت بشار

[2] إحياء علوم الدين ،باب الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، 2/ 332

ارادہ کئے بغیر (صرف ڈرانے کیلئے) کہا تو یہ کذب اور جھوٹ ہے۔"

امام بن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" وليس من الكذب المحرم ما اعتيد من المبالغة كجئتك ألف مرة؛ لأن المراد تفهيم المبالغة لا المرات فإن لم يكن جاء إلا مرة واحدة فهو كاذب، انتهى ملخصا. وما قاله في المبالغة يدل له الخبر الصحيح: «وأما أبو جهم فلا يضع عصاه عن عاتقه» ومعلوم أنه يضعها كثير۔"
ا

"مبالغہ کی جو عادت لوگوں میں رائج ہے یہ ناجائز دروغ گوئی میں داخل نہیں، مثلاً کوئی یہ کہے کہ میں ہزار بار آپ کے پاس آیا، کیونکہ اس سے مبالغہ سمجھانا مقصود ہوتا ہے، ہزار بار آنا مراد نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی ایک ہی بار آئے (اور پھر یہ کہے) تو یہ البتہ جھوٹا ہوگا۔ مبالغہ کی جو بات اُنہوں نے کہی، ایک صحیح حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) ابو جہم اپنے کندھوں سے لاٹھی (ہٹا کر) نہیں رکھتے، (یعنی بہت مارنے والا ہے) حالانکہ یہ بات یقینی ہے کہ (لاٹھی ہر وقت سر پر اٹھا کر نہیں پھرتے بلکہ) بہت سے اوقات وہ زمین پر بھی رکھتا ہے۔"[1]

چھٹا درجہ: ہاتھا پائی کرنا

بعض اوقات داعی حق کا ایسے افراد کے ساتھ بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جو منکر

---

[1] الزواجر عن اقتراف الكبائر، كتاب الشهادات، الكبيرة الأربعون بعد الأربعمائة الكذب 2 / 326-

کو کسی حال میں نہیں چھوڑتے، سابقہ تمام حربے ان کے حق میں بے نتیجہ ثابت ہو جاتی ہیں، ایسی صورتِ حال میں نکیر کرنے والے کیلئے اس قسم کے افراد کو ہاتھ کیساتھ مارنا بھی جائز ہے، البتہ جب تک یہ حربہ بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکے تب تک اسلحہ اُٹھانا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا۔

نیز اس میں ان ہی دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جو "پانچویں درجہ" میں تحریر کئے جا چکے۔

ساتواں درجہ: نکیر کرنے کیلئے اعوان وانصار کو بلانا

اگر کہیں برائی کرنے والا گناہ کا عزمِ مصمم کر چکا ہو، کہ کسی قسم کے حیلے و حربوں سے وہ اپنا منکر چھوڑ نہیں رہا، داعی حق کی تمام تر کوشش بے نتیجہ ثابت ہو جائے، اور مخاطب ہر طرح گناہ کرنے پر تلا ہوا ہو، اور منکر بھی ایسا ہو کہ اکیلے داعی حق کیلئے اس کی روک تھام ممکن نہ ہو بلکہ اس کو مٹانے اور ختم کرنے کیلئے یاران و مددگاران کو بلانے اور جمع کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو ایسی صورت میں اللہ کی اس معصیت کو ختم کرنے کیلئے اعوان و انصار کو بلانا اور انکو متحد و یکجا کر کے منکر کے خلاف صف آرا کرنا بھی درست ہو گا، اس صورت میں اگرچہ باہمی قتل و قتال کی نوبت بھی آسکتی ہے، لیکن منکر کے ازالہ کیلئے اس کو برداشت کر لیا جائے گا۔

تغیر منکر کے حوالہ سے عوام کا دائرہ اختیار

پہلے تین درجات تو ظاہر ہے کہ عوام و خواص، سلاطین و رعایا تمام مسلمان اس کے مکلف ہیں، باقی چار درجات کا بھی یہی حکم ہے کہ تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے، صرف ارباب حکومت ہی اس کے مکلف نہیں، تاہم یہ ضرور ہے کہ سلاطین و امراء کا

بالخصوص یہ فرض منصبی ہے کہ اپنی حدودِ سلطنت وولایت میں نہی عن المنکر کیلئے مستقل شعبہ کی شکل میں خاص توجہ دے، اورایسی حکمت عملی اختیار کرے کہ حتی الامکان رعایاپر یہ ذمہ داری نہ عائد ہو جایا کرے۔

ساتویں درجہ کے بارے میں بعض محققین حضرات کا یہ مؤقف ہے کہ حکومتی اذن واجازت کے بغیرایسی کاروائی کرنا مطلقا جائز نہیں، کیونکہ اس میں فتنہ وفساد تک نوبت جا پہنچتی ہے، لیکن ان حضرات کا یہ خیال درست نہیں، بلکہ جیساکہ رعایا کو(شرائط وآداب کالحاظ رکھتے ہوئے)ان سب درجات کیساتھ منکر ختم کرنے کا حکم تھا، اسی طرح یہ آخری درجہ بھی اسی تغییرِ منکر ہی ایک شعبہ اوراسی کی انتہائی شکل ہے، جس کے سب مکلف ہیں۔

رہا فتنہ وفساد کااندیشہ ! تووہ صرف ساتویں درجہ ہی نہیں، بلکہ تمام صورتوں میں اس بات کی رعایت رکھنی ضروری ہے جیساکہ شرائط کے باب میں تفصیل سے ذکر کیا جاچکا، اسلئے شرائط وآداب کیساتھ کسی بھی صورت کو سرانجام دینے میں فتنہ یافساد کا کوئی خوف نہیں۔

آنے والے ابواب میں مستقل عنوان کے تحت اس مسئلہ کی مزید تفصیل ذکر کردی جائیگی، جس سے انشاءاللہ بخوبی مسئلہ اوراس کے تمام پہلوں واضح ہو جائیں گے۔

باب چہارم

- ❖ حضرات انبیاء کرامؑ کا طریقہ دعوت
- ❖ داعی کے صفات واخلاق

حضرات انبیاء کرام ؑ کا طریقہ دعوت

عصر حاضر میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دعوت دین کا کام کسی حد تک ہو رہا ہے، اُمت کی مجموعی حجم اور در پیش ضرورت کے لحاظ سے محض اتنے کام پر کفایت کرنا گو کافی نہیں ہے، تاہم پھر بھی جس حد تک محنت ہو رہی ہے اس کے مطابق بھی کچھ زیادہ نتائج دیکھنے میں نہیں آتے، اربابِ فکر و نظر کے ہاں اس کی جو کچھ بھی وجوہات ہوں وہ اپنی جگہ۔ لیکن بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسکی ایک بڑی اور بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرات انبیاء کرام ؑ کے طریقہ دعوت کی پوری پابندی نہیں کی جاتی، ان کے اُصول و ضوابط کا خیال نہیں رکھا جاتا، اگر دعوت کا کام حضرات انبیاء کرام ؑ کے طرز و طریق کے مطابق انجام دیا جائے تو بڑی جلدی کے ساتھ اس کے برکات و آثار محسوس ہوں گے، اس لئے یہاں مختصراً اسی نبوی طریقہ دعوت کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں مختلف انبیاء کرام ؑ کے دعوت کے واقعات مذکور ہیں جس سے ان حضرات کا طریقہ دعوت، داعیانہ کلام، قوم کی مخالفت کے وقت ان کی حکمت عملی وغیرہ اُمور واضح ہو جاتے ہیں، ذیل میں ان ہی کچھ باتوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

کام کی لگن

سورہ کہف میں ہے:

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا " [الكهف : 6]

"ترجمہ: پھر شاید تو اِن کے پیچھے افسوس سے اپنی جان ہلاک کر دے گا، اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائے۔"

اسی طرح سورۃ شعراء میں بھی ہے:

"لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔"

"ترجمہ: شاید تو اپنی جان ہلاک کرنے والا ہے اسلئے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔"

اس سے حضور ﷺ کے دردِ دل اور سوزِ قلب کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے دعوت حق قبول نہ کرنے اور ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ ﷺ کی پریشانی اور الم و کرب کا کیا عالم ہوتا تھا! بس داعی حق کے لئے اپنے دعوت کے کام سے ایسا ہی لگن چاہئے کہ وہ دنیا جہاں کی نعمتوں کو اپنے اس کام پر خرچ کرے اور دعوت کے کام کو اپنی خوشی وناخوشی، کامیابی وناکامی کا میدان ومدار ٹھہرائے، اس سے خود داعی کے ایمان واستقامت میں بھی بیش بہا ترقی ہوگی اور ساتھ مخاطب کے دل ودماغ پر بھی دعوت اثر انداز ہو جاتی ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ متکلم کے دل میں اگر اپنی بات کی واقعی عظمت واہمیت ہو تو مخاطب اس کا اثر لئے بغیر نہیں رہتا۔

مختلف پیرایوں میں دعوت دینا

جب کام کی لگن ہو جاتی ہے تو اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر وقت اسی کی سوچ وفکر میں رہے، جس چیز سے دلی محبت اور قلبی شغف کا تعلق استوار ہو جاتا ہے جی ہر وقت اسی کے کرنے پر انسان کو اُبھارتا اور مجبور کرتا ہے، داعی کا دعوت کے ساتھ یہی عاشقانہ رویہ والا تعلق ہونا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دعوت دینے میں کسی خاص شکل یا محدود اوقات میں دعوت کا کام کرنے سے تھکے گا نہیں، بلکہ پوری تازگی اور جوانمردی

کے ساتھ اس کو اپنے شب روز کا محبوب مشغلہ بنائے رکھے گا، حضرات انبیاء کرام ؑ کی دعوت دین کا یہ بھی ایک امتیازی وصف ہے، قرآن کریم میں سیدنا حضرت نوح ﷽ کا قصہ مذکور ہے جس میں وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں:

"قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا (5) فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا (6) وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (7) ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا (8) ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا " [نوح : 5 - 9]

"ترجمہ: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا۔ پھر وہ میرے بلانے سے اور بھی زیادہ بھاگتے رہے اور بیشک جب کبھی میں نے انہیں بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں رکھ لیں اور انہوں نے اپنے کپڑے اوڑھ لئے اور ضد کی اور بہت بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں کھلم کھلا بھی بلایا۔ پھر میں نے انہیں علانیہ بھی کہا اور مخفی طور پر بھی کہا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوح ﷽ نے ایک آدھ بار یا دس بیس سال تک دعوت کا کام کیا نہ ہی جان چھڑانے یا بدنامی سے بچنے کی خاطر صرف قوم کے کانوں تک پیغامِ خداوندی پہنچانے پر اکتفاء فرمایا، بلکہ سینکڑوں سال یہی معمول رہا کہ دن رات دعوت دیتے رہتے، انفرادی واجتماعی، خلوت وجلوت، ہر طرح اپنی قوم کو کفر وشرک جیسی منکرات سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے، یہی حال دیگر حضرات انبیاء کرام ؑ کا بھی رہا ہے، مثلاً حضرت یوسف ﷽ سے جیل کے ساتھیوں

نے خواب کی تعبیر پوچھی، آپ نے ان کو تسلی دی کہ خواب کی تعبیر بتلادی جائی گی اور پھر اصل تعبیر بتانے سے پہلے ایک حسین اور معقول پیرایہ میں دینِ حق کی دعوت دیدی۔

داعی کو بھی چاہئے کہ وہ اس سنت کو اپنا نصب العین بنائے اور کوئی بھی مناسب موقع ہو تو حکمت و خیر خواہی کے ساتھ دعوت دینے کا پورا اہتمام کرے۔

اللہ تعالیٰ پر حد درجہ اعتماد و توکل

قومِ عاد نے جب حضرت ہود علیہ السلام کی نصیحت آمیز دعوتِ حق کو بار بار رد کر دیا تو بالآخر حضرت ہود علیہ السلام نے جو جواب ارشاد فرمایا وہ قرآن کریم میں ذکر ہے:

"قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ (54) مِنْ دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُونِ (55) إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ" [هود : 54 - 56]

"ترجمہ: کہہ بے شک میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں کہ جنہیں تم اللہ کے سوا شریک کرتے ہو، سو تم سب مل کر میرے حق میں برائی کرو۔ پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے، کوئی بھی زمیں پر ایسا چلنے والا نہیں کہ جس کی چوٹی اس نے نہ پکڑ رکھی ہو، بے شک میرا رب سیدھے راستہ پر ہے۔"

حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب (ؑ) کی قومیں بھی جب بار بار کی تبلیغ کے بعد بھی انکار پر انکار اور دھمکی دینے پر اصرار کرنے لگ گئیں تو ان حضرات نے اسی طرح کا اعلان فرمایا جس طرح حضرت ہود علیہ السلام نے کیا تھا، اس اعلان میں مخلوق کی طرف عدم توجہ اور اللہ تعالیٰ پر حد درجہ اعتماد و توکل کا اظہار کیا گیا۔

داعی حق کے لئے اس سبق کو قدم بقدم یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ واقعۃً خدا ہی کا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے تو اعتماد و توکل کی نکیل بھی اسی ذات ستودہ صفات سے وابستہ رکھے، دعوت کی راہ میں نت نئے مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کسی بھی موقع پر اعتماد و بھروسہ کی سوئی اللہ تعالیٰ کی ذات سے کہیں اور ہٹنے نہ پائے، توکل کا رشتہ نہ اپنے ساتھ جوڑے رکھے تا کہ عجب و تکبر کا شکار نہ ہو جائے نہ ہی دیگر لوگوں کے ساتھ ایسی امید و بیم وابستہ رکھے تا کہ بے جا طمع ولالچ کی خرابی پیدا نہ ہو جائے، اسباب و مادیات کے ساتھ بھی توکل کا دامن نہ باندھے بلکہ یقین رکھے کہ جس ذات کے لئے یہ سارا کچھ کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ میری ساری مشکلات جانتا اور دیکھتا ہے اور وہی ان مسائل کے حل کرنے پر قادر ہے۔

دعوت دینے میں اقدام کرنا

قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کے پاس مختلف مواقع اور مختلف شکلوں میں جاکر دینِ حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچاتے تھے، ہمارے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکی دور میں، جو کہ مصائب و آفات کی عملی تصویر تھی، کبھی مکہ مکرمہ کے رہنے والوں کے پاس جاتے کبھی حج کے موقع پر قافلہ والوں سے مل کر دعوت دیتے، تو کبھی مختلف قبائل کے پاس

جا کر ان کو پیغامِ الٰہی پہنچاتے تھے، بعض موقعوں پر اپنی جگہ کچھ معتمد افراد کو دین کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تعلم کے لئے مختلف اطراف کی طرف بھیجتے، یوں ہی دیگر انبیاء کرام ؑ کا بھی معمول رہا کہ مختلف صورتوں میں قوم کے پاس جاتے اور ان کو بڑے درد اور بے چینی کے ساتھ دعوت حق دیتے رہتے تھے، حضرت مولانا محمد یوسف کاندہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید کتاب "حیاۃ الصحابۃ" میں اس نوعیت کے مختلف روایات و واقعات کو تفصیل کے ساتھ جمع فرمایا ہے جس کی مراجعت کرنا بہت مفید ہے۔

داعی کو چاہئے کہ وہ حضرات انبیاء کرام ؑ ،جو حقیقت میں دعوتِ دین کے شناور تھے، کی اس سنت مستمرہ کو بالکل نہ بھلائے بلکہ موقع و محل اور زمان و مکان کی مناسبت سے لوگوں کے پاس جا کر دعوت کا کام لگاتار کرتا رہے، لوگوں کے از خود آنے کا انتظار کرنا دعوت کے کام کو آہستہ آہستہ ختم کر دینے کے مترادف ہے خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ دین کی طرف شوق و رغبت کی فضاء اور اس راہ میں جان و مال کی قربانی کی روایت مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑنا

قوم کو دعوت دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں یاد کروائی جاتی ہیں جس کو ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان نفسیاتی لحاظ سے نعمت کا قدردان ہے اس لئے وہ اپنے محسن کے پیغام سے اعراض نہیں کرتا، اور جب یوں کسی داعی کے زبانی اپنے محسن کا پیغام سنتا اور سمجھتا ہے تو دل کی راہیں کھلنے لگتی ہیں اور یوں دعوتِ حق مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو جاتی ہے۔

اپنی خیر خواہی کی یقین دہائی کروانا

قرآن کریم کی متعدد جگہوں میں ذکر ہے کہ حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح ؑ کو اپنی اپنی قوموں نے جھٹلایا تو ان حضرات نے دعوت دینے کے ساتھ ساتھ قوم کے لگائے گئے الزامات کی تردید فرمائی اور صاف صاف بتلایا کہ میں بلاشبہ آپ لوگوں کا خیر خواہ اور آپ کے لئے امانت دار ہوں، مثلاً سورۃ اعراف میں ہے:

"أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ " [الأعراف : 68]

"ترجمہ: تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔"

داعی کے لئے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو دعوت دینی ہے ان کو اس یقین دہائی کرانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے اور یہ دعوت کا کام بھی اسی خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبہ کی وجہ سے کر رہا ہے، صرف زبانی طور پر باور کرانے سے مطلوبہ اہداف حاصل نہیں ہوتے بلکہ ایسے تمام مشتبہ اُمور سے بچ کر رہنا ضروری ہے جن کی وجہ سے داعی پر ذاتی مفاد کا دھبہ پڑ سکتا ہے، چنانچہ بسا اوقات اس کام کیلئے بہت سے مباح اُمور کو بھی چھوڑنا لازم ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرات انبیاء کرام ؑ کا طریقِ کار رہا ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دل سے کسی کو اپنا خیر خواہ تصور کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ محبت و اعتماد کی فضاء قائم ہو جاتی ہے اور ضد و عناد کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اس لئے حق بات قبول کرنے میں کوئی مانع باقی نہیں رہ جاتا۔

نرمی وشفقت

حضرات انبیاء کرام ؑ کی داعیانہ زندگی نرمی وشفقت سے معمور ہے، دعوت دین کے سلسلہ میں یہ حضرات قدم بقدم اپنے مخاطب لوگوں کے ساتھ بڑے نرمی، تحمل مزاجی، وسعت ظرفی اور شفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی بے جا سختی وبد اخلاقی کا رویہ نہ برتتے تھے، حضرت موسی وہارون لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جب فرعون جیسے ظالم وجابر کے پاس بھیجا جا رہا تھا تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی تھی:

"فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى" [طه : 44]

"ترجمہ: سو اس سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔"

اس کا فائدہ واضح ہے کہ نرمی ایسا جوہر ہے جو بسا اوقات تلوار سے بھی زیادہ تیز دار ثابت ہوتی ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو کام بار بار سختیاں دکھانے سے حاصل نہیں ہوتا ہے وہ ایک آدھ بار کی نرمی سے ہاتھ آجاتا ہے، اس لئے داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جوہر سے اپنے آپ مالا مال ومزین رکھے اور کسی بھی قیمت پر اس متاع گراں کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

مالی وذاتی مفاد کے جذبہ سے بچنا

قرآن کریم کے اندر مختلف حضرات انبیاء کرام ؑ کے زبانی بار بار یہ بات دُہرائی گئی کہ ہم آپ لوگوں سے اس دعوتِ دین کے بدلے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، مثلاً حضرت صالح بسم اللہ الرحمن الرحیم کے قصہ میں ذکر ہے:

"وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ

الْعَالَمِينَ" [الشعراء : 145]

"ترجمہ: اور میں تم سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ میری مزدوری تو بس رب العٰلمین کے ذمہ ہے۔"

معاوضہ جس طرح مال و دولت کی شکل میں حاصل ہوتا ہے یوں ہی عزت و مرتبہ، جاہ وجلال اور عہدہ و منصب بھی عوض ہی ایک صورت ہے، حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت مفاد پرستی وخود غرضی کی ان جیسی تصورات سے پاک تھی، وہ اپنی دعوت کی وجہ سے لوگوں سے کسی فائدہ وغرض حاصل کرنے کے بالکل متمنی نہ رہتے تھے نہ ہی لوگوں کو خدا سے ہٹ کر اپنا عقیدت مند بنانے کا کام کرتے تھے، ارشاد خداوندی ہے:

" مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ" [آل عمران : 79]

"ترجمہ: کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اللہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، اس لئے کہ تم اللہ کی کتاب سکھاتے ہو اور اس واسطے کہ تم پڑھتے ہو۔"

یہی وجہ ہے کہ جب مختلف اقوام نے اپنے اپنے انبیاء کرام کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا کہ آپ تو ہم جیسے انسان ہی ہو! تو سب انبیاء کرام نے اس کے جواب میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تعلی و بے جا بڑائی کا کوئی شائبہ ہو سکتا ہو، بلکہ برملا ان کی بات کو تسلیم فرمایا کہ ہاں: ہم تمہاری طرح انسان ہی ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ یہ احسان

فرمایا ہے کہ وحی و نبوت کی دولت سے سر فراز فرمایا ہے۔

مال و دولت اور عہدہ و منصب تو بڑی چیزیں ہیں، ایک داعی صادق کے لئے تو اپنے مخاطبین سے شکریہ و امتنان کا بھی منتظر نہیں رہنا چاہئے کہ بعض اوقات یہ جذبہ بھی اخلاص وللہیت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

"إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا"[دھر:9]

"ترجمہ: ہم جو تمہیں کھلاتے ہیں تو خاص اللہ کیلئے نہ ہمیں تم سے بدلہ لینا مقصود ہے اور نہ شکر گزاری۔"

اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان مزاج کے لحاظ سے بخیل اور نکتہ چین واقع ہوا ہے، اگر کسی کام میں اس پر کسی عوض و معاوضہ کا بوجھ پڑتا ہے تو روانی و آسانی کے ساتھ اس پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ فائدہ و نقصان کا موازنہ کرنا شروع کرتا ہے اور جب دل سے کسی کام کا کرنا پسند نہیں کرتا تو بے جا تنقید کے تیر بھی چلانا شروع کر دیتا ہے، اس لئے دعوت کے کام کو ہر قسم کے دنیوی مفاد و لالچ کے جذبہ سے دور ہی رکھنا ضروری ہے خصوصاً مخاطب لوگوں سے کسی قسم کے فائدہ کا منتظر رہنا نہایت مضر ہے۔

بات کرنے کا سلیقہ

قرآن کریم کے اندر جو جابجا حضرات انبیاء کرامؑ کے قصے منقول ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ دعوت دیتے وقت قوم سے خطاب کرنے کے الفاظ اور طریقہ کار، دونوں چیزیں بڑی شریفانہ اور مناسب تھیں، اس میں کوئی ناشائستہ جملہ یا بے ہودہ اندازِ خطاب بالکل موجود نہیں تھا، چنانچہ کبھی "اے لوگوں" کے ساتھ خطاب ہوتا ہے کبھی

"اے مؤمنو" تو کبھی "اے میری قوم" جیسے الفاظ سے خطاب ہوتا تھا، تمام انبیاء کرام ؑ کے قصص میں کوئی ایسا خطاب موجود نہیں جس میں کوئی بے ہودگی، بے حیائی یا بے جا بدخواہی وانتقام کا شائبہ ہو۔

ایک کامیاب داعی کے لئے اس بات کا بھی پورا اہتمام کرلینا چاہئے کہ وہ اس سنت کی پیروی کرے اور بلا وجہ مخاطب کے لئے کوئی ایسا انداز وکلام اختیار کرنے سے گریز کرے جو کسی بھی طرح دعوت کی افادیت ومقبولیت میں حائل بن سکتا ہے، نیز تمام لوگوں کے لئے ایک ہی ڈھنگ اختیار نہ کرے بلکہ لوگوں کے مقام ومرتبہ کا لحاظ رکھ کر دعوت دینے کی پابندی کی جائے، حضور نبی کریم ﷺ نے جو ہرقل کو دین کی دعوت دی تھی تو نام لکھتے وقت اس کے ساتھ "عظیم الروم" لکھا تھا۔

وضاحت اور عام فہم انداز اختیار کرنا

"وَأَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ" [المائدة : 92]

"ترجمہ: اور اللہ اور رسول کا حکم مانو اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف کھول کو پہنچا دینا ہے۔"

اس مضمون کی اور بھی متعدد آیات واحادیث ہیں جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انبیاء کرام ؑ کے ذمہ حق بات کو واضح طور پر پہنچانا ہوتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ صرف بات پہنچانا کافی نہیں ہے بلکہ پیغام کو صفائی اور وضاحت کے ساتھ پہنچانا چاہئے، چنانچہ سورۃ ابراہیم میں بھی یہ مضمون ذکر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول ﷺ کو اپنی قوم کی زبان دیکر بھیجا ہے تاکہ ان کو حق بات کھول کھول کر پہنچائے، لہٰذا دینِ حق

کے داعی کو چاہیئے کہ وہ حق کی دعوت کو صفائی وستھرائی کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرے اور ہر ایسے پہلو سے گزیز کرے جس کی وجہ سے اس کی دعوت میں کوئی پوشید گی یا پیچید گی پیدا ہو جائے۔

قوم کی ترجیحات ونفسیات سے واقفیت

انبیاء کرام ؑ کی دعوتی زندگی کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کو اپنی قوم کی ترجیحات ونفسیات کا اچھی طرح ادراک تھااور وہ اپنی اپنی قوم کی طبیعت ومزاج سے بہت کچھ واقفیت رکھتے تھے ،مزید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوازش یہ ہوتی رہی کہ اگر قوم میں کوئی واقعی کمال ومہارت کی کوئی صفت موجود ہوتی تھی تو جس نبی کوان کی طرف بھیجنا ہوتا تھا،ان کو بھی اس وصف میں حصہ وافر نصیب فرماتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا زور تھا تو آپ کو ایسی معجزات دی گئیں جس سے جادو کی قلعی کھل جاتی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب کا دور دورہ تھا تو آپ کو بعض ایسی معجزات سے نوازا گیا جو ظاہر میں طب سے کے میدان سے متعلق تھیں، فائدہ کے لحاظ سے زیادہ مؤثراور نتیجہ خیر ہونے کے باوجود اطباء کے دائرہ قدرت سے باہر تھیں ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں فصاحت وبلاغت کا چرچا تھا توآپ کواس باب میں کمالِ مہارت دی گئی۔

اس واقفیت کی وجہ سے یہ حضرات قوم کی نفسیات ورجحانات کو سامنے رکھ کر دعوت دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب دین کو کوئی اجنبی چیز تصور نہیں کرتا بلکہ گویا اپنی ترجیحات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے،اسی کا نتیجہ یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ دعوتِ دین قبول کرنے اور پھر اس کا ایک حصہ بننے میں مخاطب کو کوئی خاص طبعی مانع پیش نہیں آتا،

بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ دعوت قبول کرلیتا ہے۔

بے فائدہ اُلجھاؤ سے گریز کرنا

فرعون کے دربار میں جب حضرت سیدنا موسی ؑ دعوتِ حق لے کر تشریف لے گئے تو فرعون نے بھری محفل میں ایک یہ سوال بھی اُٹھایا کہ اگر آپ واقعۃً دینِ حق کا پیغام لیکر آئے ہیں اور یہ سچ ہو کہ جو شخص اس دین کو ٹھکرائے گا وہ عذاب کا مستحق بن جاتا ہے تو آپ سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہے؟ وہ بھی عذاب میں ہیں کیا؟ حضرت موسی ؑ نے "ہاں" "یا" نہیں" میں اس سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف بات پھیر دی کہ میرے رب کو اس کا علم ہے۔

فرعون کا یہ سوال کوئی حق سمجھنے کے لئے نہ تھا بلکہ حضرت موسیٰ ؑ کو اُلجھانے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی ایک سیاسی سازش تھی کہ جب یہ تمام لوگوں کو جہنمی بتائے گا تو مجلس میں موجود لوگ اپنے بڑوں کی تذلیل واہانت سمجھ کر طیش میں آجائیں گے اور یوں موسیٰ ؑ کا مشن ناکام ثابت ہو جائے گا، لیکن موسی ؑ اس بحث میں بالکل بھی نہیں اُلجھے کہ وہ لوگ جہنم میں ہے یا نہیں؟ بلکہ ایسا جواب دیا جس میں کوئی شرعی خرابی بھی نہیں تھی اور فرعون کی سازش بھی ناکام ونامراد ہو کر رہ گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوتِ دین دیتے وقت بے فائدہ بحث میں اُلجھنا مضر ہے اور "بے فائدہ" کا معنی صرف ناجائز نہیں ہے، بلکہ اس کے عموم میں ہر ایسی غیر ضروری بحث داخل ہے جس کا فوری نوعیت پر کرنا ضروری نہ ہو اور دعوت کے وقت اس کو

چھیڑنے سے دعوت کی افادیت کسی بھی طرح ختم یا کم ہو سکتی ہو، نیز دعوت صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ وعظ و تقریر اور تالیف و تصنیف وغیرہ بھی دعوت دین کی مختلف شکلیں اور اسی کی متنوع شاخیں ہیں، اس لئے یہاں بھی اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ دعوت کا کام بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

زبانی دعوت کے ساتھ ساتھ عملی نمونہ پیش کرنا

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے جب آپ کی دعوت کو ٹکرا دیا اور اُلٹا مذاق کرنے پر اُمڈ آئے، اس وقت آپ نے ان سے فرمایا تھا:

" وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَى مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ " [هود : 88]

"ترجمہ: اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تم منع کرو، میں اس کے خلاف کروں۔"

" صحیحِ مسلم " کی روایت ہے کہ چھ افراد نے اپنا سامان وجائیدار بیچ کر اسلحہ خریدنے اور پھر مرتے دم تک تسلسل کے ساتھ جہاد کرتے رہنے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: " أليس لكم في أسوة؟"[1]

اسی طرح "سننِ بیہقی" کی ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام ایک سفر میں تھے جس میں انتظام کے باوجود کسی کی آنکھ نہیں کھلی اور یوں فجر کی نماز فوت ہو گئی، سورج نکلنے کے بعد جب صحابہ کرام جاگ گئے تو پریشان ہوئے، بعض اسی پریشانی کی وجہ سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ہماری اس کوتاہی کا کیا کفارہ

---

[1] صحيح مسلم،باب جامع صلاة الليل، ومن نام عنه أو مرض.

ہوگا؟ حضور ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ:

" أما لكم فيّ أسوة " ثم قال: " إنه ليس في النوم تفريط، إنما التفريط على من لم يصل الصلاة حتى يجيء وقت الأخرى."[1]

عملی نمونہ پیش کرنے کا فائدہ

تمام انبیاء کرامؑ کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو صرف زبان سے ہی دعوت نہیں دیتے، بلکہ ان کے سامنے ایک عملی نمونہ بھی رکھتے ہیں، اس کے دو بڑے فائدے ہوتے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ مخاطب کو داعی کی صداقت اور دعوت کی اہمیت کا یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ جب داعی خود اپنی زندگی دعوت کے مطابق ڈھال رہا ہے تو ضرور یہ اپنی دعوت میں سچا ہے اور جو پیغام وہ دے رہا ہے وہ کم از کم خود اس کے نزدیک اس قابل ہے کہ دنیا کی خواہشات کو اس کے مقابلے میں قربان کیا جائے۔

عملی تصویر پیش کرنے کا دوسرا نقد فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان زبان سے کم اور کردار سے زیادہ سیکھتا ہے، بعض باتوں کی تہہ تک وہ زبانی دعوت سے نہیں پہنچ سکتا لیکن عملی نمونہ دیکھ کر بآسانی اس تک پہنچ جاتا ہے اور ساتھ عمل کرنے کا بھی داعیہ پیدا ہوجاتا ہے، دعوت کی کامیابی وافادیت کے لئے ضروری ہے کہ داعی صرف زبانی دعوت دینے پر ہی اکتفاء نہ کرے، بلکہ قوم کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کرے، اس سے

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي،باب لا تفريط على من نام عن صلاة،ج2ص 306.

دعوت کے نفوذ واثر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے گا۔ان شاءاللہ۔

کردار کی صفائی

مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور میں جب مشرکین کی طرف سے ناجائز اور غلط سلط مطالبات کا سلسلہ شروع ہوا، اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا:

"قُلْ لَوْ شَاءَ اللهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔" [یونس : 16]

"ترجمہ: کہہ دو اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ ہی تمہیں اس سے خبردار کرتا، کیونکہ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ کامیاب داعی کی عملی زندگی اور اس کا کردار و گفتار ایسا ہونا چاہیے جس پر مخاطب کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے، دعوت ایسی ہو تو نہایت مؤثر اور مفید ہوتی ہے اور مخاطب میں اگر عناد و ضد کا جذبہ نہ ہو تو وہ ضرور کسی نہ کسی وقت ایسی دعوت سے اثر لے کر رہتا ہے، حضرات انبیاء کرام ؑ کو عصمت کی نعمت سے نوازنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ لوگوں کے لئے قبولِ حق کے تمام تر مواقع میسر ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب پر حجت تمام ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو طرح طرح مشقتیں جھیلنے کے بعد بھی جب جیل سے رہائی کی نوید سنائی گئی تو اُنہوں نے اس کو فوراً قبول نہیں فرمایا بلکہ اول تحقیق و تفتیش کرنے کا حکم دیا کہ جس جرم کی تہمت میں مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی تحقیق کی جائے، تحقیق

کرنے کے بعد جب آپ کی صفائی وعفت آفتاب نیمروز کی طرح بالکل آشکارا ہوگئی تب ہی آپ نے بادشاہ کی دعوت منظور کی اور جیل سے رہائی اختیار فرمائی۔

یاد رہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ داعی ضرور متقی اور تمام گناہوں سے بچنے والا ہی ہو، بلکہ اس کے بغیر بھی دعوت دینا جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری ہو جاتا ہے، لیکن دعوت کی کامیابی اور تاثیر کے لئے اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

ایمان واعمال کا میدان فراہم کرنا

طلوعِ اسلام کے ابتدائی دور میں بعض افراد جب مسلمان ہوتے تو حضور ﷺ ان کو کسی معلم کے حوالہ کر دیتے تھے، اگر باہر کسی قوم وقبیلہ کے لوگ مسلمان ہوتے تو بعض اوقات ان کے پاس کسی قاری صحابی کو معلم بنا کر بھیج دیتے تھے تاکہ ان کو قرآن کریم اور دین اسلام کے احکام بتلائے اور سمجھائے جائیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ دعوت دیکر کنارہ کش ہو جائے بلکہ اگر مخاطب دعوت قبول کرتا ہے اور ضرورت ہو تو ممکنہ حد تک اس کے لئے کوئی مناسب ماحول پیدا کرنا یا کسی مناسب ماحول کی طرف اس کی رہنمائی کرنا بھی دعوت کا حصہ ہے، اس کے بغیر دعوت اگر ظاہری طور پر مؤثر بھی ہو تو بھی وہ دیر پا ثابت نہیں ہوتی اور غلط ماحول میں جانے کے بعد میں پھر سے دعوت کا اثر زائل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں شرعی واجبات کے احیاء کا ہدف حاصل ہو سکتا ہے نہ ہی منکرات ومعاصی کا ازالہ ممکن ہے۔

متبادل راستہ دکھلانا

درست میدان فراہم کرنے کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ مخاطب کو جس

معصیت سے روکا جارہا ہے، اگر اس کا کوئی جائز متبادل شکل موجود ہو تو داعی کو چاہئے کہ اس کی طرف بھی مخاطب کی رہنمائی کرے، متبادل بتلانے سے دعوت کا فائدہ نقد صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی حضرات انبیاء کرام ؑ کی دعوت کا حصہ ہے کہ اپنے مخاطب کو صرف گناہ سے روکنے ہی پر اکتفاء نہ کی جائے بلکہ ممکن ہو تو جائز راستہ بھی دکھلا دیا جائے، اسی طرح اگر وہ کسی شرعی فریضہ کا تارک ہے تو صرف کرنے کا حکم یا ترغیب نہ دی جائے، بلکہ عملی طور پر اس کو انجام دینے کی صورت بھی بتلائی جائے، سیدنا حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب فرشتہ حسین لڑکوں کی شکل میں تشریف لائے اور قوم ان کو دیکھ کر اپنی ناجائز اور بے جا شہوت پورا کرن کی ہوس میں ان کے گھر چڑھ آئے اور مطالبہ کیا کہ لڑکے ان کے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ ان سے اپنی ناجائز شہوت کی تسکین کریں، اس وقت جہاں حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو اس بے جا شہوت رانی سے منع فرمایا وہاں اس کا جائز راستہ بھی بتلایا، چنانچہ فرمایا:

"يَاقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ " [هود : 78]

"ترجمہ: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لئے پاک ہیں ۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں۔"

متبادل کی ضرورت کہاں؟

البتہ جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا کہ متبادل صورت وہاں بتلائی جاتی ہے جہاں ممکن

ہو اور یہ وہاں ہو سکتا ہے جہاں اصل کام جائز ہو، لیکن طریقہ کار میں کوئی ناجائز پہلو شامل ہو، جہاں اصل ہدف ہی ناجائز ہو وہاں متبادل بتانا نہ ضروری ہے نہ ممکن، وہاں متبادل بتلانے کا حاصل یہی ہوگا کہ داعی نے مخاطب کو ایک گناہ سے نکال کر دوسری کی طرف دھکیل دیا اور نقصان کی بات یہ ہے کہ پہلے گناہ کو وہ گناہ سمجھ کر کرتا تھا اور دوسرے گناہ کو داعی کے بتلانے کی وجہ سے جائز و حلال سمجھ کر انجام دیتا ہے، اس لئے ایسی جگہوں میں متبادل بتلانے کی جگہ شرعی دائرہ میں رہتے ہوئے مقاصد حاصل کرنے کی تلقین و ترغیب دی جائے اور انہی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ممکن ہو تو کوئی جائز تدبیر بتلادی جائے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی و خیانت کرنے سے روکا تو قوم نے برا منایا کہ ہم آپ کی وجہ سے اپنے مالی نفع اور مادی مفاد کو کیونکر چھوڑ جائیں؟ اس سے تو مالی نقصان ہوگا؟ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:

"بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ" [هود : 86]

"ترجمہ: اللہ کا دِیا جو باقی بچ رہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر ایماندار ہو اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔"

قوم کی بیماری یہ تھی کہ زیادہ مال کمانے کی ہوس میں ناپ تول میں خیانت کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اسی شکل میں اس کا بھی متبادل موجود نہ تھا بلکہ اس طرح لوگوں کو دھوکہ میں رکھ کر فائدہ حاصل کرنا ناجائز تھا اور اس کا جائز حل یہی تھا کہ جائز طریقہ تجارت کے مطابق جو کچھ نفع حاصل ہوتا ہے اسی پر قناعت اختیار کی جائے، اس لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو یہی تعلیم دی۔

منفی پروپیگنڈے کے وقت طرز عمل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ" [الأنعام : 112]

"ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کیلئے شریر آدمیوں اور جنوں کو دشمن بنادیا جو کہ ایک دوسرے کو طمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کیلئے سکھاتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو یہ کام نہ کرتے۔ سو تو انہیں اور جو جھوٹ بناتے ہیں اسے چھوڑ دے۔"

دعوتِ دین کے میدان میں مخالفتوں کا ہونا کوئی نئی بات ہے نہ ہی حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ ہر داعی حق کو قدم قدم پر اس سے واسطہ پڑتا ہے کہ باطل مختلف طریقوں سے حق کی دعوت کو بے اثر بنانا چاہتا ہے، ان میں سے سب سے آسان اور خطرناک غلط پروپیگنڈہ ہے جس کی وجہ سے بغیر کسی ظاہری بدنامی کے وہ بہت کچھ مقاصد واہداف حاصل کر سکتا ہے دوسری طرف داعی بے چارہ بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے جب وہ اپنی خیر خواہی اور عصمت کے باوجود اپنے خلاف جھوٹ کا راج دیکھتا ہے تو ضرور دل تنگ ہو جاتا ہے جو بسا اوقات اس کی کم ہمتی اور بسا اوقات جذباتی حل کی طرف اس کو کھینچ کر لے جاتا ہے جس کی وجہ سے باطل کا ہدف بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کا حل کیا ہونا چاہئے؟ منفی پروپیگنڈے کے وقت داعی حق کو کیا اقدام کرنا چاہئے؟ قرآن کریم نے متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کی قصوں کے ضمن میں اس کی

پوری پوری رہنمائی فرمائی ہے، سورۃ حجر میں ہے:

" فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (94) إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (95) الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (96) وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ (97) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ـ"

(98) وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ" [الحجر : 94 - 99]

"ترجمہ: لہذا جب بات کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے، اسے علی الاعلان لوگوں کو سنادو۔o اور جو لوگ پھر بھی شرک کریں، ان کی پرواہ مت کرو۔o یقین رکھو کہ ہم تمہاری طرف سے ان لوگوں سے نمٹنے کیلئے کافی ہیں جو (تمہارا) مذاق اُڑاتے ہیں۔o جنہوں نے اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود گھڑ رکھا ہے۔ چنانچہ عنقریب انہیں سب پتہ چل جائے گا۔o یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو باتیں یہ بناتے ہیں۔ ان سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔o تو (اس کا علاج یہ ہے کہ) تم اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، اور سجدہ بجالانے والوں میں شامل رہو۔o"

سورۃ انعام میں ہے:

"قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (33) وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَى مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّى أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ " [الأنعام : 33 ، 34]

"ترجمہ: اے رسول! ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں، ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، کیونکہ در اصل یہ تمہیں نہ جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔O اور حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے۔ پھر جس طرح انہیں جھٹلایا گیا اور تکلیفیں دی گئیں۔ ان سب انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی۔ اور کوئی نہیں ہے جو اللہ کی باتوں کو بدل سکے اور (پچھلے) رسولوں کے کچھ واقعات آپ تک پہنچ ہی چکے ہیں۔"O

اس سے معلوم ہوا کہ ہر بات کا جواب اور ہر پروپیگنڈے کے تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل رکھتے ہوئے مثبت طریقے سے اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیئے اور ایسے مشکل حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع کا سلسلہ برقرار رکھنا چاہیئے اور داعی کو چاہیئے کہ ایسے موقع پر گزشتہ ارباب دعوت و عزیمت کی تاریخ اور ان کو درپیش مشکلات و مصائب کا استحضار کرے۔

حکیمانہ تدبیر

حضرات انبیاء کرامؑ کے میدانِ دعوت کا یہ بھی ایک قدرِ مشترک رہا ہے کہ بڑی شفقت اور حکمت و دانائی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، اگر کہیں کسی فرد یا جماعت کو واجبات قائم کرنے پر اُبھارنا ہو یا منکرات سے روکنا ہو تو اس ہدف تک پہنچنے کے لئے آسان اور مفید تر طریقہ کار کا انتخاب کیا جاتا ہے جس سے دعوت کا مقصود بھی حاصل ہو جاتا ہے اور زیادہ مشقت بھی نہیں کرنی پڑتی، مثلاً ایک آدمی اپنی مختلف کمزوریوں کا ذکر کرتا ہے کہ میں شراب بھی پیتا ہوں، جھوٹ بھی بولتا ہوں اور فلاں فلاں گناہ بھی کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام گناہوں سے یکجا طور پر منع ہو جانے کا حکم نہیں دیا بلکہ جھوٹ

سے منع فرمایا جس کے نتیجہ میں وہ بالآخر تمام گناہوں سے رک گیا۔

داعی کو بھی چاہئے کہ اگر مخاطب متعدد منکرات کا عادی ہے تو تمام گناہوں سے ایک ساتھ روکنے پر بلاوجہ اصرار نہ کرے بلکہ غور کر کے تمام برائیوں کی اصل جڑ اور بنیاد کی طرف جائے اور اسی کی دعوت دے، حضرات صوفیاء کرام جو کچھ محنت کرتے ہیں اس کی بڑی اور امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ ظاہری گناہوں کی بنسبت ان کے اسباب اور جڑوں پر ہوتی ہے کہ جب گناہوں کے اسباب ختم یا کمزور ہو جائیں گے تو عملی خرابی کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی اور ایسی اصلاح بھی دائمی اور دیرپا ثابت ہو گی۔

داعی کے اخلاق وعادات

مذکورہ باب میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جن ارکان وشرائط کا ذکر کیا گیا، ان شرائط وضوابط کی روشنی میں ہی امر اور نہی کا اہتمام کرلینا چاہئے، تب ہی یہ کام ایک عظیم عبادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا ذریعہ بن سکتا ہے ورنہ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں بعض اوقات ثواب اور جزا پانے کی بجائے معصیت کا ارتکاب لازم آجاتا ہے۔

ان شرائط کے علاوہ کچھ آداب واخلاق بھی ہیں، داعی کیلئے ان آداب کا لحاظ رکھنا اور ان عالی صفات واخلاق کو اپنے اندر پیدا کرلینا چاہئے، اگر داعی کا مقصود یہ ہو کہ معاشرہ برائی سے پاک ہوجائے، یا منکرات کم ہوجائیں، اگر واقعۃً وہ دردِ دل سے دعوت دینا چاہتا ہو اور یہ آرزو ہو کہ اس کی دعوت سے اللہ کی نافرمانی ختم ہوجائے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ دعوت ان ہی آداب کی روشنی میں دیدے، دعوت دیتے وقت ان تمام اُمور کا لحاظ رکھے اور اپنے آپ کو ان اخلاق واوصاف سے متصف بنائے۔

بزرگانِ دین اور علماء اُمت نے اس کیلئے بہت سے آداب ذکر فرمائے ہیں، بنیادی طور پر تین اُمور کا خیال رکھنا ضروری ہے، باقی جتنے بھی آداب واخلاق ذکر کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام ان تین میں سے کسی نہ کسی کے ضمن میں داخل ہوجاتے ہیں، اور یوں تقریباً وہ سارے آداب ان تین ہی کے نتائج وثمرات یا اسی کی تشریح وتوضیح ہے۔

پہلا ادب: علم

علم سے مراد یہ ہے کہ امر اور نہی کرنے والا امر اور نہی کے حدود و

قیود، اسباب وموانع، شرائط وارکان وغیرہ سے واقف ہو، اس کو یہ معلوم ہو کہ کب اور کن کن حالات میں امر اور نہی کرنا جائز یا واجب ہے اور کونسی صورتوں میں ناجائز یا ممنوع؟ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ امر یا نہی کرنے کیلئے کیا کیا شرائط وارکان ہیں؟ یہ بھی اس کو تجربہ ہو کہ مختلف حالات وافراد کے اعتبار سے امر اور نہی کا کونسا طریقہ کار اپنانا زیادہ مفید اور کار آمد ہے؟

یہاں علم سے مراد صرف خاص اس مسئلہ کا علم نہیں، کیونکہ مسئلہ کا علم تو امر اور نہی کے ان بنیادی شرائط میں سے ہے، جن کے بغیر امر اور نہی کرنا شرعاً واجب ہی نہیں، جیسا کہ شرائط کے بیان کے سلسلہ میں تفصیل سے بیان کردیا گیا۔

دعوت کے باب میں علم کا فائدہ

"علم" کا فائدہ یہ ہوگا کہ داعی مکمل بصیرت کے ساتھ امر اور نہی کرے گا، پوری خوداعتمادی اور شرح صدر کے ساتھ وہ یہ اہم کام سرانجام دے گا، جس کا ایک نقد فائدہ مخاطبین کو تو یہ ہوگا کہ مخاطب اس سے جلدی متاثر ہو کر دعوت قبول کرے گا جس سے اس کا مقصود پورا ہو جائیگا۔

ایک فائدہ خود داعی کو یہ ہوگا کہ دعوت دینے کے سلسلے میں وہ اندرونی اور بیرونی خطرات واثرات سے محفوظ ومامون رہے گا، یعنی دعوت دیتے وقت شیطان کے مکروفریب سے ہوشیار رہے گا، اور مخاطب کے نامناسب رویہ سے ایسا تنگ دل اور متاثر بھی نہیں ہوگا کہ بالکل دعوت دینا ہی چھوڑ دے، اور اپنی ظاہری ناکامی سے وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوگا، بلکہ:

یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کیلئے

کا فلسفہ جان کر یہ اس کے مزید سبق وہمت کا باعث بنے گا۔

دوسرا ادب: ورع و تقویٰ

"ورع" عربی زبان میں رکنے اور روکنے کو کہتے ہے، شرعی اصطلاحات و مباحث میں " ناجائز اور نا مناسب اُمور سے اپنے آپ کو بچانے "کو ورع کہا جاتا ہے(مقاییس اللغۃ)۔[1]

اس ادب کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات علم ہوتا ہے لیکن مختلف وجوہات کی وجہ سے اس پر کماحقہ عمل نہیں ہو پاتا، مسائل واحکام معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے مطابق عمل و کردار نہیں ہوتا، حدود و قیود کا پتہ ہوتا ہے لیکن اظہار واحساس برتری اور حصول جاہِ وغیرہ امراض کے عادی نفس کو اس کا عادی وخوگر بنانا ممکن نہیں ہوتا، بقول غالب:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اُدھر نہیں جاتی

تقویٰ اختیار کرنے کا فائدہ

علم کے ساتھ ساتھ جب داعی ورع و تقوی کی صفت سے بھی متصف ہو، جس بات کی دعوت دے رہا ہو خود بھی اس کا خوگر ہو، تو ایسی دعوت کا اثر جلدی ظاہر ہونے کی اُمید ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جن لوگوں کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے، جن کا کردار گفتار کے موافق نہیں ہوتا، تو نہ صرف یہ کہ ان کی دعوت اور وعظ و نصیحت میں

---

[1] مقاییس اللغة ،مادة: ورع

وہ تاثیر نہیں ہوتی جو ایک باعمل عالم دین کے گفت وشنید میں پائی جاتی ہے، بلکہ بعض نادان لوگوں کے ہاں ایسے حضرات تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنے ہوتے ہیں، ان کی دعوت منکرات کے ازالہ یا تقلیل کا باعث نہیں ہوتی، بلکہ بے خبر اوباش لوگوں کی طرف سے احکام شرعیہ کے توہین و گستاخی، طبقہ علماء پر بیجا تہمت وافتراء وغیرہ معاصی کا ذریعہ بن جاتی ہے، اسلئے داعی حق کیلئے اپنے اندر ورع و تقویٰ کا صفت بھی پیدا کرلینا چاہئے تاکہ ان مفاسد سے بچا جاسکے۔

ان ساری گزارشات کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ ورع کے مقام پر فائز نہ ہوں، ان کیلئے تبلیغ جائز یا مفید نہیں، بلکہ جیسا کہ شرائط کے باب میں تفصیل سے گذر چکا کہ ایسے لوگ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نصوص کے مخاطب ومکلف ہیں، امر اور نہی کرنا ان حضرات پر بھی فی الجملہ واجب ہے، لیکن عملاً اس کی افادیت کیلئے خود بھی دعوت کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہئے۔

حضرات صحابہ کرام کا استفسار اور حضور ﷺ کا جواب

بعض حضرات صحابہ کرام (بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ) نے حضور ﷺ کے دربار اقدس میں جب یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ اگرچہ تم پورے طور پر عمل نہ کرسکو لیکن دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ روایت نقل کرتے ہیں:

"عن أنس بن مالك قال: قلنا: يا رسول الله، لا نأمر بالمعروف حتى نعمل به، ولا ننهى عن المنكر حتى

نجتنبه كله؟ فقال رسول الله ﷺ: «بل مروا بالمعروف، وإن لم تعملوا به كله، وانهوا عن المنكر، وإن لم تجتنبوه كله»۔"

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہم نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ: کیا ہم جب تک کسی نیکی پر خود عمل نہ کریں اس وقت تک لوگوں کو بھی اس کا حکم نہ دیں، اور جب تک کسی منکر سے خود باز نہ آئے اس وقت تک دوسروں کو بھی نہ روکے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نہیں) بلکہ نیکی کا حکم دیا کرو اگرچہ تم نے خود اس پر پوری طرح عمل نہ کیا ہو اور برائیوں سے لوگوں کو روکا کروں، اگرچہ تم خود اس سے پوری طرح نہ رکے ہو۔"[1]

تیسرا بنیادی ادب: حسنِ خلق

قرآن وسنت سے ادنی شغف رکھنے والے پر وہ نصوص مخفی نہیں رہ سکتے جن میں "اخلاق حسنہ" یعنی اچھے اخلاق کے فضائل اور فوائد مذکور ہیں، لیکن اکثر لوگوں کی نظروں سے اس کی حقیقت او جھل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ کماحقہ اس کی اصلاح

[1] رواه الطبراني في المعجم الأوسط، رقم الحديث: 6628،ج6 / 365) ولكن إسناده ضعيف من جهة عبدالقدوس بن عبدالسلام بن عبدالقدوس كما نبه عليه الهيثمي في مجمعه، حيث قال" رواه الطبراني في الصغير والأوسط من طريق عبد السلام بن عبد القدوس بن حبيب عن أبيه وهما ضعيفان" انظر (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب مروا بالمعروف وإن لم تعملوا به، رقم الرواية: 12185،ج7 / 277) وكذا نبه عليه العلامة العراقي في المغني" (1/ 811)

نہیں کر پاتے، اور بعض اوقات تو اس کے وسیع اور جامع مفہوم کو اتنا تنگ اور محدود بنا کر رکھا جاتا ہے کہ جس سے شارع کا منشا ہی فوت ہوتا نظر آتا ہے چہ جائیکہ اس پر وہ نتائج و ثمرات ظاہر ہو جس کا ان نصوص میں وعدہ فرمایا گیا ہے۔

اخلاق کی حقیقت:

"خلق "دراصل دل کے اس راسخ اور پختہ کیفیت کا نام ہے جس سے بغیر کسی فکر و تردد کے بڑی آسانی کیساتھ انسان کے تمام فکر و سوچ اور اقوال وافعال صادر ہوتے ہیں، یعنی وہ انسانی ملکہ جو اس کے تمام جذبات کے پیچھے کار فرما ہوتا ہے وہ خلق ہے، اگر یہ ملکہ شریعت کے مقررہ حدود کے مطابق استعمال ہو اور اس سے اُٹھنے والے جذبات شریعت ہی کے تابع فرمان ہو تو اس کو "اخلاقِ حسنہ" کہا جاتا ہے۔

اور اگر اسی" ملکہ " کو اتنا چھوٹ دیا جائے کہ ہر قسم کے فکر و نظر اور کردار و گفتار کا عندیہ دینے میں خود مختار اور آزاد ہو کہ جب اور جو کچھ اعلامیہ چاہے، بغیر کسی روک ٹوک کے جاری کر سکے، قرآن وسنت کی اتباع کی نکیل اس میں نہ ڈالی جائے بلکہ یوں ہی شتر بے مہار کی طرح رکھا جائے تو یہ اخلاق سیئہ اور برے اخلاق ہیں۔

علامہ بِرکوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب "الطريقة المحمدية" میں خلق کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الخلق ملكة تصدر عنها الأفعال النفسانية بسهولةمن غير روية۔"

"خلق وہ ملکہ ہے جس سے نفسانی اعمال سوچ و فکر کے بغیر بڑی سہولت کے ساتھ صادر ہوتے ہیں۔"

علامہ ابو سعید خادمی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: [1]

""" خلق "دل میں جا گزیں اس کیفیت کا نام ہے جس سے انسان کے تمام اختیاری عقائد، اقوال اور افعال صادر ہوتے ہیں، پس اس سے وہم دور ہو گیا جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کیفیات تو خلقی اُمور ہیں جو انسان کے (دائرہ قدرت و)افعال میں داخل نہیں (تو اس پر انسان کو کیسے مکلف کیا جا سکتا ہے) جبکہ تکلیف کا تعلق تو انسان کے اختیاری افعال کے ساتھ ہے، کیفیات کا مکلف نہیں بنایا جاتا، لہٰذا اس سے لازم آتا ہے کہ نیک اخلاق کے حاصل کرنے اور برے اخلاق کے ختم کرنے کا انسان مکلف نہ ہو۔

وہم ختم ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ نفس خلق کا انسان مکلف نہیں، بلکہ اس کے نتیجے کا مکلف ہے، اور اضطراری چیز سے اختیاری افعال کا صادر ہونا نا ممکن نہیں جیسے کہ انسان کے افعال کہ در حقیقت یہ قدرت خداوندی کا کرشمہ ہے جو کہ انسان کے اختیار میں نہیں، بلکہ ایک غیر اختیاری امر ہے ۔۔ "رویہ" یاء کے تشدید کے ساتھ ہے اس کا معنی غور و فکر کرنا۔"

علامہ خادمی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے بڑی وضاحت کیساتھ معلوم ہوا کہ "خلق" کا مفہوم کافی وسیع ہے، عقائد و نظریات اور اقوال وافعال سب یہی سے صادر ہوتے ہے۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلط فہمی واضح ہو جاتی ہے جو صرف ظاہری خوش طبعی، چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ کو خلقِ حسن سمجھتے ہیں، ان کے علاوہ

---

[1] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية، الباب الثالث في الأمور المهمة، النوع الثالث في الأعضاء التي تجري فيها التقوي،2/31-

افکار و جذبات اور اعمال وغیرہ کو عملاً اخلاق حسنہ کی فہرست سے بالکل نکالتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کے ساتھ چہرہ کی بشاشت سے ملنا، مسکراہٹ ہی سے اس کو خوش کرنا ایک نیک کام اور باعث اجر و ثواب ہے اور اخلاق حسنہ کے نیک ثمرات میں سے ہے، لیکن اسی کو سب کچھ سمجھنا اور اس کے علاوہ تمام اخلاق کو درمیان سے بالکل نکالنا قطعاً غلط ہے۔

اخلاق کی اہمیت اور حاصل کرنے کا آسان طریقہ کار

اخلاق کی جو تعریف کی گئی یہی وہ اخلاق ہیں جن کی احادیث مبارکہ میں بہت سے فضائل وارد ہوئے، اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بزرگانِ دین کے نزدیک سلوک و تصوف کا حاصل ان ہی اخلاق کو پیدا کرنا ہے، گویا پورا فن تصوف انہی اخلاق اور اس کے طریقہ حصول کے ارد گرد گھومتا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"الخلق ما يرجع إليه المتكلف من نعته واجتمعت كلمة الناطقين في هذا العلم أن التصوف هو الخلق وجماع الكلام فيه يدور على قطب واحد وهو بذل المعروف وكف الأذى،وإنما يدرك إمكان ذلك في ثلاثة أشياء،في العلم والجود والصبر۔"[1]

""خلق" انسان کے وہ صفات ہیں جن کی طرف انسان منسوب کیا جاتا ہے

[1] منازل السائرين ، باب الخلق 1 / 58.

(یعنی جن کی طرف انسان کی نسبت کی جاتی ہے جیسے بخیل و سخی) اور اس علم (الاخلاق اور علم التصوف) میں بحث کرنے والے تمام حضرات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تصوف اخلاق ہی ہے، اور اکثر بحث اس میں ایک ہی نکتہ کے ارد گرد گھومتا ہے کہ نیکی پھیلائی جائے اور تکلیف دہ افعال واخلاق روکے جائے، اور یہ تین اُمور میں ممکن ہے، علم، جذبہ سخاوت، صبر۔"

خلق حسن کی یہ عظیم دولت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اچھے اور دقیق انداز میں تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حصول الخلق المحمود بطهارة النفس،قد تقدم أن طهارة النفس تكون لإصلاح القوى الثلاث:

فإصلاح الفكرة: بالتعلم حتى يميز بين الحق والباطل في الاعتقاد، وبين الصدق والكذب في المقال، وبين القبيح والجميل في الفعال.

وإصلاح الشهوة: بالعفة حتى تسلس للجود والمواساة المحمودة بقدر الطاقة.

وإصلاح الحمية: بإسلاسها حتى يحصل الحلم؛ وهو كف النفس عن قضاء وطر الغضب، وتحصل الشجاعة؛ وهي كف النفس عن الخوف وعن الحرص المذمومين.

وبإصلاح القوى الثلاث يحصل للنفس العدالة والإحسان، وهذه جماع المكارم، وطهارة النفس وحسن الخلق الممدوح يقول النبي - ﷺ -: " أكمل المؤمنين إيمانًا أحسنهم أخلاقًا_والممدوح أيضًا بقوله - صلى الله

عليه وسلم -: " أحبكم إليَّ أحاسنكم أخلاقًا۔"[1]

"اچھے اور قابل تعریف اخلاق نفس کے پاک کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں، اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ نفس کی پاکی انسان کے تین (خفیہ) قوتوں کی اصلاح کے ساتھ ہوتا ہے، (۱) قوتِ فکر کی اصلاح اتنے علم سیکھنے سے ہو گی کہ حق و باطل نظریات، سچ و جھوٹ باتوں اور نیک و بد افعال کے درمیان تمیز و فرق کر سکے۔

(۲) مادہ شہوت کی اصلاح عفت سے ہو گی تا کہ نفس سخاوت اور اپنی وسعت کے مطابق غم خواری کیلئے تیار ہو۔

(۳) مادہ غیرت و حمیت: اس کی اصلاح برابر کرنے سے ہو گی کہ برد باری کی صفت پیدا ہو جائے (غصہ کے تقاضوں سے نفس کو بچانے کا نام برد باری ہے) اور نفس کے اندر بہادری بھی حاصل ہو (بیجا خوف اور حد سے زیادہ حرص کے تقاضوں سے نفس کو بچانے کا نام بہادری ہے)۔

ان تین قوتوں کی اصلاح سے نفس کے اندر عدالت و احسان پیدا ہو جائے گا جو کہ تمام اچھے صفات کی بنیاد ہے، اور اسی سے نفس پاک ہو جائیگا اور وہ اچھے اخلاق حاصل ہو جائیں گے جن کی حضور ﷺ نے مندرجہ ذیل احادیث میں تعریف فرمائی ہے۔

(حدیث نمبر ۱) تم میں سے سب سے کامل ایمان والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو، (حدیث نمبر ۲) تم میں سے مجھ کو سب سے زیادہ پسند وہ شخص ہے جو سب سے اچھے اخلاق والا ہے۔"

---

[1] الذريعة إلى مكارم الشريعة ، الفصل الأول، حصول الخلق المحمود، 1/ 95.

دعوت کے باب میں خلق حسن اپنانے کی ضرورت

امر اور نہی کے باب میں اچھے اخلاق اختیار کرنے کی ضرورت اسلئے پیش آتی ہے کہ مخاطب بعض اوقات نامناسب رویہ اور غیر مہذب لب و لہجے سے پیش آتا ہے، جس کے ردِ عمل کے طور پر داعی کا غصہ اس قدر بھڑکتا ہے کہ اس کو دائیں بائیں اور جائز و ناجائز کی تمیز نہیں رہ پاتی، وہ اس کو اپنے نفس کی توہین و تذلیل سمجھ کر اپنی عزت کی بحالی کیلئے (دوسرے کی ہتکِ عزت، گالی گلوچ، مار پیٹ وغیرہ) ہر قسم کے اقدامات عمل میں لاتا ہے۔

بعض اوقات انتقام کی حرارت ناجائز اُمور کے ارتکاب کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے، اور یوں وہ رضاء خداوندی کے لئے دعوت دینے کے بجائے منکرات کا کھلونہ بن جاتا ہے۔

اگر داعی کے اخلاق اچھے ہوں، اور اس نے اپنے نفس کو خلق حسن کا خوگر بنایا ہو تو اس جیسی صورت حال میں ہر شیطانی مکر و فریب سے محفوظ رہتا ہے، جیسا کہ علامہ راغبؒ کے حوالہ سے پہلے درج کیا گیا کہ جب اخلاقی تربیت ہو جائے تو اس کے بعد غصہ اس کے قابو میں آجاتا ہے اور غصہ کے وقت شیطان اس کو اپنی سواری بنا کر ناجائز اُمور کی طرف نہیں پھیر سکتا، بلکہ وہ نفس و شیطان کے ان حربوں کو اچھی طرح پہچانتا ہے اور عین غصہ کے وقت بھی وہ اپنے نفس کو زیر نگین رکھتا ہے، اسلئے مخاطب پر اپنے اس قوت کو بے جا طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ صبر و استقامت کا دامن تھام لیتا ہے۔

یہ تین اہم اور بنیادی آداب ہیں، کامیاب داعی کیلئے ان کے علاوہ بھی کچھ

آداب کی رعایت رکھنی پڑتی ہے، جو در حقیقت ان ہی تین آداب کا ثمرہ ہے، لیکن اہمیت کے پیش نظران کو بھی مختصراً ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

نرمی اور لطف کیساتھ پیش آنا

ایک اچھے داعی کیلئے یہ ضروری ہے کہ مخاطب کیساتھ نرمی اور لطف سے پیش آئے، خیر خواہانہ اور ناصحانہ رویہ اپنا کر امر بالمعروف یا نہی المنکر کرے، مخاطب پر بے جا سختی نہ کرے، اگر دعوت کے اسلوب وانداز سے مخاطب اس کو اپنا بہی خواہ اور خیر اندیش سمجھے تو پھر دعوت ضرور مؤثر ہوگی، انشاءاللہ تعالیٰ، اور اگر بے جا سختی سے کسی سے پیش آیا جائے تو ایسی دعوت عموماً مؤثر نہیں ہوتی بلکہ بسااوقات ایسی دعوت سے مخاطب کے اندر طیش اور انتقام وغیرہ جیسی جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں جس کی وجہ سے فائدہ کے بجائے دینی نقصان ہو جاتا ہے۔

چند قابلِ تقلید مثالیں

اس سلسلہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ بھی یہی تھی کہ وہ مخاطبین کے ساتھ بڑی نرمی اور حکمت ومصلحت کیساتھ پیش آتے بلکہ تمام انبیاء کرام ؑ کی یہی عادت مبارکہ رہی ہے کہ دل سوزی، دردمندی اور اخلاص وشفقت کے ساتھ دعوت دیا کرتے تھے، جس کا تھوڑا سا اندازہ مندرجہ ذیل روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔

"عن أبي أمامة:أن فتى من قريش أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله، ائذن لي في الزنا، فأقبل القوم عليه وزجروه، فقالوا: مه مه، فقال: ادنه ، فدنا منه قريبا،

فقال: أتحبه لأمك؟ قال: لا والله، جعلني الله فداك. قال: ولا الناس يحبونه لأمهاتهم. قال: أفتحبه لابنتك؟.قال: لا والله يا رسول الله، جعلني الله فداك. قال: ولا الناس يحبونه لبناتهم. قال: أفتحبه لأختك؟ قال: لا والله يا رسول الله، جعلني الله فداك. قال: ولا الناس يحبونه لأخواتهم..قال: فوضع يده عليه، وقال: اللهم اغفر ذنبه، وطهر قلبه، وحصن فرجه. قال: فلم يكن بعد ذلك الفتى يلتفت إلى شيء».''

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قریش کا ایک نوجوان حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ مجھے زنا کرنے کی اجازت دیدیجئے، (یہ سن کر) لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور روک ٹوک کرنے لگے، حضور ﷺ نے اس سے کہا کہ قریب ہو جا، وہ آپ ﷺ کے قریب ہوا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تجھے اپنی ماں کیلئے یہ (زنا) پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، میں تم پر قربان ہو جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ لوگ بھی اپنی ماں کیلئے یہ پسند نہیں کرتے۔ پھر فرمایا کہ کیا تم اپنی بیٹی کیلئے پسند کرتے ہو؟ اس نے (پہلے کی طرح) نفی میں جواب دیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ لوگ بھی اپنی بیٹیوں کیلئے ایسا کرنا پسند نہیں کرتے، پھر سوال فرمایا کہ کیا تم اپنی بہن کیلئے اس طرح کرنا چاہتے ہو اس نے حسب سابق نفی میں جواب دیا۔۔(بالآخر) پھر آپ ﷺ نے اس کے سینے پر اپنا ہاتھ مبارک پھیرا اور (دعاء کرتے ہوئے) فرمایا: اے اللہ اس کے گناہ معاف فرما، اور اس کے دل کو پاک کر، شرم گاہ کی حفاظت کر، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ نوجوان کسی چیز کی

طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔"[1]

یہاں اگر اس نوجوان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جاتا، اور غصہ سے اس کو منع کرلیا جاتا تو وہ ہر گز نہ رکتا، جو جذبہ اس کے دل ودماغ پر سوار تھا اور جو فکر اس کو حضور اقدس ﷺ کے دربار عالیہ میں کھینچ لائی اور غیرت وحمیّت، نیکی اور پارسائی سے بھڑے ہوئے اس معطّر مجمع میں اس کو زنا جیسی حرکت کی صریح اجازت حاصل کرنے پر مجبور کر دیا، اس کا بہتر علاج وہی تھا جو حکیم الحکماء حضرت محمد مصطفی ﷺ نے اختیار فرمایا۔

اسی طرح بخاری شریف وغیرہ کتب حدیث میں ایک اعرابی کا قصہ مذکور ہے کہ وہ مسجد میں آکر پیشاب کرنے لگا، صحابہ کرام (بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) اس کی جرأت کو دیکھ اس کی طرف لپکے، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ اس کی اس منکر کر دیکھ حضرات صحابہ کرامؓ نے روکنے کے لیے آواز دینا بھی شروع کر دیا، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ پھر جب وہ پیشاب کر چکا تو آپ ﷺ نے پانی کا ڈول منگوا کر اس پر ڈال دیا، اور صحیح مسلم میں ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد حضور ﷺ نے اس کو بلا کر فرمایا:

" إن هذه المساجد لا تصلح لشيء من هذا البول، ولا القذر إنما هي لذكر الله عز وجل، والصلاة وقراءة

[1] رواه الهيثمي وقال بعدنقله: رواه أحمد والطبراني في الكبير، ورجاله رجال الصحيح. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد،كتاب العلم، باب في أدب العالم ،رقم الحديث: 543،ج129/1)

القرآن۔"

یہ حکیمانہ الفاظ اور ناصحانہ انداز لائق تقلید اور قابل اتباع ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر "باب الرفق فی الأمر کله" باب باندھ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان جیسے تمام اُمور میں حتی الامکان نرمی نرمی سے کام لینا چاہیئے، دعوت کے باب میں اس کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی باب میں ایک اور واقعہ نقل فرمایا جس سے اس کی اہمیت اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ مزید اشکارا ہو جاتا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"دخل رهط من اليهود على رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقالوا: السام عليكم، قالت عائشة: ففهمتها فقلت: وعليكم السام واللعنة، قالت: فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «مهلا يا عائشة، إن الله يحب الرفق في الأمر كله» فقلت: يا رسول الله، أولم تسمع ما قالوا؟ قال رسول الله ﷺ: " قد قلت: وعليكم۔ "

"حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ یہود کی ایک جماعت نبی ﷺ کے پاس گئی، ان لوگوں نے کہا "السَّامُ عَلَيْكُمْ" (ہلاکت ہو تم پر، نعوذ باللہ)، حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے اس کو سمجھ لیا تو میں نے کہا وَعَلَيْكُمْ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ (تم ہی پر ہلاکت اور لعنت ہو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عائشہ ان کو چھوڑو۔ اللہ ہر کام میں نرمی کو پسند کرتا ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ نے سنا نہیں جو اِن لوگوں نے کہا، رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا میں نے بھی تو علیکم کہہ دیا تھا (کہ تم ہی پر ہو۔)" ۔[1]

یہاں ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انتہائی نرمی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا، دوسرے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو سخت لہجہ سے منع فرمایا، تیسرا یہ عمومی اعلان بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام اُمور میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں جس سے پوری اُمت کو یہی سبق ملتا ہے۔

نرم لب ولہجہ اختیار کرنے کا فائدہ

نرم لہجہ اختیار کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان طبعی طور پر اپنے آپ کو کسی سے کم ماننے پر خوش نہیں ہوتا، وہ لاکھ جاہل ہو مگر کسی کے زبانی جہل کی نسبت اپنی طرف کرنا اس کو گوارا نہیں ہوتا، جہالت اور حماقت کی نسبت کرنا بڑا توہین آمیز تصور کیا جاتا ہے جس کو وہ کسی قیمت برداشت نہیں کرتا، اور کسی کو نیکی کا حکم دینا یا برائی سے روکنا در اصل اس بات کا دعوی کرنا ہے کہ وہ اس نیکی اور بدی کو پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا جاننے کے باوجود اپنی حماقت کی وجہ سے اس پر عمل پیرا نہ تھا۔

یہ طعنہ مخاطب انسان کے حق میں غلیظ گالی سے کسی طرح کم نہیں، اسلئے عاجز انسان کا اس طرزِ عمل پر آپے سے باہر آنا، اپنے سے اس نسبت کو دور کرنے اور انتقام لینے کے درپے ہونا ایک لازمی اور بدیہی بات ہے، جس سے مفاسد کا سیل رواں جاری ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، لیکن اگر داعی عاجزی اور نرمی سے دعوت دیدے تو مخاطب کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہی نہیں ہو گا بلکہ وہ اپنے فعل بد پر دل ہی دل میں شرمندہ ہو گا، اور اس ناصحانہ دعوت سے وہ اپنی اصلاح کی فکر کرے گا۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الرفق في الأمر كله ، رقم الحديث: 6024

منکر ختم کرنے کا ایک مؤثر طریقہ کار

امام ابو نعیم نے حضرت صلۃ بن اشیم عدوی رحمۃاللہ علیہ کے حالات میں ان کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ :

"حضرت صلہ بن اشیم اوران کے ساتھیوں کے پاس ایک نوجوان گزرا جو اپنے کپڑے کھینچ کرلے جارہا تھا(یعنی کپڑے ٹخنوں سے نیچے لٹکا کے جارہا تھا) ، حضرت صلہ کے ساتھیوں نے ارادہ کیا کہ اس کو زبان سے خوب کوسے، (حضرت) صلہ نے فرمایا، تمہاری طرف سے میں اس کے معاملہ کیلئے کافی ہوں گا، پھرآپ نے اس نوجوان سے کہا ، اے میرے بھتیجے: مجھے آپ سے کچھ کام ہے،نوجوان نے کہا کیاکام ہے؟صلہ نے فرمایا، میں چاہتا ہوں کہ توزانو تک کپڑا اُٹھائے، نوجوان نے کہاکہ جی ہاں، اور پھر اپنا تہبند اُوپر کیا، توصلہ نے اپنے ساتھیوں سے کہایہ طریقہ اس طریقے سے بہت ہی اچھااور زیادہ لائق تقلید ہے جس کا تم نے ارادہ کیا تھا، اگر تم اس کو برا بھلا کہتے، اس کوتکلیف دیتے تووہ بھی جواب میں برا بھلا کہتا۔"[1]

شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی اورہارون لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کوفرعون کے پاس بھیجتےوقت یہ حکم فرمایاتھاکہ "فقولا له قولا لينا" یعنی اس کے ساتھ نرم بات کرنا گویا دعوت قبول کرنےاوراس سے نصیحت حاصل کرنے میں نرم لہجہ کا خاص دخل ہے، کیونکہ "لعله يتذكر أو يخشى" کو"قول لین" کے ایک

[1] حلية الأولياء وطبقات الأصفياء،ترجمة "أبو الصهباء صلة بن أشيم العدوي2 / 238

ممکنہ نتیجہ کے طور پر ہی ذکر فرمایا گیا کہ اگر فرعون کے ساتھ نرم لب و لہجہ سے گفتگو کی جائے اور نبوی شفقت اور دل سوزی سے اس کے سامنے حقیقت کا اظہار کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے اس ناحق دعوی خداوندی سے باز آجائے۔

حق بات کی طرف جب بھی درست طریقے سے بلایا جاتا ہے یعنی مخاطب کو حکمت و دانائی اور نرمی کے ساتھ سمجھایا جائے اور سمجھانے والے کا دل حضرات انبیاء کرام ؑ جیسی شفقت و اخلاص اور غم و درد کے گوہر نایاب سے مزین ہو تو وہ دعوت صرف زبانی جمع خرچ ہی نہیں رہ پاتی بلکہ مخاطب کے دل کیلئے وہ ایک ایسا تند و تیز تلوار بن جاتی ہے جس کا ڈھال کوئی نہیں اور انجام کار وہ اپنے مراد کو پا لیتی ہے۔

علامہ اقبال نے بالکل سچ فرمایا:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں قوتِ پرواز مگر رکھتی ہے

مخاطب کو اچھے القاب سے پکارنا

امام طبریؒ نے مشہور مفسر امام سدی، اور امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس ؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ "قول لین" سے مراد یہ ہے کہ فرعون کا نام نہ لیا جائے بلکہ اس کے کنیات و القاب ہی ذکر کر دئے جائیں۔

چنانچہ امام طبری فرماتے ہیں:

" ذُكر أن القول اللين الذي أمرهما الله أن يقولاه له، هو أن يكنياه. حدثني جعفر ـ عن السديّ: (فَقُولا لَهُ قَوْلا

لَيِّنًا) قال: كنياه. "[1]

"بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس قول لین" کا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ (مخاطب کی) کنیت بیان کی جائے، مجھے جعفر نے یہ (اپنی سند کے ساتھ) امام سدی سے نقل کیا ہے"

امام ابن جوزی نے اس کی تفسیر میں پانچ اقوال ذکر کئے ہے، جن میں سے تیسرا قول لکھتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

" والثالث: كنِّيَاه، رواه عكرمة عن ابن عباس، وبه قال السدي. "[2]

"تیسرا قول یہ ہے کہ فرعون (یعنی مخاطب) کی کنیت لے (کر دعوت دی جائے) اس کو عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہی سدی کا بھی قول ہے۔"

ان حضرات کی تفسیر سے یہ بھی ایک ضروری ادب معلوم ہوا کہ کسی صاحبِ منصب کو دعوت دیتے وقت یا خطاب کرتے ہوئے اس کا نام نہیں لینا چاہئے، اس سے اس کی بلاوجہ ہتک عزت ہو جاتی ہے جو کہ مقصود نہیں بلکہ دعوتی مقاصد کے لحاظ سے ایسا کرنا بعض اوقات مضر ہوتا ہے، نیز اس طرح کرنے سے مخاطب سے دعوت قبول کرنے کی اُمید بھی بہت کم ہے۔

دعوت دینے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ مخاطب کو اس کے رتبہ و منصب یا کسی مناسب کنیت یا لقب سے پکارا جائے۔

---

[1] جامع البيان، سورة طه، رقم الآية:44، ج18 / 313

[2] زاد المسير في علم التفسير، سورة طه، رقم الآية:44، 3 / 160

لیکن القابات کے سلسلہ میں مروجہ غلو و تجاوز سے گریز کرنا ضروری ہے، آجکل عموما اس کے متعلق احتیاط نہیں برتی جاتی، حالانکہ فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ جو صفات انسان میں موجود نہ ہوں، ان صفات سے اس کو موسوم کرنا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے جس سے بچنا ضروری ہے جیسا کہ اپنے مقام پر تفصیل سے آئیگا۔

آداب کے سلسلہ میں ایک جامع روایت

امام دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے، جس سے مندرجہ بالا بنیادی آداب کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، وہ روایت یہ ہے:

"لا ينبغي للرجل أن يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر حتى يكون فيه خصال ثلاثة رفيق بما يأمررفيق بما ينهى عالم فيما يأمر عالم فيما ينهى عدل فيما يأمر عدل فيما ينهى۔"[1]

"کسی شخص کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، یہاں تک کہ اس میں تین صفات جمع نہ ہو جائیں:

۱۔ جس چیز کی امر یا نہی کر رہا ہے اس کے بارے میں نرمی برتنے والا ہو۔

۲۔ اس کا علم بھی ہو۔

۳۔ خود اس چیز کے بارے میں عادل بھی ہو یعنی خود بھی اس پر عمل پیرا ہو۔"

اس روایت میں ان تینوں بنیادی آداب کا ذکر ہے جو پہلے تحریر کئے گئے،

---

[1] الفردوس بمأثور الخطاب، باب لام ألف،أنس بن مالك، 5 / 137

"رفیق بما یأمر " سے مراد یہ ہے کہ نرم خوئی سے دعوت دی جائے، جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا، نرمی اچھے اخلاق ہی کا نتیجہ اوراسی کا پھل ہے، تو گویا اس کے ضمن میں "اخلاقِ حسنہ" بھی داخل ہوئے۔

دوسرا ادب جو اس روایت میں بیان ہوا وہ علم ہے، جس کی تفصیلات اُوپر درج ہو چکی، اور آخری ادب جس پر یہاں زور دیا گیا وہ عدالت ہے، یعنی جن اُمور سے داعی دوسروں کو منع کرتا ہے خود بھی اس سے رکا رہے جس کی تفصیل "ورع" کے عنوان کے تحت لکھی جا چکی۔

صبر و برداشت

دعوت کے سلسلہ میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ضروری ہے، اگر داعی کے صبر میں کچھ بھی خلل آیا تو اس سے دعوت کی افادیت ختم ہو سکتی ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت لقمان حکیم نے جہاں اپنے بیٹے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصیحت فرمائی، وہاں شفقتِ پدری کے جذبے سے اپنی خداداد حکمت و بصیرت کی روشنی میں یہ اہم گر بھی بتایا کہ بیٹا اس راہ میں آنے والے تکالیف و مصائب کے مقابلے میں صبر کرنا۔

اللہ تعالیٰ اس حکمت و نصیحت اور شفقت و رحمت سے بھرے نصیحت نامہ کو سورۃ لقمان میں ذکر فرماتے ہیں:

"يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۔"

"بیٹا نماز پڑھا کر اور اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر اور تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر، یہ

ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"[1]

اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ دو فریضے ہیں، ایک اپنی اصلاح، اور دوسرا عام مخلوق کی اصلاح، دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت و محنت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں، خصوصاً اصلاح خلق کیلئے امر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے، اس لئے اس وصیت کیساتھ یہ وصیت بھی فرمائی کہ واصبر ۔۔یعنی ان کاموں میں تمہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے، اس پر صبر و ثبات سے کام لو۔"

(معارف القرآن ۷/۳۸)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"نہی عن المنکر ایک ایسی عبادت ہے جس کا تعلق دوسرے افراد کے ساتھ ہے، اس کی وجہ سے مخاطب میں غضب و غصہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی بناء پر بعض اوقات وہ نہی عن المنکر کرنے والے کو مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس کے قتل کرنے کا بھی اقدام کرنے لگتا ہے، اس لئے نہی عن المنکر تمام عبادات و طاعات میں سے مشکل ترین عبادت ہے۔"[2]

صبر و ہمت ایک ایسا ڈھال ہے جس کے ہوتے ہوئے داعی حق کو دنیا جہاں کی کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی، اور یہی صبر ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی وجہ سے داعی دلی

[1] لقمان:17

[2] تفسیر کبیر ج16ص155

دشمن کو بھی نیکی کرنے اور برائی سے منع کرنے پر غیر شعوری انداز میں مجبور کر سکتا ہے، اور اس کی بدولت بند دروازے کھلتے ہیں۔

"عزم الامور" کی تفسیر

عام اردو تراجم و تفاسیر میں عزم الامور کا یہی ترجمہ کیا گیا ہے ، لیکن بعض مفسرین نے اس لفظ کی ایک اور تفسیر فرمائی ہے جس سے صبر کرنے کی مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ عزم درحقیقت کسی کام کے کرنے کے بارے میں دل کا جم جانا ہے، یعنی دلی فیصلہ کو عزم کہا جاتا ہے، تو عزم الامور کا معنی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے اس (پیش آمدہ مصائب پر صبر کرنا) کا فیصلہ ہو چکا ہے، اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو چکنے سے مراد ایجاب ہے، یعنی اس راہ میں مصائب پر صبر کرنا ضروری ہے۔

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہے:

" أی من الأمور التي عزمه الله أی قطعه قطع إيجاب قال رسول الله ﷺ خير الأمور عوازمها أی فرائضها التي عزم الله عليك بفعلها والعزم فی الأصل عقد القلب على إمضاء أمر فالعزم على هذا مصدر بمعنى المفعول۔"

"عزم الامور سے مراد وہ اُمور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے واجب کر رکھا ہو، حضور ﷺ نے فرمایا کہ بہترین اُمور (نیکیاں) "عزائم" ہیں، یہاں

عزائم سے مراد وہ فرائض ہیں جن کے کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ضروری قرار دیا ہو۔"

"عزم" دراصل کسی کام کرنے کے متعلق دل کے مضبوط ارادے کو کہا جاتا ہے، اس تفصیل کے مطابق لفظ "عزم" مصدر ہے، جو کہ مفعول کے معنی میں یہاں (آیت کریمہ کے اندر) استعمال ہوا ہے۔"[1].

اس تفسیر کے مطابق تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں آنے والے مشکلات و تکالیف کو جھیلنا، اس پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا اس راہ کا ایک لازمی اور ضروری جز ہے۔

اس اہمیت وافادیت کے پیش نظر سلف صالحین نے ہر موڑ پر اس کا خاص خیال رکھا، صبر کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے دیا، اور اپنے اہل وعیال اور متعلقین و متوسلین کو بھی ہمیشہ یہی تلقین فرماتے رہے۔

صحابی رسول کی ایک زریں وصیت

چنانچہ حضرت عمیر بن حبیب رضی اللہ عنہ کی وصیت، جو آپؓ نے اپنے بیٹوں کو فرمائی، (اس وصیت پر) غور کرنے سے ان حضرات قدسی صفات کا طرز عمل، انداز فکر اور نکتہ کمال و عروج معلوم ہوتا ہے، حضرات اہلِ علم کی سہولت کے خاطر ذیل میں اس گرانقدر وصیت کے اصل الفاظ نقل کئے جاتے ہیں:

"وإذا أراد أحدكم أن يأمر بالمعروف، وينهى عن

---

[1]التفسير المظهري، سورة لقمان، رقم الآية:17،ج7 / 258

المنکر فلیوطن نفسه علی الصبر علی الأذی، فإنه من یصبر لا یجد للأذی مسا۔"[1]

"تم میں سے جو کوئی نیکی کے حکم دینے اور برائی سے منع کرنا کا ارادہ کرے تو وہ اپنی جان کو تکالیف پر صبر کرنے کا خوگر بنائے کیونکہ جو شخص صبر کرتا ہے وہ تکلیف محسوس نہیں کرتا۔"

یہ ان بنیادی اور لازمی آداب کا مختصر سا خلاصہ تھا، داعی کیلئے ان اوصاف و آداب کی رعایت رکھ لینی چاہئے، تب ہی اس کی دعوت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

۹۹۹

[1] مصنف ابن أبي شیبة،کتاب الأدب، في الرجل یؤمر أن یجالس ویداخل،5 / 234

باب پنجم

- حدیث مبارکہ " من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان" کے متعلق چند ضروری مباحث و تشریحات
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرد کی ذمہ داری ہے یا ریاست کی؟
- تغییر بالقلب سے کیا مراد ہے؟
- "ذلک أضعف الإیمان" کی تشریح و توضیح
- افراد کا اپنے ماتحت لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا
- رعایا کا اپنے ذمہ افراد کو امر اور نہی کرنے کے حدود

اسنادی حیثیت

امام مسلم بن الحجاجؒ نے اپنی صحیح مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے اپنی اپنی سنن میں یہ روایت نقل فرمائی ہیں، صحیحِ مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن طارق بن شهاب - وهذا حديث أبي بكر - قال: أول من بدأ بالخطبة يوم العيد قبل الصلاة مروان. فقام إليه رجل، فقال: الصلاة قبل الخطبة، فقال: قد ترك ما هنالك، فقال أبو سعيد: أما هذا فقد قضى ما عليه سمعت رسول الله ﷺ يقول: «من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان".

"حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ عید کے دن سب سے پہلے نماز سے قبل جس شخص نے خطبہ شروع کیا وہ مروان تھا ایک آدمی کھڑا ہو کر مروان سے کہنے لگا کہ نماز خطبہ سے پہلے ہونی چاہئے مروان نے جواب دیا وہ دستور اب چھوڑ دیا گیا ہے حاضرین میں سے ابوسعیدؓ بولے اس شخص پر شریعت کا جو حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا اب چاہے مروان مانے یا نہ مانے میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جو شخص تم میں سے کوئی بات شریعت کے خلاف دیکھے تو وہ ہاتھ سے اس کو بدل دے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو زبان سے ایسا کرے اگر یہ بھی

ممکن نہ ہو تو دل سے ہی اس کو برا جانے مگر یہ ضعیف ترین ایمان کا درجہ ہے۔"[1]

سند کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح ہے، تمام راوی بالکل ثقہ اور قابل اعتماد ہیں،اسلئے اکثر محدثین نے اس کو اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا۔

امام زین الدین بن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور و مفید کتاب "جامع العلوم والحکم "میں اس پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے، جس میں آپ نے اس کے مختلف طرق وروایات جمع فرمائی ہے، تفصیل کیلئے اس کی طرف مراجعت کی جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق اس حدیث کا مرکزی کردار ہے، فقہاء کرام اور محدثین عظام نے اس حدیث زیر بحث موضوع کے بہت سے مسائل کا استنباط کیا ہیں، اسلئے یہاں بھی اس روایت کی روشنی میں چند اہم اور ضروری مسائل پر غور کیا جاتا ہے۔

دعوت دینے میں ترتیب برقرار رکھنے کی رعایت

باب سوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط کے ضمن میں تفصیل سے اس کا طریقہ کار ذکر ہو چکا کہ داعی کو چاہئے کہ اولاً زبان سے دعوت دیدے اور اس میں ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے وہ تمام حربے استعمال کرے جس

---

[1] صحيح مسلم ، كتاب الايمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان رقم الحديث: 49

سے دعوت دینے کا مقصود حاصل ہو سکے، زبان سے دعوت دئے بغیر پہلی ہی مرتبہ میں ہاتھ سے منکر کو ختم کرنا اور معصیت کے آلات کو توڑنا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔

جبکہ یہ بات اس حدیث مبارکہ کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ یہاں اوّلاً ہاتھ کے ساتھ معصیت کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا اگر مخاطب یہ حربہ استعمال نہ کر سکے تو پھر زبان سے نکیر کرنے کی ترغیب دی گئی، اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے نکیر کرنے پر اکتفاء کرنے کا ذکر کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو پہلے ہی پہل ہاتھ کا استعمال کر لینا چاہیئے، لیکن یہ ظاہر مراد لینا درست نہیں۔

اسی لئے محدثینِ کرام فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ترتیب" مقلوب" ہے یعنی داعی کو اولاً دل سے نکیر کر لینا چاہیئے پھر زبان سے نرمی و خیر خواہی کے ساتھ مخاطب کو گناہ کے کام سے منع کر لینا چاہیئے، اگر اس سے کام نہ چلے تو تیسرے درجہ میں موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے اس مقصد کیلئے ہاتھ کا مناسب استعمال بھی درست ہے۔

علامہ ابن العربی المالکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۴۳ھ) فرماتے ہیں:

"المسألة الرابعة: في ترتيب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر: ثبت عن النبي - ﷺ - أنه قال: «من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان.

وفي هذا الحديث من غريب الفقه أن النبي - صلى الله عليه وسلم - بدأ في البيان بالأخير في الفعل، وهو تغيير المنكر باليد، وإنما يبدأ باللسان والبيان، فإن لم يكن

فباليد. "

"چوتھامسئلہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترتیب کے متعلق ہے، حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" من رأى منكم منكرا فليغيره بيده"۔۔ اس حدیث میں عجیب (نکتہ) یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سب سے آخر میں کئے جانے والے عمل کو پہلے ذکر فرمایا یعنی ہاتھ کے ساتھ معصیت ختم کرنے کو پہلے بیان فرمایا حالانکہ (دعوت دیتے ہوئے) اوّلاً زبان وبیان سے ابتدا کیا جائے گا، اگر اس سے کام نہ چل سکے تو پھر ہاتھ کے ذریعے نکیر کی جائے گی۔"[1]

تغیر اور انکار ایک ہی چیز ہے

اس حدیثِ مبارکہ میں حضور نبی کریم ﷺ نے منکر کے دیکھتے وقت جو اس کو متغیر کرنے اور بدل دینے کا حکم فرمایا وہ در حقیقت نہی عن المنکر ہی کے مختلف درجات ومراحل میں سے ایک ہے، سابقہ ابواب میں نہی عن المنکر کے جو سات مختلف درجات ذکر ہو چکے، اس حدیث مبارکہ میں انہی مختلف درجات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات زبانی طور پر نہی کرنے سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات اس پر اکتفا مفید نہیں ہوتا بلکہ اس سے بڑھ کر ہاتھ استعمال کرنے کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے، "فليغيره بيده" میں اسی طرف اشارہ ہے، غرض تغیرِ منکر نہی عن المنکر کا ایک شعبہ ہے۔

---

[1] أحكام القرآن لابن العربي،سورةآل عمران، رقم الأية: 104،ج1/ 383

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرد کی ذمہ داری ہے یا ریاست کی؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جن نصوص میں امر یا نہی کا حکم دیا گیا، اس کے ترغیبات و ترہیبات بیان فرمائے گئے، وہ تمام نصوص عام اور مطلق ہیں، اس میں افراد یا ریاست کی کوئی قید و شرط نہیں کہ خاص ایک ہی گروہ اس حکم کے مکلف ہیں، دوسرے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بلکہ اس عموم و اطلاق میں افراد و ریاست دونوں داخل ہیں، اور دونوں ہی اپنی اپنی حدود و قیود تک اس بھاری اور اہم حکم کے مخاطب ہیں۔

خلافتِ راشدہ کے دور سے لیکر آج تک تمام مسلمان اس کو اپنی ذمہ داری سمجھتے رہیں اور اسی بنیاد پر ہر موقع و میدان میں اس کا احیاء بھی کرتے رہیں، اس عرصہ میں معتبر و مستند علماء وفقہاء نے کبھی صرف حکومت کے کندھے یہ ذمہ داری ڈال کر اس سے سبکدوشی اختیار نہیں کی، بلکہ جمہوریت کے دلدل میں پھنسنے سے پہلے خلافت جیسی مثالی اور لائق تقلید طرز حکومت میں بعض اوقات حکومت جب کسی ناجائز یا نامناسب روش اختیار کرتی، تو افراد اور رعایا خلیفہ اور حکومت کے حق میں بھی نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے۔

حضرت عمر حفظہ اللہ کے ساتھ ایسا کئی مرتبہ پیش آیا، اور اپنے اُوپر کی جانے والی اس نکیر کو نہ صرف آپ نے خندہ پیشانی اور پشیمانی کیساتھ قبول فرمایا بلکہ صحابہ کرامؓ کے مجمع میں بر سرِ عام نکیر کرنے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

خود حضرات شیخین اور ان کے طریقہ کار کے اقتداء کرنے والے حکام نے بارہا اپنی رعایا کو یہی وصیت فرماتے رہیں کہ اگر خلیفہ یا حکومت کا کوئی بھی فیصلہ یا مسئلہ شرعی اُصول سے میل نہ کھاتا ہو تو بروقت حکومت کو خبردار کرنا، اس مسئلہ کی

مخالفت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے جس کو تم نے نبھانا ہے۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ افراد وریاست دونوں ہی اس کے مکلف ہیں، اسی لئے تمام اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ فی نفسہ یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے) احکام حکومت ہی کیساتھ مختص نہیں، بلکہ انفرادی طور پر افراد بھی اس کے مکلف ہیں۔

عوام کا ہاتھ اور قوت کے ذریعے منکر کو روکنے کا حکم

البتہ نہی عن المنکر یا تغییر منکر کی جن صورتوں میں ہاتھ یا اسلحہ کے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے، افراد و رعایا کو اس کا بھی اختیار ہے یا یہ صرف حکومت ہی کا منصب اور اسی کی ذمہ داری ہے؟

اس نکتہ میں دونوں قسم کی آراء ہیں، بعض حضرات اس کو حکومت کے سپرد کر دینے کے قائل ہیں، یہ حضرات افراد کیلئے اس کا استعمال درست نہیں سمجھتے، جبکہ بعض دیگر اہل علم کا مؤقف یہ ہے کہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ تمام صورتیں افراد و رعایا کے دائرہ قدرت واختیار بلکہ حدود تکلیف میں داخل ہیں۔

ذیل میں دونوں نکتہ نظر کے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

پہلے نقطہ نظر کے دلائل

ان حضرات کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ عوام کو یہ اختیار دینا فتنہ وفساد کا موجب ہے، جب ہر آدمی کو یہ اجازت دی جائیگی تو افراتفری پھیل جائے گی، ذاتی انتقام اور دلی بھڑاس نکالنے کیلئے اپنے دشمن کے گناہ میں مشغول ہونے کا انتظار کیا جائیگا،

گناہ کی حالت میں دیکھ کر نہی عن المنکراور تغییرِ منکر کے بجائے ذاتی انتقام لینے کا راستہ کھل جائیگا، ہر ظالم حکومت کے قابو سے بچنے کیلئے اسی راہ کو اپنائے گا، یوں ایک منکر ختم ہونے کے بجائے ناجائز ضرب و شتم، ایذاء مسلم واتلاف اموال، جھوٹ وغلط بیانی، غلط گواہی و رشوت ستانی، قتل و غارت وغیرہ جیسے ہزاروں گناہوں اور منکرات کا نہ ختم ہونے سلسلہ پورے مسلم معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا، اسلئے افراد کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

حضرات فقہاء کرام نے بھی متعدد عبارات میں ذکر فرمایا ہیں کہ "فليغيره بيده" کا خطاب حکومت اور اس کے مجاز افراد کیلئے ہے، علماء کرام کو صرف "فبلسانه" کا حکم ہے اور اس کے علاوہ افراد کیلئے "فبقلبه" کا خطاب ہے، اربابِ حکومت کے علاوہ علماء اور عوام کو ہاتھ سے کسی منکر کے ازالہ یا تغییر کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

فقہاء کرام کی عبارات سے استدلال

چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور اور معتبر کتاب "ہدایہ" میں لکھا ہے:

"والأمر بالمعروف باليد إلى الأمراء لقدرتهم وباللسان إلى غيرهم۔"[1]

"ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف کا اختیار ارباب حکومت کو حاصل ہے کیونکہ وہی اس پر قادر ہیں، اور زبان سے امر کرنا دوسرے لوگ کیلئے بھی درست ہے۔"

[1] الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب الغصب، فصل: في غصب ما لا يتقوم، 307/4

فتاوی ہندیہ، البحر الرائق، اور تبیین الحقائق میں بھی یہی لکھا ہے، عبارات مندرجہ ذیل ہیں:

"ویقال الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء وباللسان علی العلماء وبالقلب لعوام الناس وهو اختیار الزندویستي كذا في الظهیریة."[1]

بحر میں ہے:

"وفي الظهیریة الأمر بالمعروف بالید علی الآمر، أو باللسان علی العلماء وبالقلب علی عوام الناس وهو اختیار الزندویسي."[2]

دوسرے نقطہ نظر کے مستدلات

ان حضرات کے نزدیک حکومت ہی کیساتھ ہاتھ سے تغییر منکر کا خاص و مقید کرلینا اور اس کے علاوہ غیر مجاز افراد کے حق میں اس کو بالکل ممنوع قرار دینا مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر درست نہیں۔

پہلی وجہ

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا کہ امر بالمعروف اور نہی عن

[1] الفتاوی الهندية، كتاب الكراهية، الباب السابع عشر في الغناء واللهو وسائر المعاصي والأمر بالمعروف،5 / 353-

[2] البحر الرائق شرح كنز الدقائق، كتاب الكراهية، قبيل فصل في اللبس،8/ 215

المنکر یا تغییر منکر کی جتنی بھی نصوص وارد ہیں، اُصول کے لحاظ سے وہ سب نصوص والفاظ اس لحاظ سے عام اور مطلق ہیں کہ ان میں حکومت کی کوئی قید نہیں، عموم واطلاق کے لحاظ سے پوری اُمت کو خطاب ہے اور پوری ہی اُمت اس بات کی مکلف ہے، لہٰذا بلا دلیل اس عام کو خاص کرنا (اگرچہ بعض صورتوں ہی کے اعتبار سے ہو) کسی طرح قابل قبول نہیں۔

دوسری وجہ

حدیث "من رأی منکم منکرا" میں صحابہ کرامؓ کو خطاب ہیں، اور حضور ﷺ کے حیات میں حاکم آپ ﷺ خود ہی تھے، صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے محکوم تھے، پھر بھی ان کو خطاب فرمایا اور وہ بھی لفظ "من" کیساتھ، جو عموم کا مقتضی ہے، اس سے یہی سمجھ آتا ہے کہ محکوم کی بھی یہ ذمہ داری ہے۔

تیسری وجہ

اسی حدیث شریف میں جو تین درجہ بندی کی گئی، اس سے بظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ پوری اُمت کو خطاب کیا جارہا ہے، "فمن لم یستطع فبلسانه" "فمن لم یستطع فبقلبه" اس کا واضح قرینہ ہے، کیونکہ اربابِ حکومت اور سلاطین کو عام طور پر عدمِ استطاعت اور خاص کر باللسان سے (کہ کسی کو حق بات کہنے کی استطاعت ہی نہ ہو) واسطہ پیش نہیں آتا، بلکہ عام افراد ہی کو حالات وافراد اور مختلف مواقع کے لحاظ سے ان حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

چوتھی وجہ

منکرات پر نکیر کرنے کے اور بھی درجات ہیں، ان میں سے پہلے تین درجات کا اختیار بالاتفاق حکومت اور عوام دونوں کو حاصل ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اور ایسی کوئی نص ہماری نظر سے نہیں گذری کہ جس میں یہ درجہ بندی کی گئی ہو کہ پہلے تین یا چار درجات کا اختیار تو تمام افراد کو حاصل ہے لیکن باقی درجات کے مخاطب صرف اصحاب حکومت ہیں، عوام کو اس کا اختیار حاصل نہیں۔

پانچویں وجہ

قرآن کریم میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے، اس طویل واقعہ کا ایک جزوہ بھی ہے جواللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں ذکر فرمایا، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم سے فرمایا:

" وَتَاالله لَأَكِيدَنَّ أَصنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ"فَجَعَلَهُمْ جُذاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ۔"

"اوراللہ کی قسم میں تمہارے بتوں کا علاج کروں گا جب تم پیٹھ پھیر کر جا چکو گے۔پھر ان کے بڑے کے سوا سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ اس کی طرف رجوع کریں"۔[1]

سوچنے کا مقام ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکومت وسلطنت حاصل نہ تھی، بلکہ بادشاہت کے سارے تخت وتاج پر آپ کا دشمن" نمرود"ہی

[1] سورة الأنبياء، رقم الآية 57،58

واحد متمکن اور قابض تھا، حکومت اور رعایا دونوں آپ کے دعوت کے خلاف کھڑے تھے، ان سنگین حالات میں آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس سوائے ایک کے سارے بتوں کو توڑ ڈالا، کیونکہ ان کی معصیت اور نکیر کا تعلق یہی بت ہی تھے، یہی ان کے معبود و مشکل کشا مانے جاتے تھے، اس پر پوری قوم سیخ پا ہوئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الجملہ سرکاری طور پر غیر مجاز افراد کو بھی ہاتھ کیساتھ منکر ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

چھٹی وجہ

قرآنِ کریم میں سیدنا حضرت موسی ﷺ کا واقعہ بھی متعدد مقامات پر کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کیساتھ مذکور ہے، سورۃ طٰہ کے اندر اس واقعہ کو جس انداز سے ذکر فرمایا گیا اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ نے سامری کو اپنے فعلِ بد پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"انْظُرْ إِلَى إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۔"

"تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو جما بیٹھا تھا ہم اسے ضرور جلادیں گے پھر اسے دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔(ترجمہ حضرت تھانوی صاحب)"[1]

یہاں حضرت موسی ﷺ نے بھی اپنے مبارک ہاتھوں سے اس

---

[1] طه: 97

نکیر کے خاتمے کا اعلان کیا۔

ساتویں وجہ

بعض خاص صورتوں میں خود حکومت کے خلاف اس طرح اقدام کی ضرورت پیش آجاتی ہے، وہاں ظاہر ہے کہ یہ کام افراد ہی سرانجام دیں گے۔

آٹھویں وجہ

ان ہی وجوہات کی بناء پر اُمت کے اسلاف واکابر اور علماء وفقہاء کا اجتماعی تعامل وتوارث بھی یہی رہا ہے کہ جہاں کہیں ہاتھ سے منکر کے تغییر کی ضرورت پیش آتی تھی تو یہ حضرات (شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے) ہاتھ سے بھی اس کا ازالہ کیا کرتے تھے، اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں۔

یہ صرف اولیاء کرام یا صوفیاء ہی کا معمول نہیں تھا جس کو ورع و تقوی یا دینی غیرت وحمیت پر حمل کر کے غیر ضروری قرار دیا جائے، بلکہ مستند ائمہ، فقہاء، محدثین اور علماء کا بھی یہی شیوہ رہا، جس سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ ہاتھ کیساتھ منکر کا ازالہ صرف حکومت یا اس کے منتخب کردہ افراد ہی کیساتھ خاص نہیں، بلکہ تمام اُمت اس کی مکلف ہے۔

اُمت کا تعامل

علامہ ابن حزم (المتوفی ۴۵۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ وتابعین، فقہاء ومجتہدین، علماء اور اولیاء کرام کی ایک طویل فہرست ذکر فرمائی ہے، جنہوں نے اپنی زبان وفتوی سے اس رائے کا اظہار کیا، یا اپنے فعل وعمل سے اس کا ثبوت دیا۔

آپ تاریخی پس منظر میں تحریر فرماتے ہیں:

"وذهبت طوائف من أهل السنة وجميع المعتزلة وجميع الخوارج والزيدية إلى أن سل السيوف في الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر واجب إذا لم يمكن دفع المنكر إلا بذلك قالوا فإذا كان أهل الحق في عصابة يمكنهم الدفع ولا ييئسون من الظفر ففرض عليهم ذلك وإن كانوا في عدد لا يرجون لقلتهم وضعفهم بظفر كانوا في سعة من ترك التغيير باليد وهذا قول علي بن أبي طالب رضي الله عنه وكل من معه من الصحابة وقول أم المؤمنين عائشة رضي الله عنها وطلحة والزبير وكل من كان معهم من الصحابة وقول معاوية وعمرو والنعمان بن بشير وغيرهم ممن معهم من الصحابة رضي الله عنهم أجمعين وهو قول عبد الله بن الزبير ومحمد والحسن بن علي وبقية الصحابة من المهاجرين والأنصار والقائمين يوم الحرة رضي الله عن جميعهم أجمعين وقول كل من أقام على الفاسق الحجاج ۔۔وهو الذي تدل عليه أقوال الفقهاء كأبي حنيفة والحسن بن حيي وشريك ومالك والشافعي وداود وأصحابهم فإن كل من ذكرنا من قديم وحديث إما ناطق بذلك في فتواه وإما الفاعل لذلك بسل سيفه في إنكار ما

راٰه منكرا۔"[1]

"اہل سنت والجماعت میں سے متعدد جماعتیں ،تمام معتزلہ،تمام خوارج اور تمام زیدیہ کامسلک یہ ہے کہ جب کسی منکر کو تلوار استعمال کرنے ہی کے ذریعے ختم کیاجاسکتاہو تو (ایسی صورت حال میں) تلوار کااستعمال بھی ضروری ہے، یہ سارے حضرات کہتے ہیں کہ جب اہل حق کی اتنی جماعت ہوکہ جو منکر کوروک سکے، ختم کرسکنے سے ناامید نہ ہوں توان(اہل حق) کا فرض ہے کہ منکر ختم کریں،اوراگران کی تعداداتنی ہوکہ اپنے کمی یا کمزوری کی وجہ سےاس باب میں کامیاب ہونے کی امید نہ ہوتوپھرہاتھ سے متغیر نہ کرنے کی بھی گنجائش ہے(گودل میں اس کو براجاننابہرحال ضروری ہے)یہی حضرت علی اوران کے ساتھ ملے ہوئے تمام صحابہ کرام، حضرت عائشہ، طلحہ، زبیراوران کے ساتھ ملےہوئےتمام صحابہ کرام (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کاقول ہے، حضرت امیر معاویہ، عمرو(بن العاص)نعمان بن بشیراوران کےساتھی تمام صحابہ کرام (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کا بھی یہی مؤقف ہے، عبداللہ بن زبیر، محمد، حسن بن علی اور باقی تمام مہاجرین وانصار صحابہ کرام اور حرہ کے دن موجود تمام حضرات کایہی نقطہ نظرہے(بلکہ اس کے بعد)جولوگ حجاج بن یوسف کے مقابلے میں کھڑے ہوئےان تمام حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، اوراسی مؤقف پرامام ابوحنیفہ، حسن بن حی، شریک ، امام مالک، شافعی ،داؤداوران تمام کے شاگردوغیرہ جیسے حضرات فقہاء کرام کےاقوال بھی دال ہیں، کیونکہ مندرجہ بالاتمام حضرات نےیاتوفتویٰ میں اس قول کی صراحت کی یاعملاً منکر ختم کرنے میں تلوار کاسہارالیا۔"

---

[1] الفصل في الملل والأهواء والنحل، الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر،4/ 132

پہلے نکتہ نظر کے دلائل کا مختصر تجزیہ

شرائط کے بیان کے سلسلہ میں یہ بات ذکر ہوچکی کہ جہاں کہیں انکار کرنے کی صورت میں شرعی مفاسد جنم لینے کا خدشہ ہو، یا کسی منکر پر نکیر کرنے کے نتیجہ میں اس سے بڑے منکر پیدا ہونے کا ڈر ہو، تو وہاں نکیر وانکار کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، امر اور نہی کے درجات ومراتب کے سلسلے میں یہ بات بھی گذر چکی ہے کہ کم سے کم جس اقدام سے مخاطب منکر سے باز آجائے اسی کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

سات مختلف درجات میں اگر کہیں نچلے اور ہلکے درجے کو اختیار کرنے سے منکر ختم ہوسکتا ہے تو داعی کیلئے اس سے بڑے درجہ کے اقدام کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اصل مقصود یہ ہے کہ منکرات کا سلسلہ ختم ہوجائے یا اگر ختم نہ ہو تو کم سے کم تر کیا جاسکے، منکر کے ارتکاب کرنے والے کو سزا یا تعزیر دینا مقصود نہیں، نہ ہی ذاتی جذبہ کو پورا کرنا درست ہے، بلکہ ذاتی اغراض ومقاصد اور انتقام کی حرارت کو پس پشت ڈال کر بقدر ضرورت انکار کرنا ضروری ہے۔

ان اُمور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان ممکنہ خرابیوں اور مفاسد سے بخوبی بچا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے فریقِ اول نے رعایا کو یہ اختیار نہیں دیا، مفاسد کے خوف سے عوام پر سے یہ اختیار بلکہ ذمہ داری کا بوجھ ختم کرنا اور صرف حکومت ہی کو یہ منصب دیدینے کے نتیجہ میں جب گناہ کا مرتکب دیکھے گا کہ میں کچھ بھی کروں، کوئی روک ٹوک والا نہیں، اس طرح معاشرہ میں گناہوں کی جرأت زیادہ ہوجائیگی، ماحول گناہ و مفاسد کے اثرات وعواقب سے مالامال ہوجائیگا جس سے نیک دل مسلمان اور صالح

انسانوں کے اعمال واخلاق بگڑنے کا قوی اندیشہ ہے۔

اسلئے مسئلہ کے دونوں پہلوپر غور کرنےاور مثبت و منفی دونوں زاویوں پر سوچ و بچار کرنے اور مصالح ومفاسد کا جائزہ لینے سے یہی صورت اندازتاً مفیداور مزاجِ اسلام کے قریب معلوم ہوتی ہے کہ پوری ہی اُمت اس کی مکلف ہے،اور تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے۔

ایک ضروری وضاحت

لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ شرائط سے صرف نظر کر کے اندھا دھند ہر آدمی محتسب بنا پھرے، بلکہ کتاب کے شروع میں جو شرائط وارکان مذکور ہوئے، ان کی پاسداری انتہائی ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ انکارِ منکر ثواب وطاعت کے بجائے خود منکر ومعصیت بن جائے،اور خود یہ نکیر قابلِ نکیر ٹھہر جائے۔

اسی طرح داعی کے جواوصاف کتاب میں درج ہوئے، ان کی بھی رعایت رکھ لینی چاہئے، تب ہی اس پروہ مبارک اثرات وفضائل مرتب ونمودار ہوں گے جواحادیث میں آپ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں، انکار منکر کے اس طریقہ کار کواپنانے سے معاشرہ معاصی سے بڑی حد تک کسی قدر محفوظ ومامون ہو جائیگا، ہر برائی کیلئے یہ عادت ڈھال بن جائیگی جوانشاءاللہ معاشرہ وماحول کواس کے زہریلے اثرات سے بچائے رکھے گی، یوں ہی نئی نسل کی نشوونماایک پاک دینی ماحول اور مذہبی گھرانے میں ہوگی جس کے پھل وپھول سے پوری اُمت مسلمہ خوشحال وشادمان رہے گی۔

کیاہاتھ سے منکر ختم کرنا فساد ہے؟

معصیت کے ختم کرنے اور منکر کے ازالہ میں اگر کہیں ہاتھ استعمال کرنے یا کسر وضرب کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو منکر یا فساد نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ مسلمان کی ذمہ داری ہے، البتہ شرائط کا خیال ولحاظ رکھنا ہر جگہ ضروری ہے۔

بعض لوگوں نے سیّدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے صبر واستقامت اور اولوالعزمی سے یہ غلط استدلال کیا کہ منکر سے روکنے کیلئے ہاتھ کا استعمال اور ضرب وقتل جائز نہیں، علامہ ابن حزم (المتوفی ۴۵۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑا اچھا جواب لکھا۔

آپ اپنی کتاب "الملل والنحل" میں اس استدلال پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل کو لیکر جو اعتراض کیا (کہ منکر ختم کرنے میں ہاتھ کا استعمال درست نہیں، تو یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ) حضرت عثمان کو ہرگز یہ یقین نہ تھا کہ یہ (حملہ آور) لوگ مجھے قتل کریں گے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ بس (چند دن) محاصرہ کریں گے، حضرت عثمان کا یہ مؤقف نہ تھا بلکہ امام عادل کے دفاع کیلئے قتال کو وہ فرض سمجھتے تھے، اسلئے ان لوگوں کا یہ استدلال درست نہیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ اس طرح (ہاتھ کے ساتھ زبردستی منکر کے ازالہ) کرنے میں محرمات کو مباح سمجھنا، خون بہانا، دوسرے لوگوں کا مال لینا، پردہ اور خفیہ چیزوں کا ظاہر کرنا اور افراتفری وانتشار پھیلانا ہے، دوسرے لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کیلئے ناجائز چیز کا ارتکاب کرنا، کسی کا ناحق مال لینا جائز نہیں، نہ ہی ان لوگوں سے تعرض کرنا درست ہے جو اس سے ازخود

قتال نہیں کرتے، اگر داعی اس طرح کرتا ہے تو یہ خود ایسا منکر ہے جس کو ختم کرنا ضروری ہے۔

(اسلئے مندرجہ بالا کسی الزام کا موقع نہیں آتا، رہاں خون بہانے کا الزام، تو) منکر کے مرتکب افراد کے ساتھ قتال کرنا داعی پر فرض ہے، باقی رہا منکر کے مرتکب افراد کو اور لوگوں کو قتل کرنا، ان کا مال لینا تو یہ سارے وہ منکرات ہیں جن کا ختم کرنا ضروری ہے۔

نیز اگر (بالفرض مندرجہ بالا باتوں سے اتفاق کیا جائے اور) ان چیزوں کی ڈر سے تغییرِ منکر اور امر بالمعروف کو منع کیا جا سکے تو بالکل یہی اُمور اہل حرب کے ساتھ جہاد کرنے سے بھی مانع ہونے چاہئیں، حالانکہ یہ کوئی بھی مسلمان نہیں کہہ سکتا (کہ جہاد ناجائز ہے) اگرچہ اس میں کفار کے ہاتھوں مسلمان عورتوں بچوں کے قید ہونے، ان کا مال لوٹنے اور خون بہانے کی نوبت ہی کیوں نہ آئے، تمام مسلمانوں کے نزدیک اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان تمام باتوں کی موجودگی میں بھی جہاد واجب ہے، (اور جب جہاد کے بارے میں یہ مسئلہ ہے تو تغییر منکر اور جہاد) دونوں اُمور میں کوئی فرق نہیں، دونوں ہی قرآن وسنت کی طرف دعوت اور جہاد ہیں۔"[1]

پہلے نکتہ نظر میں پیش کردہ عبارات کا تجزیہ

جہاں تک پیش کردہ عبارتوں کا مسئلہ ہے جن سے فریقِ اوّل نے اپنے مؤقف پر استدلال فرمایا، اس کے بارے میں دیگر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ فقہ حنفی میں بنیادی

[1] الفصل في الملل والأهواء والنحل، الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، 134 / 4

طور پر اس قسم کی دو قسم کی عبارات ہیں:

ایک تو ہدایہ کتاب الغصب کی مذکورہ عبارت، تقریباً تمام حنفی فقہاء کرام نے اس مسئلہ کی تفصیل میں امام صاحب کی طرف سے یہی دلیل ذکر فرمائی ہیں۔

اور دوسری عبارت فتاویٰ ظہیریہ کی ہے جو یہی سے بحر و ہندیہ وغیرہ دیگر شروح و فتاویٰ میں مذکور ہیں۔ اس کے علاوہ تفسیر قرطبیؒ اور غنیۃ الطالبین وغیرہ بعض کتابوں میں بھی یہی مؤقف مذکور ہے۔

اس مسئلہ سے متعلق تمام فقہاء کرام اور متکلمین کے کلام پر غور کرنے کے بعد درج ذیل باتیں ثابت ہو جاتی ہیں: [1]

۱۔ آلات معصیت توڑ ڈالنا انکار منکر ہی ہے۔

۲۔ ہدایہ وغیرہ عبارات میں امام صاحب اور صاحبین کا جو اختلاف مذکور ہے، وہ اس کے متعلق نہیں کہ آلات معازف توڑنا جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ وہ اختلاف ضمان کے لازم ہونے اور نہ ہونے میں ہے (کمافی الشامی)۔

۳۔ یہ اختلاف ان ہی آلات کے متعلق ہیں جن کا معصیت کے علاوہ کوئی جائز استعمال بھی موجود ہو، ورنہ بالاتفاق ضمان بھی لازم نہ ہوگا۔ (کمافی الشامی)

۴۔ نیز یہ اختلاف تب ہی ہے جب منکر کا مرتکب کا اسکے بغیر گناہ سے باز آرہا ہو، ورنہ بصورت دیگر تینوں ائمہ احناف کے نزدیک ضمان لازم ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ (کمافی

[1] پہلی طباعت میں اس جگہ مذاہب ائمہ اربعہ اور اہل ظواہر کی کتابوں سے اس مسئلہ کے متعلق متعدد عبارات بڑے بسط و تفصیل کے ساتھ نقل کی گئی تھیں، جو تقریباً اٹھارہ صفحات پر محیط تھیں اور یہ جو نمبروار باتیں یہاں ذکر کی گئی ہیں یہ انہی عبارات کی روشنی میں لکھی گئی تھیں اور انہی سے مستخرج تھیں، لیکن آسانی اور روانگی برقرار رکھنے کی غرض سے اس دوسری طباعت میں ان عبارات کو شامل نہیں کیا گیا البتہ جس بات میں ضرورت معلوم ہوئی وہاں اصل کتاب کا حوالہ دیا گیا۔

الشامی ایضا)

۵۔یہ جو اختلاف منقول ہے یہ یا تو نکیر کرنے والے کے تعدی کی صورت میں ہےکما یعلم من عبارة المبسوط و التبيين، یامخاطب کے استعمال نہ کرنے پر محمول ہے کہ صرف اس کے پاس موجود ہوں، وہ بالفعل استعمال نہیں کر رہاکما فی حاشية الشلبی، یااس مسئلہ میں امام صاحب کا بھی وہی قول ہے جو بعض دیگر حضرات کا ہے جس کو علامہ ابن حزمؒ نے الملل والنحل میں تفصیل سے بیان فرمایاہے، اور بعض حضرات کا یہ قول مرجوح اور غیر مفتی بہ ہےکما فی نفس الكتاب۔

۶۔امام صاحب کے دلیل کے سیاق میں ان کی طرف سے صاحبین کے قول کے جواب میں جو یہ عبارت اکثر کتب میں موجود ہے"الأمر بالمعروف باليد إلى الأمراء...الخ" یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ تمام احوال واوقات میں اس سے استناد لیا جائے، بلکہ یہ اکثر اوقات اور اغلب احوال پر محمول ہے کہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، عوام کو ہاتھ استعمال کرنے کی گنجائش بہت کم ملتی ہے۔

۷۔اس قسم کے تمام عبارات میں تطبیق کی بہترین صورت وہی ہے جو علامہ ابن الحاج کی کتاب ''المدخل'' میں ذکر فرمائی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

وقد قال العلماء رحمة الله عليهم إن التغيير باليد متعين على الأمراء وباللسان متعين على العلماء وبالقلب متعين على غيرهما، وما قالوه هو في غالب الحال، وإلا فقد نجد كثيرا منه يتعين تغييره باليد على غير الأمير وغير العالم فضلا عنهما.وإذا كان الأمر كذلك

فينقسم التغيير بالنسبة إلى العالم قسمين: قسم يتغير باليد، وقسم يتغير باللسان، والشاذ النادر الذي يتعين عليه بالقلب.[1]

۸۔ اگر امام صاحب کے قول کی کوئی توجیہ واحتمال نہ بھی ذکر کیا جائے تو بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ مفتی بہ قول بہر حال حضرات صاحبین تصحیح وتنقیح کا ہے۔

۹۔ ضرورت کے وقت بقدر ضرورت تمام مسلمانوں پر حدیث مذکور میں ذکر شدہ تینوں طریقوں سے منکر کی تغییر اور اس کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اسی پر تمام اُمت کا اتفاق و اتحاد ہے۔

۱۰۔ بہت سے تابعین اور ائمہ دین نے ضرورت کے وقت اس پر عمل کیا ، حالانکہ ان کو حکومت اور سلطنت بالکل حاصل نہ تھی۔

۱۱۔ تغییر منکر کی جن صورتوں میں اسلحہ اٹھانے اور اعوان وانصار کو اکھٹا کر کے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت پیش آجائے، اس کا اختیار رعایا کو ہے یا یہ حکومت ہی کا منصب اور اسی کی ذمہ داری ہے؟

حضرات شوافع کے اس باب میں دو قول ہیں، ان میں سے بہت سے حضرات نے پہلی ہی شق کو ترجیح دی ہیں۔

۱۲۔ حضرات حنابلہ کے ہاں بھی فی الجملہ منکر کو ختم کرنے کیلئے ہاتھ استعمال

---

[1] المدخل لابن الحاج، فصل فى العالم و كيفية نيته جزء 1 ص 70 (ناشر: دار التراث)

کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

امام صاحب کے قول کی بنیاد اور موجودہ حالات میں اسکی اہمیت

باب دوم میں شرائط کے اندر یہ بات تفصیل سے ذکر کی جاچکی ہے کہ داعی کیلئے منکر سے روکتے وقت اس بات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس کے نکیر کرنے کے کیا کچھ نتائج برآمد ہوں گے؟ تغیرِ منکر سے پہلے متوقع مصالح و مفاسد کا موازنہ کرے، اگر نکیر کرنے میں مصالح زیادہ معلوم ہوں تو پھر ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر اخلاص وخیر خواہی کے جذبہ سے نکیر کرے ورنہ اگر مفاسد کا پلہ بھاری ہو تو خاموش ہی رہے، ایک منکر کو ختم کرنے کے لئے کئی منکرات کا سبب بننا کوئی معقول بات نہیں۔

شاید حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بناء پر عوام کو کسی گناہ پر نکیر کرتے وقت ہاتھ استعمال کرنے سے منع فرمایا کہ عام حالات میں اس سے مفاسد ہی جنم لیتے ہیں، ہاتھ کے ساتھ معصیت روک لینے پر اگر وقتی طور پر کچھ ردعمل سامنے نہ بھی آجائے تو بھی ایسا اقدام کرنا کئی ایک معاصی کیلئے خشتِ اوّل ثابت ہوتا ہے، جانبین کے درمیان بغض وعداوت کی فضا قائم ہو جاتی ہے جس کے بعد انتقامی جذبات کی لہر میں حدود پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور یوں ایک معصیت سے روکنا منکرات کے ایک لمبے سلسلے کا سبب بن جاتا ہے۔

دوسری طرف تمام افراد کو کھلی چھٹی دیدینے کی صورت میں انضباط مشکل ہو جاتا ہے، تغیرِ منکر کی آڑ میں ذاتی مفادات پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے جس سے ملک کے اندر فتنہ و انتشار پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے، اسلئے امام صاحب کے حساس فکر و نظر

نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور اسی بناء پر عوام کو سرے سے اس کی اجازت ہی نہ دی۔

بالکل اسی خدشہ کے پیشِ نظر بعد کے ادوار میں بہت سے اربابِ علم نے بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو اختیار کیا ۔

پوری بحث کا نچوڑ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اُصولی لحاظ سے اگرچہ دوسرے نقطہ نظر کے دلائل قوی اور مناسب معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے جو کڑی شرائط اور حدود و قیود خود ان حضرات نے مقرر فرمائی ہیں اس کی پابندی اور ہر موقع پر اس کا کما حقہ لحاظ رکھنا ہر شخص سے ہر جگہ نہایت مشکل ہے، دوسری طرف دوسرے نقطہ نظر رکھنے والے حضرات نے جن تحفظات کی وجہ سے اس رائے کو اختیار فرمایا ہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی اس بات سے پہلو تہی کی جا سکتی ہے کہ تھوڑی سی بے احتیاطی اور معمولی جذباتیت منکرات کے لا متناہی سیل رواں کا بند توڑ سکتی ہے ،اس لئے ان جیسے خدشات کے وقت عملی میدان میں دوسرے ہی مؤقف پر عمل کرلینا چاہئے۔

تاہم اگر کسی جگہ داعی کو یقین یا ظن غالب ہے کہ اگر وہ تغییر منکر کے سلسلہ میں ہاتھ بھی استعمال کرے تو مخاطب کی طرف سے کوئی فساد یا منکر وجود میں نہیں آئے گا مثلاً اپنے ماتحت افراد کسی منکر میں مبتلا ہیں، تو ایسی حالت میں ہاتھ سے بھی منکر کا ازالہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں بھی ان تمام شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہے جو سابقہ ابحاث میں تفصیل سے ذکر کی جا چکی ہیں۔

تغییر بالقلب سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں جو "فإن لم يستطع فبقلبه" فرمایا، یعنی اگر کوئی شخص ہاتھ اور زبان سے کسی منکر کو ختم نہ کر سکے، تو دل سے نکیر کرے، اس سے کیا مراد ہے؟ یعنی اگر داعی ہاتھ اور زبان سے منکر پر نکیر نہ کر سکے تو وہ آخری کونسا درجہ ہے جس کو اختیار کرنے کے بعد وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے؟ اس حدیث مبارکہ میں آخری درجہ "تغيير بالقلب" مذکور ہے، اسکے بارے میں تمام نصوص اور محدثین کرام کی تشریحات کا حاصل یہ ہے کہ:

الف: دیکھنے والا دل میں اس منکر کو گناہ اور معصیت خداوندی یقین کرے۔

ب: اس عمل سے بغض و نفرت رکھے۔

ج: عملاً اس منکر سے بالکل جدا ہو جائے اور کسی طرح اس میں شریک نہ ہو۔

د: اپنے چہرے اور طرزِ عمل سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔

س: یہ استحضار کرے کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو یہ منکر ختم کرتا۔ اور یہ عزم رکھے کہ آئندہ جب بھی قدرت ہو گی میں اس منکر کو ختم کروں گا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"إنه يصيب من أمتي آخر الزمان من سلطانهم شدائد، لا ينجو منه إلا رجل عرف دين الله فصدق به، ورجل عرف دين الله فسكت عليه، فإن رأى من يعمل الخير أحبه عليه، وإن رأى من يعمل بباطل أبغضه عليه،

فذلك ينجو على إبطانه كله ـ"

"میری اُمت کو آخری زمانہ میں اپنے حکمرانوں کی طرف سے (دینی یا دنیاوی) سختیاں اور بلائیں جھیلنا پڑیں گی اور اس وقت ان بلاؤں اور سختیوں سے نجات کی راہ پانے والا (ایک شخص تو) وہ ہوگا جو اللہ کے دین کو سمجھے گا ، اوراس کی تصدیق کرے گا ،اور(دوسرا شخص وہ ہوگا) جو اللہ تعالیٰ کی دین کو پہچان لے گااور سکوت اختیار کرے گا ، (اس شخص کی حالت یہ ہوگی کہ)وہ جب کسی کو نیک کام کرتے دیکھے تو اس کو دوست رکھے گا اور کسی کو غلط کام کرتے دیکھے گا تو اس سے نفرت کرے گا ،وہ شخص(بھی) پوشیدہ طور پر نیکی بھلائی کے تیئں محبت اور گناہ وبرائی کے تیئں نفرت رکھنے کے سبب نجات پائے گا۔"[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود حفظہ اللہ نے فرمایا:

" قال عبد الله: وإن من بقي منكم سيرى منكرا، وبحسب امرئ يرى منكرا لا يستطيع أن يغيره أن يعلم الله من قلبه أنه له كاره۔ "

"حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ منکرات دیکھے گا

---

[1] شعب الإيمان، الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، رقم الرواية: 7181،ج10 / 71)وقال الملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ في شرحه: "(فذلك ينجو على إبطانه) أي: إبطان ما ذكر في قلبه من محبة الخير وبغض الباطل" (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، باب الأمربالمعروف، الفصل الثالث،3222/8)

جو شخص ان کو ختم نہ کرسکے اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دل سے اپنی ناپسندیدگی دکھائے۔ " [1]

"شرح السنۃ" وغیرہ کتب حدیث میں سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

" جاهدوا المنافقين بأيديكم، فإن لم تستطيعوا فبألسنتكم، فإن لم تستطيعوا إلا أن تكفهروا في وجوهكم فاكفهروا.
"

"منافقین کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے جہاد کرو، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے، اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو بلکہ صرف اپنی تیوری چڑھا سکتے ہوں تو چڑھاؤ۔ "[2]

"اکفھر ،یکفھر "کا معنی ہے "چین بہ جبین ہونا" یعنی چہرے سے اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنا.[3]

اس سے معلوم ہوا کہ "تغییر بالقلب" کا ایک لازمی جزیہ بھی ہے کہ اس معصیت سے عملًا بالکل علیحدہ ہو جائے، جن محافل ومجالس میں منکرات جاری ہوں یا غلط نظریات اور باطل عقائد کا پرچھار ہو رہا ہو تو وہاں اگر داعی ہاتھ وزبان سے نکیر یا تغییر نہ کرسکے تو کم ازکم درجہ یہ ہے کہ ان مجالس میں شمولیت اختیار نہ کریں، بلا کسی شرعی

---

[1] أيضا، رقم الرواية: 7183

[2] شرح السنة للبغوي،كتاب الرقاق، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، 14 / 350

[3] الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية،مادة"كفهر،2 / 809

مصلحت کے اپنے اختیار سے وہاں ٹھہرنا ان کے اس فعلِ بد کے ساتھ موافقت وتائید کے مانند ہے، اور خود باطل کے اس سیلاب میں بہنے کا بھی خطرہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اہل باطل کے مجالس میں بیٹھنے سے منع فرمایا گیا، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

" وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ "

"اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو ان سے الگ ہو جا، یہاں تک کہ کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔"[1]

دوسری آیت کریمہ میں اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد ہے:

" وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ ۔ "

"اور حکم اتار چکا تم پر کتاب میں، کہ جب سنو اللہ کی آیتوں پر انکار ہوتے، اور ہنسی ہوتے، تو نہ بیٹھو ان کے ساتھ، جب تک وہ بیٹھیں (لگ جائیں) اور بات میں اس کے سوا۔ نہیں تو تم بھی اس کے برابر ہوئے (انہی جیسے)۔"[2]

[1] الأنعام : 68

[2] النساء : 140

امام قرطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار لوگوں کی طرف سے جب کسی منکر کا ارتکاب ظاہر ہو جائے تو ان سے اجتناب کرنا واجب ہے، کیونکہ جو اجتناب نہیں کرے گا تو گویا وہ ان کے (اس ناجائز) کام پر راضی ہوا اور کفر پر راضی ہونا کفر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو ان جیسے ہو گے، پس جو بھی شخص کسی گناہ کی مجلس میں بیٹھا اور ان پر نکیر نہیں کی، وہ گناہ میں ان کے برابر ہے، ناجائز بات پر عمل کرتے وقت ان پر نکیر کرنا چاہیئے، اگر ان پر نکیر نہیں کر سکتا تو ان سے اُٹھے ، تاکہ اس آیت کے زمرے میں داخل نہ ہو جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اُنہوں نے کچھ لوگوں کو شراب پیتے ہوئے پکڑا، ان میں سے ایک شخص کے بارے آپ سے کہا گیا کہ اس کا روزہ ہے تو آپ نے اس کو تادیبی سزا جاری کی اور یہ آیت پڑھی۔ یعنی گناہ پر رضامندی گناہ ہے، اسی لئے گناہ کرنے والے اور اس پر خوش ہونے والے دونوں کو اس گناہ کی سزا دی جائے گی تاکہ سب ختم ہو جائیں۔"[1]

داعی کا اپنے چہرے اور طور وطریقے سے ناراضگی کا اظہار

جیسا کہ پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے تحریر کیا گیا کہ ہاتھ سے تغییر کرنے کا ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ اپنے طور وطریقے، چال وڈھال اور چہرے کی ساخت سے اپنی ناراضگی مخاطب کو سمجھائے، یعنی جب زبان سے کہنے کی وسعت نہیں تو چہرے کے لکیروں سے اس پر یہ بات ظاہر کر دی جائے۔

---

[1] تفسير القرطبي ،تفسير سورة النساء : 140،ج5 / 418

در حقیقت یہ مخاطب کواپنے گناہ کا شعور دلانے اوراپنے جرم کااحساس دلوانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اگر مخاطب کواس کام کے گناہ ہونے کاعلم ہوتوداعی کے اس طرز سے وہ اپنے اس فعل بد سے باز آجائیگاورنہ کم ازکم اس کی جرأت ختم یاکم ہوجائیگی، اوراگراس کوگناہ ہونے کاعلم ہی نہ ہوتووہ داعی کےاس اندازکی وجہ سے اپنے فعل پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کرے گااوریوں اُمید ہے کہ آگے چل کر داعی کایہ رویہ اس کی ہدایت کاذریعہ بن جائے گا۔

وعیدات کے باب میں وہ روایت نقل کی جاچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کوایک شہر والوں کوعذاب دینے کاحکم دیا، حضرت جبرئیل نے حیرت اور تعجب کے ساتھ دربار خداوندی میں عرض کیاکہ اس میں توآپ کاایک نیک بندہ ایسا بھی موجودہے جس نے آپ کی بالکل نافرمانی نہیں کی، تواللہ تعالیٰ نے جواباًفرمایا:

"اقلبهاعليهم، فإن وجهه لم يتمعرفي ساعة قط۔"

اس روایت سے معلوم ہوتاہے کہ منکرات دیکھتے وقت چہرے سے اپنی ناراضگی کااعلان ضروری ہے،اور محض انفرادی طورپر گناہوں سے بچنایانیک ہوناکافی نہیں ہے۔

علامہ ابن النحاس شہید رحمۃاللہ علیہ اس کی ذیل میں لکھتے ہیں:

" وفي هذا دليل لما تقدم من أن من لم يستطع الإنكار باللسان وأمكنه إظهار الإنكار بالتعبيس وتقطيب الوجه وجب عليه ذلك۔ "

"اس میں پچھلی بات کی دلیل ہے کہ جوآدمی زبان سے نکیر نہ کرسکے

لیکن چہرے کے بگاڑ اور تیور چڑھانے سے اس کا اظہار کر سکے تو اس پر یہ ضروری ہے۔"[1]

صلح کل رہنے کا نظریہ

آج کل یہ عادت بھی وبا کی طرح عام ہوتی جارہی ہے کہ آدمی صلحِ کل رہے، ہر جگہ کے موافق بات کرے، ہر شخص کو اس کے ہم خیال ہونے کا احساس دلایا جائے، کوئی کچھ بھی کہے خندہ پیشانی اور مسکراتے چہرہ سے اس کے ساتھ ملنا تہذیب تصور کیا جاتا ہے۔

دو رُخی پر مبنی یہ رویہ مزاج شریعت کے سراسر خلاف ہے، اگر کوئی شخص کوئی ناجائز یا خلاف شرع کام کرے تو اس کو اس کا احساس دلانا ضروری ہے کہ یہ کام خلافِ شریعت اور گناہ ہے، بلا کسی معتدبہ عذر کے خاموشی اختیار کرنا وہ مہلک مرض اور عظیم گناہ ہے جس کو قرآن وسنت میں "مداہنت" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور جو اکثر مذاہب وادیان کے ضعف واضمحلال کا بدترین ذریعہ ہے (جیسا کہ مستقل عنوان کے تحت تفصیل سے عرض کردیا جائے گا انشاءاللہ)، اور معصیت کے موقع پر خاموشی سے بڑھ کر خندہ پیشانی سے ملنا، اس کی تعریف وتوصیف کرنا دراصل اس منکر کی تائید اور اس کے ساتھ رضامندی کی علامت ہے۔

کاش: اُمت مسلمہ اس ارشادِ نبوی کو حرزِ جان بنالیتی، اور عین معصیت کے موقع پر یہی طرزِ عمل اختیار کرتی جو اس حدیث میں تعلیم دی گئی، اگر ایسا ہوتا تو آج یہ

---

[1] تنبيه الغافلين عن أعمال الجاهلين، ص102

اُمت اندرونی خلفشار، دین واسلام کے حوالہ سے بیرونی انتشار، اسلام کے نام پر اسلام ہی کی بیخ کنی کی شیطانی سازشوں، اعدائے اسلام کے اشارے پر چلنے والے نام نہاد محققین وسکالرز کی تباہ کاریوں، افرادِ اُمت کے ذریعہ اسلام کا روشن اور منور چہرہ داغدار کرنے والوں کی دسیسہ کاریوں، بااختیار طبقہ کو آلہ کار بنا کر روح اسلام مٹانے کی کوششوں، دین ومذہب اور دیگر خوشنما ناموں سے اُمت کے پسماندہ اور ناواقف طبقے کو دین سے بیزار کرنے والوں کی کامیابیوں سے یہ اُمت محفوظ ومامون ہوتی، اگر اُمت مرحومہ صحیح معنی میں اس پر عمل کر لیتی تو آج ملت اسلامیہ فتنوں سے محفوظ ہوتی، اس کے نظریاتی سرحدوں اور عملی فضاء پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی کھلم کھلا بغاوتیں چھائی نہ ہوتیں، اسلامی معاشرہ میں کم از کم علانیہ طور پر معاصی ومنکرات رقصِ عریاں نہ کرتی۔

اس کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ملت اسلامیہ کا اپنا کوئی تشخص وامتیاز باقی نہ رہا، علامہ اقبال نے بالکل سچ رونا رویا:

وضع میں ہو تم نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جن کو دیکھ کر شرمائے یہود

نکیر کرنے کا عزم

بعض حضرات محدثین نے تغییر بالقلب کے ضمن میں اس بات کا بھی اضافہ کیا کہ دیکھنے والا دل میں اس عمل سے نفرت رکھے اور یہ عزم کرے کہ اگرچہ ابھی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے میں نہی عن المنکر کے لئے زبان وہاتھ کو استعمال نہ کر سکا، لیکن جب بھی مجھے استطاعت حاصل ہو جائیگی اس گناہ سے روکنے کا فریضہ سرانجام دوں گا، صرف دل میں برا جاننا کافی نہیں بلکہ مستقبل میں نہی وانکار کرنے کا عزم

کرنا بھی ضروری ہے۔

علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" (فبقلبه) ينكره وجوبا بأن يكرهه به ويعزم أنه لو قدر بقول أو فعل فعل وهذا واجب عينا على كل أحد بخلاف الذي قبله فأفاد الخبر وجوب تغيير المنكر بكل طريق ممكن فلا يكفي الوعظ لمن يمكنه إزالته بيده ولا القلب لمن يمكنه باللسان۔"

"دل کے ساتھ منکر کو متغیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو برا جانے اور اس بات کا عزم کرے کہ اگر اس کو ہاتھ یا زبان کے ساتھ متغیر کرنے کی استطاعت حاصل ہو جائے تو اس کو عمل میں لائے گا، اور یہ (دل سے اس طور پر نکیر کرنا) ہر ایک شخص پر واجب ہے۔"[1]

تغییر بالقلب کا حکم

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کے ضمن میں یہ بات گزر چکی کہ راجح قول کے مطابق یہ فرضِ کفایہ ہے، ہر شخص پر ہر حال میں فرضِ عین نہیں، کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، یہ حکم ہاتھ اور زبان کے ساتھ امر و نہی کرنے کا ہے۔

جہاں تک دل سے انکار و نکیر کا مسئلہ ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ ہر شخص کی ہر حال میں ذمہ داری ہے، دل سے معصیت کو معصیت سمجھنا، اس سے نفرت رکھنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے، کیونکہ معصیت سے محبت کرنا خود معصیت اور گناہ ہے۔

---

[1] فیض القدیر، 6 / 131

علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وذلك يكون تارة بالقلب، وتارة باللسان، وتارة باليد. فأما القلب فيجب بكل حال؛ إذ لا ضرر في فعله، ومن لم يفعله فليس هو بمؤمن، كما قال النبي ﷺ: «وذلك أدنى - أو - أضعف الإيمان۔"

"اور منکر کا ازالہ کبھی دل کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی زبان اور ہاتھ کے ذریعے، دل کے ساتھ تو بہر حال واجب ہے کیونکہ اس طرح کرنے میں کسی ضرر و تکلیف کا اندیشہ نہیں، جو ایسا نہیں کرتا وہ مومن نہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ (دل سے نکیر کرنا) ایمان کا کمزور ترین حصہ ہے۔"[1]

امام زین الدین بن رجب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"وسمع ابن مسعودرجلا يقول: هلك من لم يأمر بالمعروف ولم ينه عن المنكر، فقال ابن مسعودهلك من لم يعرف بقلبه المعروف والمنكر، يشير إلى أن معرفة المعروف والمنكر بالقلب فرض لا يسقط عن أحد فمن لم يعرفه هلك. وأما الإنكار باللسان واليد، فإنما يجب بحسب الطاقة... وهو فرض على كل مسلم، لا يسقط عن أحد في حال من الأحوال... فتبين بهذا أن الإنكار بالقلب فرض على كل مسلم في كل حال، وأما الإنكار باليد واللسان فبحسب القدرة۔"

---

[1] الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لابن تيمية(ص10)

"حضرت ابن مسعودؓ نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ جس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کیا وہ ہلاک ہو، تو آپؓ نے فرمایا، کہ جو دل سے معروف و منکر کو نہ پہچانے ، وہ ہلاک ہو، آپؓ کا مقصود یہ تھا کہ دل سے معروف و منکر کو پہچاننا ایسا فرض ہے جو کسی سے ساقط نہیں ہوتا، پس جو ایسا نہ کرے وہ ہلاک ہو، جہاں تک زبان یا ہاتھ کے ذریعے نکیر کرنے کا مسئلہ ہے تو (یہ آدمی پر واجب نہیں بلکہ) استطاعت کے بقدر ضروری ہے۔۔(دل سے منکر پر نکیر کرنا) ہر شخص پر ہر حال میں ضروری ہے جو کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا۔"[1]

"ذلک أضعف الإيمان" کا مطلب

حدیث کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا گیا "ذلک أضعف الإيمان" یعنی کسی معصیت پر صرف دل میں نکیر کرنا کمزور ترین ایمان ہے، سرسری طور پر دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا کمزور ترین درجہ یہی ہے۔ایمان کا اس سے زیادہ کمزور حصہ کوئی نہیں، اگر کوئی مسلمان شخص دل میں بھی کسی گناہ پر انکار نہ کرے تو اس حدیث کے ظاہر سے اس کے ایمان کی نفی ہوتی ہے، صحیحِ مسلم کی ایک حدیث سے اس کی مزید تائید ہو جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

" مَنْ جاهدهم بقلبه، فهو مؤمنٌ، ليس وراء ذلك مِنَ الإيمان حبَّةُ خردلٍ۔"

---

[1] جامع العلوم والحكم، الحديث الرابع والثلاثون من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، 2 / 245۔

اس روایت سے صراحتاً ایمان کی نفی ہو جاتی ہے، لیکن اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک ان الفاظ کے ظاہر اور عموم سے کسی گناہ پر انکار نہ کرنے والے کے کفر پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ منکر پر نکیر نہ کرنا زیادہ سے زیادہ گناہِ کبیرہ ہے جبکہ بہت سے نصوص میں مرتکب کبائر پر اسلام وایمان کا اطلاق ہوا ہے، اس لئے فقہاء ومحدثینِ کرام نے اس کے متعدد جوابات دئے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اربعین نوویہ کی شرح میں اس پر کلام کیا ہے۔

بہتر اور مناسب جواب وہی ہے جو علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے "مرقاۃ" میں دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ایمان کا سب سے ہلکا درجہ اور اہلِ ایمان کا کمزور مرتبہ یہی ہے کہ کم از کم دل میں معصیت کو برا جانے اور اس سے نفرت رکھے، اگر کوئی ناجائز اُمور سے نفرت کرنے کے بجائے اس کو اچھا سمجھنا شروع کرے، اس پر ناراض ہونے کے بجائے خوشی اور اتفاق کا اظہار کرے تو وہ مومن نہیں بلکہ کافر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر ترکِ نکیر کے ساتھ معصیت کو اچھا بھی تصور کیا جائے تو یہ کفر ہے، اور مندرجہ بالا روایات میں جو مطلقاً ایمان کی نفی فرمائی گئی وہ تہدید ووعید پر محمول ہے کہ جس ایمان کی اتنی بھی تاثیر نہ ہو کہ جس سے صرف دل میں معصیت خداوندی کو برا سمجھا جائے تو وہ ایمان گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

" قال ابن الملك - رحمه الله - فإن قلت: هذا الحديث يدل على أن الإيمان يزيد وينقص، كما ذهب إليه الشافعي - رحمه الله - فما تأويله عند الحنفية؟ قلنا: معناه أضعف ثمرات الإيمان والإنكار بالقلب منها. فإن

قلت: لو كان كذلك لزم أن لا يخرج من الإيمان لانتفائه، وليس كذلك لما جاء في بعض الروايات، وليس وراء ذلك من الإيمان حبة خردل. قلت: أراد به أن الثمرات القوية والضعيفة إذا انتفت كان الإيمان كالمعدوم اه۔ وفيه أنه حينئذ يرجع الحديث دليلا للخصم، فالصواب أن يقال: التقدير ليس وراء ذلك من كمال الإيمان أو من الإيمان الكامل حبة خردل۔"

"علامہ ابن الملک نے فرمایاکہ اگرآپ یہ اعتراض کرے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتاہے کہ ایمان میں کمی وبیشی ہوتی ہے جیساکہ حضرات شوافع کامذہب ہے تواحناف کے نزدیک اس کی کیاتوجیہ ہے؟

(جواب میں)ہم کہتے ہیں (عبارت میں مضاف "ثمرات"محذوف ہے ، اصل معنی یہ ہے کہ)ایمان کے ثمرات وفوائدمیں سے کم ترفائدہ مرادہے، اورانکار بالقلب بھی ان(ایمان کے ثمرات)میں سے ہے۔

اگرآپ پھراعتراض اُٹھائے کہ اس کامطلب تویہ ہواکہ اس(انکار بالقلب) کے نہ ہونے کی صورت میں بھی کوئی شخص ایمان سے خارج نہ ہو، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں کیونکہ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اس سے کم ذرہ برابرایمان نہیں ہے۔

(جواباً)میں کہتاہوں کہ حدیث کامقصودیہ ہے کہ جب ایمان کے مضبوط اورکمزور(ہر طرح) ثمرات ختم ہوجائے توگویاایمان ہی موجودنہیں،(ابن الملک کاکلام ختم ہوا)۔

(ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں)میں کہتاہوں کہ اس میں اشکال یہ ہے کہ اس

جواب کے مطابق تو یہ شوافع کی دلیل بن جائیگی، اسلئے (یہ توجیہ مناسب نہیں بلکہ بہتر اور) درست بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ (یہاں بھی عبارت بحذف مضاف ہے یعنی) کمال ایمان یا کامل ایمان کی اس سے کم کوئی وجود نہیں۔"[1]

ماتحت افراد کے متعلق ذمہ داری

امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کیلئے دینی رشتہ یعنی مسلمان ہونا کافی ہے بلکہ کبھی کبھار اسلام نہ ہونے کے باوجود بھی اس کی ضرورت آجاتی ہے، چنانچہ بعض اوقات ذمی اور غیر مسلم کے کسی منکر پر نکیر کرنا ضروری بن جاتا ہے، اسلئے امر یا نہی کرنے کیلئے انسانیت کی لڑی میں لڑ جانا ہی کافی ہے، نسبی رشتہ یا رعیت میں ہونا کوئی ضروری نہیں۔

تاہم اگر انسانیت کے ساتھ ساتھ یہ اُمور بھی موجود ہوں، مثلاً جو شخص کسی منکر کا مرتکب ہے وہ نکیر کرنے والے کا نسبی بیٹا یا شاگرد ہے، خاندان وقبیلہ کا کوئی فرد ہے یا اس قسم کا کوئی اور تعلق ہے مثلاً ملازم وغیرہ، تو ان تمام صورتوں میں نکیر کرنے کی تاکید مزید سخت ہو جاتی ہے، دیگر افراد واشخاص کے مقابلہ میں اس کو نکیر کرنا، ضرورت کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور زیادہ ضروری بن جاتا ہے، کیونکہ ماتحت لوگوں کے بارے میں ذمہ دار افراد سے قیامت کے دن خاص پوچھ گچھ ہو گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، فالإمام الذي على

---

[1] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ، كتاب الآداب،باب الأمر بالمعروف ،8/ 3208

الناس راع وهو مسئول عن رعيته، والرجل راع على أهل بيته، وهو مسئول عن رعيته، والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم، وعبد الرجل راع على مال سيده وهو مسئول عنه، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته۔"

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سن لو کہ تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ امام جو لوگوں پر نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچے کی نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، کسی شخص کا غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تم میں سے ہر ایک شخص نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"[1]

امام ابنِ حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے مختلف طرق ذکر فرمائے ہیں، جن میں سے ایک طریق یہ بھی ہے جو کسی قدر وضاحت اور عموم پر مشتمل ہے:

"إن الله سائل كل راع عما استرعاه، أحفظ أم ضيع، حتى يسأل الرجل عن أهل بيته۔"

[1] صحيح البخاري،كتاب الأحكام، باب قول الله تعالى (أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم)، رقم الرواية:7138

"یقیناً اللہ تعالیٰ تمام ذمہ داروں سے اس کے رعایا کے بارے میں پوچھے گا کہ کیا ان (کے حقوق) کی حفاظت کی یا ان کو ضائع کیا، یہاں تک کہ آدمی سے اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ ہو گی۔"[1]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں راعی سے مراد کسی چیز کی حفاظت کرنے والا ہے جو اپنے زیر ولایت پر امانت دار ہو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنی رعایا کے متعلق خیر خواہی کا حکم دیا اور اس بارے میں خیانت سے ڈرایا کہ اس کے بارے میں (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا۔" [2]

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ یہ ذمہ داری اور رعیت ایک امانت ہے جیسا کہ علامہ بغویؒ نے اس کی تصریح بھی فرمائی، ہر ذی اثر اور ذمہ دار شخص کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس کو اللہ کے دئے ہوئے قانون اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے اُصول کے مطابق استعمال کرے، اپنے حدودِ ولایت تک ماتحت افراد کے اعمال و اخلاق کی تربیت کرے، ان کے ناجائز اُمور اور منکرات پر خاص طور سے نکیر کرے، ان کے ناجائز کاموں کے روکنے اور منع کرنے سے رشتہ وغیرہ عوارض رکاوٹ نہیں بننے چاہئے نہ ہی کسی قسم کا خوفِ ملامت حائل ہونا چاہئے۔

بلکہ عام افراد کے مقابلے میں ان پر از خاص توجہ دینے اور اصلاح و تربیت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جیسا کہ مندرجہ بالا روایات سے واضح ہوا کہ ایک تو نہی عن

---

[1] صحيح ابن حبان ،كتاب السير، ذكر الإخبار بسؤال الله جل وعلا كل من استرعى رعية عن رعيته،رقم الرواية: 4493

[2] شرح السنة للبغوي ، كتاب الإمارة والقضاء، باب الراعي مسئول عن رعيته ،10 /62

المنکر نہ کرنے پران عام وعیدات کا تعلق ہے جو کتاب کے شروع میں مستقل عنوان کے تحت درج ہو چکی ہیں، اس میں سب افراد برابر درجہ کے شریک اور سب ہی مساوی طور پر اس کے مکلف ہیں، البتہ ماتحت افراد کے متعلق خاص طور پر یہ حدیث بھی واضح ہے کہ قیامت کے دن اس کے متعلق خاص طور پر سوال ومؤاخذہ ہو گا۔

رشتہ داروں کے منکرات پر خاموشی کا انجام

امام ابو بکرابن ابی الدنیاؒ نے رعایا کو نکیر نہ کرنے یا اس میں بے جا نرمی برتنے کے متعلق ایک بڑا ہی ہولناک اور خطرناک واقعہ لکھا ہے، جس سے اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آپ اپنی سند کیساتھ حضرت مالک بن دینارؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بينا حبر من أحبار بني إسرائيل متكئ على سريره، إذ رأى بعض بنيه يغامز النساء، فقال: مهلا يا بني كهيئة التعذير، فما كان بأسرع من أن أتته العقوبة من الله عز وجل فصرع عن سريره، وانقطع نخاعه، وأسقطت امرأته، وقيل له: هكذا غضبت لي، اذهب فلا يكون من جنسك خير أبدا۔ "

"مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کا ایک عالم اپنے چارپائی پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا کہ اس دوران اس نے اپنے ایک بیٹے کو دیکھا جو عورتوں کو (بدنیتی سے) آنکھ سے اشارہ کررہا تھا، اس عالم نے کہا کہ میرے پیارے بیٹے ایسا نہ کرو (اتنی نرمی سے کہا کہ گویا معذرت خواہانہ لہجہ میں بات

کر رہا ہے)۔

تو اتنا کہنا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آپہنچا اور وہ اپنے چار پائی سے گرا جس سے ریڑھ کی ہڈی (ٹوٹ گئی اور اس) میں موجودہ گودہ باہر نکلا، اور بیوی کا حمل ساقط ہوا، اور یہ (یہ بھی غائبانہ) اس کو بتایا گیا کہ اس طرح آپ میرے بارے میں غصہ کروگے؟ جاؤ، آپ کی نسل سے کوئی بھلائی وجود میں نہیں آئیگی۔"[1]

بڑوں کے منکرات پر نکیر کرنا

ماتحت افراد کا اپنے اُوپر والے افراد کیلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ضروری ہے، مثلاً ملک کے رعایا کا اپنے بادشاہ و حاکم کے کسی ناجائز پالیسی پر جائز طریقہ سے نکیر کرنا، اسی طرح ملازم وغیرہ کا اپنے سے زیادہ بااختیار شخص کے ناجائز اقدام پر انکار کرنا، بیٹے کا اپنے والد کے کسی ناجائز کام پر نکیر کرنا، ان سارے افراد کا اپنے سے بڑے اور بااختیار شخصیات کے کسی منکر کے ارتکاب کرنے پر نکیر وانکار کرنا ضروری ہے، جائز وناجائز کی تمیز کے بغیر ان کے ہاں میں ہاں ملانا اور ناجائز اُمور میں ان کی تائید یا تعاون کرنا بالکل ناجائز ہے جس کی کسی حال میں اجازت نہیں۔

اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا واضح طور پر ارشاد موجود ہے کہ

"لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق"

"اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔"

---

[1] الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لابن أبي الدنيا (117)

لہٰذا ناجائز اُمور میں کسی بھی شخص کی موافقت کرنا شرعاً جائز نہیں، چاہے وہ کتنا ہی بڑا ہو بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے اس پر نکیر کرنا ضروری ہے جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

بڑوں پر نکیر کرنے کا طریقہ کار

نکیر کرنے کے جو مختلف سات صورتیں ذکر کی جاچکی، ان میں سے پہلے دو صورتیں اختیار کرنا شرعا بالکل درست ہے، یعنی:

۱۔ اصل شرعی حکم سے اس کو آگاہ کرنا۔

۲۔ اور اگر اس کے باوجود وہ باز نہ آجائے تو نرمی کے ساتھ وعظ و نصیحت کرنا۔

بیٹے کا باپ کے کسی منکر پر نکیر کرنے کیلئے اس کو برا بھلا کہنا، گالی گلوچ کرنا یا اس کو مارنا پیٹنا درست نہیں، جہاں تک ہاتھ سے منکر کے زائل کرنے کا مسئلہ ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ موقع و محل کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے مصالح و مفاسد کا دیانتدارانہ جائزہ لیا جائے اور اسی کے مطابق نکیر کی کوئی مناسب صورت اختیار کی جائے، اگر منکر شدید ہو اور ازالہ کرنے کی صورت میں باپ کی طرف سے اس منکر جیسے دیگر مفاسد جنم لینے کا خدشہ نہ ہو تو ایسی صورت میں ہاتھ سے منکر زائل کرنے کا اختیار بلکہ ضروری ہو گا۔

اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی منکر کی شدت و شناعت کے مقابلے میں وہ مفاسد زیادہ شنیع ہوں جو منکر کے ختم کرنے سے پیدا ہو رہے ہوں تو پھر ہاتھ سے منکر کا ازالہ نہ کرے، بلکہ حکمت و مصلحت کیساتھ وعظ و نصیحت کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

لہٰذا اگر مثلاً باپ کے ہاتھ میں معصیت کے آلات ہوں یا سود و رشوت وغیرہ ناجائز طریقہ سے اکھٹا کیا ہوا حرام مال ہو تو اولاً اس کو نہایت نرمی سے شرعی حکم بتایا جائے، اس کام کے مفاسد اور نتائج بد سے اس کو روشناس کر دیا جائے، اگر یہی کچھ کرنے سے وہ اپنے فعل بد سے باز آجائے تو الحمد للہ، ورنہ نرمی کے ساتھ اس کو وعظ و نصیحت کی جائے۔

اگر اس سے بھی مقصود حاصل نہ ہو تو از خود آلات توڑنا اور مذکورہ طریقے سے جمع کیا ہوا مال مستحقین کو واپس کرنا تبھی جائز ہے جب معاملہ کے دونوں پہلو پر غور کیا جائے اور یہ یقین یا غالب گمان ہو جائے کہ از خود اس طرح اقدام کرنے میں فساد کے مقابلے میں مصلحت زیادہ ہے۔[1]

بادشاہوں اور حکمرانوں کے منکرات پر نکیر کرنا

یہی حکم بادشاہ کے ساتھ رعایا کا بھی ہے کہ اگر بادشاہ کی طرف سے کوئی منکر سامنے آجائے تو عام حالات میں رعایا کے لئے سب و شتم یا ضرب و قتال کرنے کی ہر گز اجازت نہیں، بلکہ زبانی افہام و تفہیم اور وعظ و نصیحت کرنے پر اکتفاء کر لینا چاہیئے، بادشاہ کے منصب و مقام کے ساتھ رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال چونکہ ایک لازمی امر ہے اس کے بغیر پوری حدودِ سلطنت پر کنٹرول رکھنا اور تمام مخلوقِ خدا پر قوانین کا نفاذ کرنا عملاً انتہائی مشکل ہے، چنانچہ فقہاءِ کرام نے خاص اسی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت و قضاء کے آداب میں کچھ ایسے اُمور لکھے ہیں جن سے عوام کے دلوں میں اس کی ہیبت

---

[1] اس مسئلے کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب: " إحياء علوم الدين" الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ،2 / 318

اور فوقیت حاصل ہو جائے تاکہ قوانین کے نفاذ میں آسانی رہے۔

اسلئے عوام کو عام حالات میں بادشاہ پر نکیر کرتے وقت لوگوں کے سامنے برا بھلا کہنا، ان کی ذات و عزت کو مجروح کرنا یا اسی قسم کا کوئی ایسا اقدام کرنا جس سے اس کا رعب و دبدبہ ہی ختم ہو جائے، ہر گز جائز نہیں، تاہم جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا کہ کسی ناجائز پالیسی میں اس کی تائید و معاونت کرنا بھی شرعاً جائز نہیں۔

حضور اقدس ﷺ کا فرمان ہے:

"إنه يستعمل عليكم أمراء، فتعرفون وتنكرون، فمن كره فقد برئ، ومن أنكر فقد سلم، ولكن من رضي وتابع»، قالوا: يا رسول الله، ألا نقاتلهم؟ قال: «لا، ما صلوا»، أي من كره بقلبه وأنكر بقلبه۔"

"حضرت ام سلمہ ؓ زوجہ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم پر ایسے حاکم مقرر کئے جائیں گے جن کے اعمال بد تم پہچان لوگے اور بعض اعمال بد سے ناواقف رہوگے، جس نے اعمال بد کو ناپسند کیا وہ بری ہو گیا اور جو ناواقف رہا وہ محفوظ رہا لیکن جو ان اُمور بد پر خوش ہوا اور اتباع کی (بری نہیں ہو گا اور نہ محفوظ رہے گا) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول، کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔"[1]

[1] صحيح مسلم،كتاب الامارة،باب وجوب الإنكار على الأمراء فيما يخالف الشرع، رقم الحديث: ١٨٥٤

حضرت حذیفہؓ کا ایک سنہرا ارشاد

ان جیسے فرامینِ نبوی ﷺ کی وجہ سے صحابہ کرام ﷺ کا بھی یہی رویہ تھا، چنانچہ صحابیِ رسول حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب لوگوں نے حاکم وقت کے بعض اعمال پر نکیر کرنا شروع کیا، اور کچھ لوگوں نے آپ سے بھی یہی مطالبہ کیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

"إن الأمر بالمعروف، والنهي عن المنكر لحسن وليس من السنة أن تشهر السلاح على أميرك۔"

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اچھا کام ہے، لیکن حاکم وقت کے سامنے تلوار لہرانا حضور ﷺ کا طریقہ نہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ حکام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں ان کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھ لینا چاہیے، حتی الامکان ایسا خفیہ طریقہ کار اپنا لینا چاہئے کہ جس سے مقصود بھی پورا ہو جائے اور اس کی عزت بھی مجروح نہ ہو۔

لیکن اگر کہیں منکر شدید ہو اور داعی کے علم و یقین میں یہی صورت مفید اور نتیجہ خیز ہو کہ عوام کی عدالت ہی میں اس کو نکیر و تنبیہ کی جائے، اس کی ہیبت و جلال شان کا لحاظ رکھتے ہوئے نکیر کرنے کی صورت کارگر نہ ہو تو ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے اور کچھ تیز لب و لہجہ کے ساتھ بھی نکیر کرنے کی گنجائش ہے، بہت سے اسلاف

---

[1] مسند البزار ،مسندحذيفة، زيدبن وهب 240/7

واکابرین اُمت کا یہ معمول رہا، تاہم اس میں اس بات کی رعایت رکھنی ضروری ہے کہ قدرِ کفایت پر ہی اکتفا کرلیا جائے۔

باب ششم

- باطل عقائد اور غلط نظریات کی تردید
- منکرات نہ چھوڑنے والے افراد سے معاشرتی بائیکاٹ کا شرعی حکم
- گناہوں پر اصرار کرنے والوں اور اہل بدعت کے ساتھ تعلق رکھنے کے شرعی حدود
- مداہنت کی مکمل تحقیق
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک اہم باب: مصالح و مفاسد کا جائزہ لینا
- داعی کیلئے ایک انمول سبق
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق چند ضروری مسائل

باطل عقائد اور غلط نظریات کی تردید کی اہمیت

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اعمال سے زیادہ اہمیت عقیدہ اور نظریے کی ہے، اعمال وافعال عقیدہ ہی پر متفرع ہوتے ہیں، درست اور صحیح نظریہ سے نیک اعمال صادر ہوں گے اور غلط فکر و نظر منکرات و معاصی ہی کی صورت میں نمودار ہوں گے، اسلئے اعمال سے زیادہ فکر عقائد وافکار کی کرنی چاہئے، طرح طرح کے فتنوں اور الحاد سے بھرے ہوئے اس دور میں اسلامی عقائد وافکار اور دینی نظریہ کو ڈھانے اور مسخ کرنے کی جو مختلف سطح پر کوششیں کی جا رہی ہیں، دینی افکار ختم کرنے کیلئے مقابلہ میں دین و مذہب وغیرہ خوشنما ناموں سے جو جماعتیں وجود میں آتی رہتی ہیں، یا بعض لوگوں نے کسی بھی بنیاد پر قطعی عقائد کے باب میں جمہور امت سے اعراض وانحراف کا راستہ اختیار کیا۔

عامۃ المسلمین کے دین وفکر کو ضلال وگمراہی کے اس زہریلی آندھی سے بچاتے رہنا اور ہر حملہ کے مقابلے میں اُمت کی اس متاعِ عزیز کی حفاظت کرتے رہنا نہی عن المنکر کے شعبوں میں سے ایک عظیم اور نہایت توجہ طلب شعبہ ہے، اس کے حدود وقیود کی حفاظت اور تنقیح وتہذیب کرتے رہنا ایک اہم ذمہ داری اور دعوت دین کا ایک کلیدی باب ہے۔

بعض اختلافات تو ان نظریات میں ہوتے ہیں جس کو عام طور پر بھی دینی اور مذہبی عقائد کہا جاتا ہے، عوام الناس بھی ان کو دینی عقائد ہی سمجھتے ہیں، ایسے باطل عقائد کی تردید بھی نہی عن المنکر ہی کے ضمن میں داخل اور واجب ہے، بعض لوگ اس قسم کے مسائل میں اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اس میں کلام وتنقید کرنے کو مضر/

ناجائز یا غیر ضروری سمجھتے ہیں، بعض لوگ ہر قسم کے افکار کے حامل افراد کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ان کی یہ تمام کارکردگی اخلاص اور دینداری پر مبنی ہے اسلئے یہ سارے ہی مخلص اور برحق ہیں، اوران کے تمام اختلافات کواجتہادی غلطی پر محمول کرتے ہیں۔

لیکن یہ مؤقف سراسر غلط ہے، اُصول وعلم کلام سے بے خبری اور ناواقفیت کا بھیانک نتیجہ ہے، تمام اُصولیین ومتکلمین اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ اجتہاد فروعی اور عملی مسائل میں ہوتااور کیاجاتاہے، عقائد،اجتہاد کا میدان کارنہیں، عقائد کے باب میں قطعیات کی ضرورت ہے، یہاں اجتہاد کے نام پر عقلی گھوڑے دوڑانے کی کوئی حاجت نہیں۔

بہت سے حضرات کا یہ خیال ہے کہ قرآن وسنت کو مد نظر رکھ کر جس شخص نے جو استدلال کیا بس وہ درست ہے، جب کسی شخص کے پیش نظر قرآن وحدیث ہوں اور وہ اپنے اس اجتہاد واستنباط میں مخلص بھی ہو تواس پر خواہ مخواہ نکیر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس فکر کے علمبردار حضرات دینی فرقوں اور مذہبی جماعتوں کے نظریات وعقائد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے بلکہ ہر قسم کے فکرونظر کو "قدرواحترام" کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ حضرات عقائد ونظریات کے اس اُصولی اختلاف کوفروعی اختلاف کی نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں چنانچہ ہر قسم کے عقائد رکھنے والے ان کے نزدیک برحق ہیں، جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتاہے کہ کسی بھی فرد کو دوسرے کے عقیدہ پر بحث کرنے سے گریز کرنا ضروری ہے۔

اس فکر کے پس پشت خواہ کتنا ہی اخلاص کارِ فرما ہو لیکن ہے بہر حال یہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ ذیل میں اُصول فقہ اور علم کلام کا متفقہ قانون اجمالی طور پر بیان کر دیا جاتا ہے جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

اعتقادی اختلاف کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مؤقف

اہلِ سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقائد کے باب میں قطعی دلائل اور یقینی براہین ضروری ہیں، اسلام کے تمام ضروری عقائد ایسے ہی دلائل سے ثابت ہیں، اگر کسی کا عقیدہ ان دلائل کے موافق ہو تو درست ہے، ورنہ اگر کوئی اس باب میں اجتہاد سے کام لے اور وہ اپنے اجتہاد کے نتیجہ میں کسی ثابت شدہ قطعی دینی عقیدہ کے خلاف نظریہ اپنائے تو وہ یقیناً مخطی و گناہگار ہو گا خواہ یہ اجتہاد کتنے ہی نیک نیتی اور اخلاص سے کیا ہو۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ عقائد کے سلسلہ میں حق ایک ہی ہے، تمام مسلمانوں کو وہی عقیدہ رکھنا ضروری ہے اس کے خلاف عقیدہ رکھنا بالکل غلط اور یقیناً باطل ہے۔

قاضی عنبری کی رائے

اس سلسلہ میں عبیداللہ بن الحسن العنبری (المتوفی ۱۶۸ھ) اور جاحظ معتزلی (المتوفی ۲۵۵ھ) کا مؤقف بھی معروف ہے[1] کہ اوّل الذکر کے نزدیک اُصول

[1] ان کا اصل مؤقف کیا تھا؟ کیا صرف مسلمان مجتہدین کے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا یا تمام مجتہدین کے متعلق یہ خیال تھا؟ اس میں محققین و مؤرخین کی آراء مختلف ہیں، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

دین کا اختلاف بھی فقہی اختلاف کے مانند ہے، اسلام کے نام پر معدوم وموجود جن جن فرقوں نے بھی اس میدان میں اجتہاد سے کام لیا اور اسکے نتیجہ میں کوئی مؤقف اپنایاوہ تمام افکارو نظریات اپنے حاملین کے حق میں درست اور بجاہیں اور اجتہاد کے بعد اختلاف کرنے کی وجہ سے ان کو گناہ نہیں ہوگا۔

اس خیال کے مطابق معتزلہ وخوارج، جبریہ وقدریہ، مجسمہ ومعطلہ، شیعہ و روافض، اشاعرہ وماتریدیہ وغیرہ تمام اختلافات حنفی، مالکی اور شافعی حنبلی اختلافات کی طرح ہے، دونوں قسم کے اجتہادات میں سر موفرق نہیں، بلکہ دونوں ہی فریقین حق اور صواب پر ہیں، رؤیت الٰہی کا اثبات وابطال، شفاعت کا اعتقاد وانتقاد، وجودِ جنت کا اقرار و انکار، تمام صحابہ کرام (بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ) کی تکفیر وتفسیق اور تقدیس واحترام، مرتکب کبیرہ کا بیک وقت کافر اور مسلمان ہونااور کفرواسلام کے درمیان میں لٹکنا، انسان کوایک ہی آن میں اپنے افعال کا قادرو مجبور خیال کرنا وغیرہ وغیرہ تضادات اور تناقضات حق اور یقیناصواب ہیں، ان میں سے کسی بھی خیال وعقیدہ کا قائل ہونا

کے کئی مباحث وتحریرات سے بھی قاضی عنبری صاحب کے اس قول کی کسی حدتک تائید مترشح ہوتی ہے کہ "اگر کوئی مسلمان مجتہد اپنے اجتہاد سے کام لیکر کوئی مؤقف اپنائے اور اس میں دیگر امت سے ہٹ کر کوئی نیا قول اختیار کرے تو اس پر کوئی اثم وملامت نہیں ہوگا چاہے اُصولی مسائل میں اجتہاد کرکے ایسا کرے یا فروعی مسائل میں ،اس بات میں اُصولی وفروعی مسائل کی تقسیم اہل بدعت نے کی ہے جس کو اُصولیین نے اپنی کتابوں میں ذکر کرنا شروع کیا"، نیز حضرت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "تہذیب التہذیب" (ج7ص8) میں اور ان کے علاوہ دیگر کئی محققین نے محمد بن اسماعیل ازدی سے نقل کیا ہے کہ قاضی عبید اللہ صاحب کو اپنے اس مؤقف کی غلطی جب واضح ہوئی تو اُنہوں نے پوری صفائی وصراحت کے ساتھ اس سے رجوع فرمایا۔

نجاتِ اخروی وقرب خداوندی کیلئے کافی وافی ہے۔

جاحظ معتزلی کی رائے

اس کے مقابلہ میں جاحظ کا یہ خیال تھا کہ حق توان اُمور میں یقیناً ایک ہی ہے، دو متضاد اُمور کو حق نہیں کہا جا سکتا، اگر کوئی شخص اپنے "اجتہاد" کے نتیجہ میں اسی متعینہ و مفروضہ حق کو پہنچا اور اس کا قائل ہوا تو بہت ہی اچھا، اور اگر کوئی فرد اجتہاد کرنے اور اپنے وسائلِ فکر و نظر کو بروئے کار لانے کے باوجود اس حق کے خلاف فکر کا گرویدہ ہوا تو وہ عنداللہ معذور ہے، اس پر کوئی مؤاخذہ اور پکڑ نہیں، بلکہ اگر کسی نے اپنے اسی طرح اجتہاد کے نتیجہ میں اسلام کے برخلاف کسی دین و مذہب میں حقانیت دریافت کی، اور اسی کو اپنایا تو بھی یہ کوئی قابلِ سزا جرم نہیں۔

علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ

علامہ بدرالدین زرکشیؒ (المتوفی ۷۹۴ھ) دونوں کا نظریہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"قال عبيد الله بن الحسن العنبري قاضي البصرة: كل مجتهد في الأصول مصيب. ونقل مثله عن الجاحظ. ويلزم من مذهب العنبري أن لا يكون أحد من المخالفين في الدين مخطئا. وأما الجاحظ فجعل الحق في هذه المسائل واحدا، ولكنه يجعل المخطئ في جميعها غير آثم. "

"عبید اللہ بن حسن عنبری نے کہا کہ عقائد کے باب میں ہر مجتہد درست ہے، اسی طرح جاحظ سے بھی منقول ہے، عنبری کے اس مذہب سے لازم آتا ہے کہ مختلف ادیان میں سے کوئی بھی غلط نہ ہو، رہا جاحظ تو اس کے نزدیک ان مسائل میں حق ایک ہی ہے لیکن ان تمام مسائل میں جو لوگ غلطی پر ہو وہ گناہگار نہیں۔"

پھر اس پر تفصیلی رد کرنے سے پہلے مختصر سا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"عنبری کی رائے تو واضح طور پر محال ہے کیونکہ عالم کا بیک وقت قدیم اور حادث ہونا ناممکن ہے۔ اور رہی جاحظ کی رائے تو وہ بھی باطل ہے کیونکہ حضور ﷺ اور اسی طرح صحابہ کرام نے یہود و نصاری کے ساتھ قتال کیا، اگر وہ غلط راہ پر نہ تھے تو ایسا ہر گز نہ ہوتا۔"

(علامہ ابن سمعانی) نے فرمایا کہ عنبری تقدیر کا اثبات کرنے والوں کے بارے میں کہتے تھے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی، اور تقدیر کی نفی کرنے والوں کے بارے میں کہتے تھے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (پاکی بیان) کی۔ عنبری کے اس قول کو بہت ہی برا سمجھا گیا، کیونکہ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر تمام کفار اپنے اجتہاد میں درست (اور حق پر) ہوں۔"[1]

یہاں ان خیالات کے تردید کرنے کی ضرورت نہیں، قرآن وسنت کے بے شمار نصوص سے ان دونوں افکار و خیالات کا بطلان بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے، کوئی بھی عقلِ سلیم رکھنے والا ذی شعور انسان ان تضادات کا مجموعہ برداشت نہیں کر سکتا چہ

[1] البحر المحيط في أُصول الفقه، مباحث الاجتهاد، فصل الاجتهاد بعد النبي ﷺ، 8 / 276

جائیکہ ان خرافات کی نسبت دین الٰہی اور شریعت محمدی کی طرف کی جائے جس کے تناقضات سے پاک صاف ہونے اور عینِ فطرت ہونے پر اہلِ دین ودانش کا اتفاق ہے۔[1]

یہ ساری تفصیل عرض کردینے کی ضرورت صرف اسلئے محسوس ہوئی کہ عصرِ حاضر میں بہت سے اشخاص اور ادارے اس فکر کو پختہ کرنے اور اس اعتقاد کو مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کرنے پر اپنی تمام تر توجہات مرکوز رکھے ہوئے ہیں، اور اپنی پوری صلاحیت واستعداد اسی "نکتہ اتحاد" پر صرف کرنے کیلئے تلے ہوئے ہیں، عوام الناس اور دیندار طبقہ بلکہ بعض اہل علم حضرات بھی شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے پُرفریب جال اور معصومانہ لب و لہجہ کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں، اور اسی فکر و نظر کے بدولت وہ اغیار

---

[1] اہلِ علم اور تحقیقی ذوق رکھنے والے حضرات اس مبحث کو تفصیل سے دیکھنے کے لئے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:

۱۔البحر المحیط فی أُصول الفقه، مباحث الاجتهاد، الاجتهاد بعد النبیﷺ، حکم الاجتهاد ۸/۲٤٦۔

۲۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، فصل في تحقیق القول في إکفار المتأولین، ۲/۲٤٦

۳۔ الفصول فی الاصول، باب الکلام علی عبید الله بن الحسن العنبري، ج٤ص ۳٤٥، وزارة الأوقاف الکویتی

٤۔ نهایة الأصول فی درایة الأصول للعلامة صفی الدین الهندی ،ج8ص3837۔

5۔العقیدہ وعلم الکلام:نظرة عابرة حول نزول عیسی علیه السلام،ص ٥۲، مکتبة الأحرار، مردان۔

سے مرعوب ہو کر اپنے اسلاف واکابر اور چمکتے تاریخ سے بدظن اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں، آزادی فکر و قلم اور آزاد پلیٹ فارم کے نام پر جو کچھ کارنامے سرانجام دئے جاتے ہیں، عدمِ تعصب اور رواداری کے نام پر جو کچھ تحقیقات واجتہادات عالمِ وجود میں آتے ہیں، وہ اس کے واضح شواہد اور طبعی نتائج ہیں۔

سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی میدان میں خلافِ اسلام نظریات کی تردید

ہر دور میں بعض افکار و نظریات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دینی عقیدہ یا مذہبی نظریہ تصور نہیں کیا جاتا، لیکن فی الحقیقت وہ بھی دین حقہ کے خلاف ہی ہوتے ہیں، اس کا تانا بانا دین فطرت سے اعراض وانحراف ہی ہوتا ہے، ہمارے ہاں معاشی ومعاشرتی، ثقافتی اور سیاسی نوعیت کے اکثر نظریات کا یہی حال ہے کہ بسااوقات دیندار طبقہ بھی ان نظریات کا حامل ہوتا ہے اور اس کو دین کے خلاف قطعاً خیال نہیں کیا جاتا۔

ان جیسے نظریات میں سے جو نظریہ اور جو فکر دینِ اسلام کے اُصول و قواعد کے خلاف ہوں، ان کی تردید کرنا، زمانہ کے زبان ولہجہ میں اس کی کمزوری اور کھوکھلا پن ظاہر کر دینا اور خلق خدا کے سامنے اصل دینی سوچ وفکر ظاہر کر دینا بھی نہی عن المنکر کا ایک اہم باب اور لازمی جزء ہے، عام طور پر اس کی طرف عوام تو عوام، علماء کرام بھی التفات نہیں فرماتے، جس کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ ظاہر سے بالکل دیندار ہونے کے باوجود اکثر یہ طبقہ علماء دین سے بدظن ہوتا ہے، اور ایسے ہر موج وطوفان کے وقت وہ دشمنان دین کا حامی ومؤید بن جاتا ہے، یعنی نیک ہونے کے باوجود وہ فکری گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اتفاق کی خاطر باطل عقائد کی تردید نہ کرنا

بہت سے لوگ صرف اس لئے عقائد کے باب میں منکرات پر نکیر کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں اس سے اتفاق میں خلل آجاتا ہے، اتحاد واتفاق کو برقرار رکھنے کیلئے یہ حضرات ان تمام منکرات پر انکار کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

اتفاق کی اہمیت اسلام کی نظر میں

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اتفاق اور وحدت اسلام کے اہم فرائض میں سے ہے، شریعت کے کئی احکام اور متعدد مسائل کی بنیاد اسی وحدت ہی پر ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

> "اتحاد واتفاق رکن اعظم دینِ اسلام کا ہے تو اس کی محافظت بھی فرضِ اعظم ہے، قال اللہ تعالیٰ" واعتصموا بحبل اللہ جميعاولاتفرقوا، الأية، إن اللہ لايحب الفساد ، الأية، اور اکثر احادیث اس باب میں وارد ہے۔"[1]

اس لئے اس اہمیت کے پیش نظر غیر ضروری اختلافات میں الجھنا اور اس کی وجہ سے نااتفاقیاں اور آپس کی دوریاں بڑھانا کوئی مناسب اقدام نہیں، خصوصاً جن مسائل میں اختلاف بھی صرف افضیلت کا ہو، اسی طرح اختلاف برائے اختلاف

---

[1] تالیفات رشیدیہ، ص306

کرنا یا مخالف کے مؤقف پر نکیر کرنے کیلئے ایسا طرز اختیار کرنا جس سے اختلافات کے مزید بند دروازے کھلنے لگے، یہ کوئی اچھا اقدام نہیں، اختلافات کے متعدد برے نتائج اور مسموم اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی بنیاد پر جب ایک بار تفرقہ بازی شروع ہو جاتی ہے اور گروہ بندی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اس سے دلوں میں عصبیت پیدا ہوتی ہے اور یہی ایک "عصبیت" ہی سینکڑوں مشکلات و منکرات کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لینی چاہئے کہ جہاں صرف اجتہادی مسائل میں اختلاف نہ ہو بلکہ اُصولی اور بنیادی نوعیت کا اختلاف ہو اس پر موقع و محل کے لحاظ سے مناسب طریقے سے نکیر کرنا ضروری ہے، نا جائز اعمال اور عملی نافرمانیوں پر نکیر کرنے سے کہیں زیادہ اہمیت غلط عقائد اور اعتقادی بدعات کی ہے، موہوم اتحاد کو بروئے کار لانے کیلئے نہی عن المنکر کے سابقہ تمام تر تقاضوں کے موجود ہونے کے باوجود نکیر و تنقید سے پہلو تہی کرنا کوئی مفید اور نتیجہ خیز اقدام نہیں۔

تاہم تنقید کرنے کیلئے حتی الامکان ناصحانہ اور خیر خواہانہ طریقہ کار اپنا لینا چاہئے جس سے بلاوجہ اُمت مزید پھوٹ اور تفرقہ بازی کا شکار نہ ہو کیونکہ جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا ہر جائز طریقے سے اُمت کے اتحاد و اتفاق کو بچانا ضروری ہے۔

اتفاق واتحاد کے حدود

نیز اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اتفاق اور اتحاد بذات خود کوئی فرض و واجب نہیں، اسی طرح اختلاف و تفرق بذات خود کوئی شجرہ ممنوعہ نہیں جس کو

ہاتھ لگانا اور اس کے قریب ٹپکنا ہی حرام و ناجائز ہو بلکہ دونوں چیزیں بنیاد اور نتائج کے لحاظ سے مفید یا مضر ہو سکتے ہیں اور اسی ابتدا و انتہا کو دیکھ کر ہی اس کے شرعی حکم کی تعیین کی جا سکتی ہے۔

اسی اختلاف کی ایک قسم وہ بھی ہے جس کا اظہار و بیان قرآن کریم کے نزول کا مقصد ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ" [النحل: 64]

اور ایک قسم وہ بھی ہے جس سے متعدد نصوص میں ممانعت فرمائی گئی ہے، مثلاً سورۃ روم میں ہے:

"وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (31) مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" [الروم: 31، 32]

اب پہلی قسم کے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ایسا اقدام کرنا جائز نہیں ہے کہ اہل حق حق کے بیان کرنے میں گریز کریں یا اس میں بلا وجہ چشم پوشی سے کام لے لے، جبکہ دوسری قسم کے نصوص کی وجہ سے بے جا دینی اختلافات سے گریز کرنا اور حتی الامکان اس سے اُمت کی شیرازہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

حضرت تھانوی صاحب کا ایک ملفوظ

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑا ہی قیمتی ملفوظ ارشاد

فرمایا، جس سے اتفاق واتحاد کے حدود متعین ہو جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

"نااتفاقی اس واسطے بری ہے کہ یہ دین کو مضر ہے اور اگر دین کو مفید ہو گو دنیا کو مضر ہو تو وہ بری نہیں۔ چنانچہ ایک نااتفاقی وہ بھی ہے جس کو حضرت ابراہیم بسم الله الرحمن الرحيم نے اختیار فرمایا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں" قدكانت لكم أسوة حسنة"الخ ۔

ترجمہ: "تمہارے لئے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو کہ ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے، جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہوں، ان سب سے بیزار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں اور تم میں ہمیشہ کیلئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔"

اور ایک اتفاق وہ تھا جس کے بارے میں ابراہیم بسم الله الرحمن الرحيم فرماتے ہیں" إنما اتخذتم من دون الله أوثانا" الخ۔

ترجمہ: "ابراہیم بسم الله الرحمن الرحيم نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے، پس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت میں تم میں سے ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہو گا"۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم بسم الله الرحمن الرحيم کے مقابلے میں جو کفار تھے ان میں آپس میں اتحاد واتفاق کامل طور سے تھا۔ مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود کہہ سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ بلکہ ابراہیم بسم الله الرحمن الرحيم نے تو اس اتحاد کی بنیادیں اُکھاڑ کر پھینک دی تھیں، کیونکہ یہ اتحاد حق کے خلاف تھا۔

خوب سمجھ لو: اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جب کہ دین کے اعتبار سے مفید ہو، اور نااتفاقی اس وقت مذموم ہے جب کہ دین کو مضر ہو۔ اور اگر اتفاق واتحاد دین کو مضر ہو اور نااتفاقی دین کو مفید ہو تو اس نا اتفاقی ہی

مطلوب ہو گی۔

فرمایا: قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں، بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے۔ جو لوگ حق پر ہو ان کے ساتھ وصل (جوڑ) کا حکم ہے اور جو باطل پر ہو اُنکے ساتھ فصل (علیحدگی) کا حکم ہے۔"[1]

باطل عقائد کے خلاف اکابر واسلاف محاذ آرائی

سلف صالحین سے لیکر موجودہ دور تک اُمت کے جتنے اکابر واعیان گزرے ہیں ان کی زندگیاں دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ان حضرات نے عملی منکرات ومعاصی کی نحوست سے اُمت کو بچائے رکھنے کی کوششیں فرمائی ہیں، یوں ہی بلکہ شاید اس سے کئی گنا زیادہ ان کے ہاں اس بات کا اہتمام تھا کہ اُمت مرحومہ کو غیر اسلامی عقائد اور گمراہانہ نظریات کی آندھیوں سے محفوظ رکھا جائے، اس کام کو یہ حضرات اپنی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری سمجھ کر نبھاتے رہیں، حضرت عمر حفظہ اللہ کے ہاں اس بات کا بڑا اہتمام تھا چنانچہ صَبِیغ بن عِسل نامی شخص نے جب متشابہات کے متعلق کچھ غیر مناسب سوالات کرنے شروع کئے اور آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے اعتقادی گمراہی پھیلنے کا خدشہ محسوس فرمایا تو اس کو خوب جسمانی سزادی اور ساتھ اس کو بصرہ کی طرف جلاوطن بھی فرمایا اور ساتھ وہاں کے ذمہ دار حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھنے نہ پائے تا کہ گمراہی نہ پھیلے۔[2]

---

[1] ملفوظات کمالات اشرفیہ 26 بحوالہ دعوت وتبلیغ اُصول وضوابط، ص 64

[2] إيضاح الدليل في قطع حجج أهل التعطيل ،السّلف الصَّالح يَخُوضُونَ فِي علم التَّوْحِيد ،ص: 14.

اسی طرح جس درخت کے سائے تلے بیعتِ رضوان عمل میں آیا تھا اس کے متعلق جب آپ نے اپنی خداداد فراست سے غلو کا اندیشہ محسوس فرمایا تو اس درخت ہی کو مکمل طور پر اُکھاڑنے کا انتظام فرمایا تاکہ محبت و تعظیم کے جذبات کی وجہ سے یہ جگہ غیر شرعی نظریات و اعتقادات اور ناجائز اعمال و حرکات کا مرکز نہ بنے۔

یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے جب حضرات صحابہ کرام بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی مشاورت سے تشریف لے گئے اور "جابیہ" مقام پر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور شام سے واپس ہو جانے کی وجہ بیان فرمانی چاہی، خطبہ شروع کرتے ہوئے ابتداء میں یہ جملہ کہا "من یضل اللہ فلا ھادی لہ" تو نصاریٰ کے ایک بڑے رہنما نے متعدد بار کہا کہ (آپ کا یہ جملہ درست نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے بڑے مجمع میں صاف صاف بیان فرمایا کہ: "کہ آپ نے جھوٹ کہا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا فرمایا اور اللہ نے آپ کو گمراہ بھی کیا، اللہ تعالیٰ آپکو موت بھی دے گا اور چاہے تو جہنم میں بھی داخل کردے گا، خدا کی قسم: اگر آپ کے ساتھ معاہدہ نہ ہو تو میں آپ کی گردن اُڑاتا [1]" نصرانی کے اس سطحی اشکال کی وجہ سے خطرہ تھا کہ سامعین کے دل میں اسلام کے عقیدہ قضاء و قدر کے حوالہ سے کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے، اس لئے بڑے اہتمام اور پوری قوت کے ساتھ اس کے تردید کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی گئی، اس بروقت تردید کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجمع منتشر ہو جانے کے بعد مسئلہ تقدیر میں کسی کی دورائے نہیں رہی، اور پہلے کی طرح اب بھی سب ہی لوگ اس کو ایک اہم اور دین

---

[1] الانتصار في الرد على المعتزلة القدرية الأشرار، ج2ص 500۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ سمجھنے لگے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جب بعض لوگوں نے حد سے زیادہ تجاوز کیا اور آپ کی الوہیت کا دعویٰ کرنا شروع کیا تو آپ نے ان لوگوں کو آگ میں جلا ڈالا، کیونکہ یہ اعتقادی گمراہی تھی کہ آپ کی فضائل و کمالات سنا کر لوگوں کو باور کرایا جائے کہ آپ خدا ہے یا خدائی روح/صفات میں آپ کے اندر حلول کر گئی ہیں اور یوں سادہ لوح مسلمانوں کو اہل بیت کی محبت وفضیلت کے نام پر شرک کے بھینٹ چڑھایا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر ،عبد اللہ ابن عباس وغیرہ صحابہ کرام بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کے اخیر دور میں جب بعض گمراہ فرقوں نے جنم لینا شروع کیا تو آپ حضرات نے بڑے قوت واہتمام کے ساتھ ان کی گمراہیوں کو طشت از بام کیا اور لوگوں کو ان کی دام تزویر میں پھنسنے سے بچاؤ کے لئے اپنی بساط بھر کوشش فرمائی، حضرت عبد اللہ بن مسعود حفظہ اللہ کے ہاں تو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ مسلمان معاشرے میں کوئی اعتقادی یا عملی بدعت وضلالت داخل نہ ہونے پائے اور گرد وپیش میں جہاں کوئی ایسا خطرہ آپ محسوس فرماتے تو بر موقع آپ اس پر نکیر کرتے تھے جس کے کئی واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

یہ تو ایک مختصر سا نمونہ ہے اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ سلف صالحین اور اکابرین اُمت کے ہاں اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ اُمت مرحومہ میں کوئی اعتقادی گمراہی نہ پھوٹ پڑے اور اگر کوئی گمراہی وجود میں آہی گئی ہو تو اس کو زیادہ پھیلنے اور پھولنے کا موقع نہ ملے تاکہ مسلمانوں کا متاعِ دین وایمان محفوظ ومامون رہے، اس لئے وہ بر وقت

ایسی گمراہیوں پر تنقید و نکیر کرتے تھے اور اپنی استطاعت کی حد تک ایسے فتنوں کو ختم کرنے کی پوری کوشش فرماتے تھے، علامہ ابن جماعہ رحمۃ اللہ علیہ ،ابو بکر انباری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ :

"اگر کوئی شخص حروف مقطعات یا دیگر مشکلاتِ قرآن (تشابہات) کی تفسیر کے متعلق سوال کرتا تھا تو حضرات سلف صالحین اس کو سزا دیتے تھے کیونکہ اگر سائل کا مقصد اپنے کسی بدعت کی تائید اور اس کی نشر واشاعت ہوتا تب تو ظاہر ہے کہ وہ اسی سز و نکیر کا مستحق ہے اور اگر کہیں سوال کرنے کا مقصود یہ نہ بھی ہوتا تو بھی اس کے ساتھ یہی ڈانٹ ڈپٹ کا رویہ اپنانا مناسب تھا کیونکہ اس قسم کے سوالات سے ملحدین کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ سادہ لوح عوام مسلمانوں کے دل میں شک کی بیج بو کر گمراہ کریں۔"[1]

مشہور متکلم علامہ قاضی بیاضی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"سلف اور خلف اہل حق کا اتفاق رہا ہے کہ کفار اور ملحدین کے اقوال (وافکار) کو اپنی کتابوں اور اپنی مجالس میں نقل کر لینا چاہئے اور ساتھ ان کے شبہات و اعتراضات کو دفع بھی کیا جائے تاکہ لوگوں کے سامنے حق واضح ہو جائے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :

"ہمارے مشائخ نے ذکر فرمایا ہے کہ لوگوں کو ایمان کی صفات واحوال بیان کرنا

---

[1] إيضاح الدليل في قطع حجج أهل التعطيل، السّلف الصَّالح يَخُوضُونَ فِي علم التَّوْحِيد،ص: 13

،اہل سنت والجماعت کی خصوصیات (اور عقائد) بیان کرنا ایک اہم کام ہے اور سلف صالحین نے اس حوالہ سے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔"[1]

علامہ عزالدین کی نظر میں بدعات کے تردید کی اہمیت

علامہ عزالدین رحمۃ اللہ علیہ ان تاریخی شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے جرأت ، حق گوئی، مجاہدانہ کارناموں اور بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زرخیز میدان میں تابندہ نقوش چھوڑے،اس جرمِ وفا کی پاداش میں آپ کی پوری زندگی تنگیوں اور مشکلات میں گزری لیکن مخالفت کی تند و تیز آندھیوں نے آپ کی صبر واستقامت میں ذرہ بھر فرق پیدا نہیں کیا۔

آپ اس بات کے بڑے سختی سے قائل تھے کہ بدعات اور گمراہیوں کی کھل کر مخالفت کرنا علماءدین کا فرض منصبی ہے اور یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا انتہائی اہم باب ہے،اس فرض کی ادائیگی میں اگر شدائد و مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑے تو اس کو سہنا چاہئے کیونکہ حقیقی معنوں میں وفاداری اور جانثاری کیلئے آزمائش کی یہی ایک گھڑی ہے۔

مصر کے زمانہ قیام کے دوران جب وہاں کے بادشاہ الملک الاشرف کے دل میں آپ کا مقام پیدا ہونے لگا تو دربار میں موجود کچھ لوگوں نے اپنی مفادات کی خاطر آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کی جس پر الملک الاشرف نے آپ کے حقیقی عقائد و نظریات جاننے کیلئے آپ کے نام خط لکھا، آپ کو حقیقت حال کا علم تھا، لیکن اس کے باوجود بڑی تصلب و جرأت مندی کے ساتھ آپ نے اہل سنت والجماعت کے اصل عقائد پر مشتمل ایک زرین اور تفصیلی جواب لکھا جس پر الملک الاشرف سخت برہم ہوا، کیونکہ یہ جواب

---

[1] إشارات المرام من عبارات الإمام،ص38،37،زمزم پبلشرز کراچی۔

اسکے نظریات کے سراسر خلاف تھا، مؤرخین کا کہنا ہے کہ جس مجلس میں یہ خط پڑھا گیا وہاں بادشاہ کے غصہ وہیبت سے کوئی کلمہ حق زبان سے نہیں نکال سکا۔

اسی غیظ وغضب کے عالم میں بادشاہ نے جوابی خط لکھا، جس کے جواب الجواب میں علامہ عز الدین نے اپنی اسی خداداد صفت کا قابل دید مظاہرہ کیا، آپ بادشاہ کے غیظ وغضب سے لبریز خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"فإنا نزعم أنا من جملة حزب الله وأنصار دينه وجنده وكل جندي لا يخاطر بنفسه فليس بجندي۔"

"ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر ہیں، جو لشکر/فوجی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے کیلئے تیار نہ ہو، وہ لشکری/فوجی ہی نہیں۔"

بادشاہ نے اپنے خط میں ایک بات یہ بھی لکھی کہ عقائد کے باب میں حق وہی ہے جو خود بادشاہ کا مؤقف ہے، اس حق کی مخالفت کرنا ایک فتنہ ہے جس کے اُٹھانے والے پر حضور ﷺ نے لعنت کی بددعا فرمائی، شیخ کمال ہوشیاری سے اس کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وليس رد البدع وإبطالها من باب إثارة الفتن فإن الله سبحانه أمر العلماء بذلك وأمرهم ببيان ما علموه ومن امتثل أمر الله ونصر دين الله لا يجوز أن يلعنه رسول الله ﷺ۔"

"بدعات کی تردید اور اس کو ختم کرنا فتنہ اُٹھانا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو اس کا حکم فرمایا اور ان کو اپنے علم کے بیان کرنے کا مکلف بنایا، یہ کیسے

ممکن ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالائے اوراس کے دین کی مدد کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر لعنت فرمائے۔"

اسی سلسلہ کتابت کے دوران ایک خط میں آپ لکھتے ہیں:

"إلا أن سلاح العالم علمه ولسانه كما أن سلاح الملك سيفه وسنانه فكما لا يجوز للملوك إغماد أسلحتهم عن الملحدين والمشركين لا يجوز للعلماء إغماد ألسنتهم عن الزائغين والمبتدعين۔"

"یادرہے کہ عالم کا ہتھیاراس کا علم اوراس کی زبان ہے جیساکہ بادشاہ کا ہتھیار اس کی تلواراور تیر وسنان ہے، جس طرح بادشاہوں کیلئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں اسی طرح علماء کیلئے اہل زیغ وضلال اور مبتدعین سے اپنی زبان کو بند رکھنا جائز نہیں۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ موقع ومحل کی مناسبت سے غلط اعتقادات، باطل نظریات اور مبتدعانہ خیالات وتصورات کی تردید کرنا نہی عن المنکر کا ضروری حصہ اور اہم شعبہ ہے اور یہ کوئی فتنہ وفساد نہیں ہے بلکہ علماءِ اُمت اور راہبرانِ ملت کی ذمہ داری اور فرض منصبی ہے جس سے بلاوجہ غفلت برتنے کی گنجائش نہیں ہے، نیز یہ صرف علامہ عزالدین رحمۃ اللہ علیہ ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ ہر دور کے اہل علم اس کا برابر اہتمام کرتے چلے آئے ہیں، کسی نے تقریر وتحریر کے ذریعہ ان اعتقادی بدعات ومنکرات کا مقابلہ کیا تو کسی نے تالیف وتصنیف کے ذریعہ اُمت مرحومہ کو نظریاتی گمراہیوں سے بچانے کی فرمائی جبکہ کچھ ہونہارانِ اُمت سیف وسنان کے ذریعہ اس زیغ وضلال کے قلع قمع کرنے کی سعی فرما

[1] طبقات الشافعية الكبرى للسبكي، عبد العزيز بن عبد السلام،8 / 226

تے رہے، اللہ تعالیٰ تمام حضرات کی مساعی قبول فرمائیں۔

منکرات و معاصی کے خلاف معاشرتی بائیکاٹ

پہلے تفصیل سے ذکر کیا جاچکا کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" صرف حکومت یا ریاست ہی کا منصب نہیں، بلکہ عوام پر بھی یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی حد تک اس کا اہتمام کریں، اس ذمہ داری کو صرف حکومت ہی کے سپرد کر دینا اور خود اپنے آپ کو اس سے مبرا سمجھنا قرآن و سنت کے نصوص، ائمہ دین اور اکابرین ملت کی آراء اور عبارات سے قطعاً میل نہیں کھاتی۔

البتہ دونوں کی ذمہ داریوں اور مسئولیت میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ چونکہ حکومت کے پاس اپنی حدودِ سلطنت میں قوتِ منفذہ یعنی قانون بزور نافذ کرنے والی طاقت موجود ہوتی ہے اسلئے اگر کوئی نرمی اور زبانی امر و نہی سے اعراض کرے تو حکومت اپنی قوت کے ذریعہ سے بھی اس کو شرعی حکم پر مجبور کر سکتی ہے۔

افراد کے مقابلے میں حکومت کو ان جیسے مواقع میں کسی فساد و مضرت کا اندیشہ عام طور پر نہیں ہوتا، نہ ہی صحیح اسلامی حکومت میں ان جیسے حسین اور لائق آفرین اقدامات سے فتنہ و بغاوت یا انتشار و افتراق کا ڈر ہوتا ہے بلکہ سارے یا اکثر عوام اسی جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں، ان کو ان اقدامات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی پیش آتا ہے کہ منکرات اور معاصی پر حکومت کی خاموشی کے خلاف مسلمان عوام احتجاج کرتے ہیں اور اپنی حکومت کو ان جیسے اقدامات پر مجبور کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ حکومت و سلطنت کے بلند ترین مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد ہے، جس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج میں اس کو تمکین فی الارض کے مقاصد میں سے ایک بنیادی مقصد کے طور پر ذکر فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے:

"الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ"

"وہ لوگ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کا حکم کریں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام تو اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے۔"[1]

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک دنیا میں اسلامی نظام خلافت و حکومت قائم رہی، دنیائے اسلام مسلمان حاکم کی زیر نگین تھی، اوراس فرمان ربانی پر عمل کیا گیا تواُمت مسلمہ مجموعی طور پر نظریاتی اور عملی فتنوں کی آلودگیوں سے محفوظ ومامون رہی، اُمت مرحومہ کی تاریخ کے ہزار سال میں شاید اتنا فکری وذہنی ارتداد کا کوئی سراغ نہیں ملتا جتنا آج ہمارے اس دور کے ایک سال میں ہوتا ہے۔

خلافت اسلامی کے روشن دور میں ایک مستقل شعبہ باقاعدہ حکومت کی طرف سے منظم ہوتا تھا جس کو "نظامِ حسبہ" سے تعبیر کیا جاتا تھا، اس کا کام یہی ہوتا تھا کہ اُمت مسلمہ کے ماحول ومعاشرہ میں شرعی احکامات کی کڑی نگرانی کرے، معاصی ومنکرات سے روکنا ان کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی، فکری انتشار اور ذہنی یلغار سے افرادِ اُمت کا بچانا اور نظریاتی گمراہیوں سے اُمت کی حفاظت رکھنا ان کی مسئولیت میں داخل تھا، پاک معاشرے اور درست ماحول میں رہنے کی برکت سے وہ حکومت سے قطع نظر

---

[1] سورة الحج، رقم الآية:41

کر کے بھی اس کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔

لیکن جب یہ سب کچھ قصہ پارینہ بن چکا، اور مسلمانوں کے حکومتوں کا معاملہ اسکے بر عکس ہونے لگا تو آج اسی کا کرشمہ ہے کہ معاشرہ گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانیوں سے بھرا پڑا ہے، ہر جگہ شرعی احکام سے بغاوت کا کھیل جاری ہے۔

ایسی صورت حال میں عوام اور دردِ دین رکھنے والے افراد کے پاس ایک ہی راستہ باقی ہے جس سے کافی حد تک گناہوں میں کمی واقع ہوسکتی ہے، اور وہ یہ کہ اگر زبانی وعظ و نصیحت سے کوئی اپنے گناہ سے باز نہ آئے، اور قوت استعمال کرنے میں بھی مفاسد کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت حال میں دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس سے تعلقات کم یا ختم کریں، جبکہ یہ امید ہو کہ اس قطع تعلقی کی وجہ سے مخاطب اپنے گناہ سے باز آجائے گا، لیکن اس قطع تعلقی سے مقصود اس کو بلاوجہ تنگ کرنا یا اپنے دنیوی اغراض و مقاصد پورے کرلینا نہیں، بلکہ شرعی حکم سمجھ کر مخاطب کی اصلاح کیلئے کچھ وقت تک ایسا رویہ رکھنا ہے جس سے اس کو اپنی غلطی کا احساس وادراک ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آجائے۔

معاشرتی بائیکاٹ کا فائدہ

معاشرتی بائیکاٹ کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ چونکہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے، معاشرہ اور گرد و پیش ماحول میں رہنا، لوگوں سے میل جول اور تعلق خاطر رکھنا اس کا طبعی تقاضا ہے، ان سب کچھ سے ہٹ کٹ کر زندگی گزارنا انسانی خلقت کے خلاف ہے، اسلئے تنہائی انتہائی مشکل اور ناگوار گذرتی ہے، جس سے نمٹنے کیلئے وہ ہر ممکنہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

جیل کو سزا مقرر کرنے کا بھی یہی فلسفہ ہے کہ جب ملزم یا مجرم کو ایک مدت تک ساری دنیا سے الگ تھلگ کر کے جیل کی کالی کوٹھری میں قید کر لیا جائے اور لوگوں سے لاتعلق رہے تو چونکہ یہ اس کے فطرت کے خلاف ہے اسلئے اس سے نمٹنے اور جان چھڑانے کیلئے وہ جرم کا اعتراف بھی کرے گا اور اگر جرم پہلے سے ثابت ہو تو اس سزا کو سامان عبرت سمجھ کر آئندہ اس قسم حرکات سے باز آنے کا عزم بھی کرے گا۔

اس لئے جب کوئی شخص گناہوں پر اصرار کر رہا ہو اور زبانی وعظ و نصیحت کو قبول نہ کرے اور بھی کوئی ایسی صورت ممکن نہ ہو کہ جس کی وجہ سے اس منکر کا ازالہ ہو سکے تو ایسی صورت میں یہی رویہ اختیار کر لینا چاہئے کہ اس سے تعلق ختم کیا جائے، معاشرے کے افراد مجموعی طور پر جب اس سے تعلق ختم کر دیں تو وہ خود بخود اس معصیت کو ترک کر دے گا جس کی بدولت اس سے "یہ نعمت" سلب ہو گئی، یوں جب کوئی پورا معاشرہ اپنی اس ذمہ داری کو نبھائے گا تو حکومتی سرپرستی کے بغیر بھی ایسا معاشرہ گناہوں کی نحوست اور معاصی کے مسموم فضا سے پاک وصاف ہو گی۔

شرعی مصلحت کیلئے قطع تعلقی کی شرعی حیثیت

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا ایک مسلمان کے ساتھ قطعِ تعلقی ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں، اس خیال کے حامی حضرات ان نصوص کو پیش نظر رکھتے ہیں جن میں ایک مسلمان کے ساتھ تعلق ختم کرنے سے منع فرمایا گیا، اور اس کو مغفرت نہ ہو جانے کا سبب قرار دیا، ان کا مؤقف یہ ہے کہ جب ہم نے زبانی نصیحت کر کے اپنی ذمہ داری پوری کر لی، تو اس کے بعد تعلق ختم کرنا "ہجرانِ مسلم" میں داخل ہے جس پر احادیث میں متعدد وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

لیکن یہ نقطہ نظر درست نہیں، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی مسلمان سے اپنی ذاتی عناد یا دنیوی مفاد کے خاطر تین دن سے زیادہ تک کیلئے تعلق ختم کرنا ناجائز اور حرام ہے احادیث میں اس سے منع کیا گیا ہے اور اس کی مذمت میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، لیکن یہ تمام احادیث اسی ترک تعلق سے متعلق ہے جس کی بنیاد نفسانی خواہشات یا دنیاوی مقاصد ہوں، جہاں تک دینی مصلحت کی وجہ سے تعلق ختم کرنے کا مسئلہ ہے تو ایسا کرنا بالکل جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری و لازم ہوتا ہے۔

سلفِ صالحین کا طرزِ عمل

حضور ﷺ، صحابہ وتابعین کرام اور بعد کے علماء وصلحاء کا ہمیشہ سے یہی وطیرہ رہا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ پچاس دن کے طویل مدت تک نہ صرف اپنا تعلق ختم فرمادیا بلکہ صحابہ کرامؓ کو بھی یہی تلقین فرمائی، حضرت عمار بن یاسرؓ جیسا جلیل القدر صحابی ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس اس حال میں حاضر ہوئے کہ ہاتھوں پر زعفران کا رنگ لگا ہوا تھا، دربار میں آکر سلام کیا، چونکہ اس رنگ کا استعمال مردوں کے حق میں درست نہ تھا، اسلئے جب تک اس رنگ کو ہاتھوں سے ختم نہیں کیا، تب تک حضور ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔

اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ نے جب حضرت صفیہؓ کے حق میں کچھ نازیبا کلمات کہے تو آپ ﷺ نے ایک عرصہ تک اس کے ساتھ تعلق ختم کردیا، اسی طرح ضرورت سے زیادہ تعمیر کرنے والے، سونے کی انگھوٹی استعمال کرنے والے اور ریشم پہننے والے کے ساتھ حضور ﷺ کا ترک تعلق کتب حدیث میں مذکور و مشہور ہے، اور یہ صرف آپ ﷺ کا ذاتی معمول یا انفرادی خصوصیت نہ تھی بلکہ اُمت کو بھی یہ سبق

دیا۔

دینی مصلحت سے ترک تعلق کرنے والے سلف صالحین کی فہرست

صحابہ کرام اور تابعین عظام

بسم اللہ الرحمن الرحیم نے آپ ﷺ کی اس سنت کو من وعن زندہ کیا، دینی مصلحت کی خاطر بسااوقات اپنے رشتہ داروں سے بھی تعلق ختم کردیتے تھے، متعدد گناہوں کی وجہ سے کئی ایک صحابہ کرام نے تعلق ختم کردیا۔

علامہ ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۷۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "المعارف " میں ایسے کئی صحابہ کرام وتابعین عظام کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے کسی دینی مصلحت کی خاطر کسی سے تعلق قطع کیا تھا، چنانچہ "المتھاجرون "کا مستقل عنوان قائم کرکے آپؒ لکھتے ہیں:

ترجمہ "حضرت سعد بن ابی وقاص مرتے دم تک حضرت عمار کے ساتھ قطع تعلق رہے، اور حضرت سعدؓ نے ان سے کہا تھا کہ ہم آپ کو حضور ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کرام میں شمار کرتے تھے، جب آپ کی اتنی عمر باقی رہی جتنی دیر میں گدھا سیراب ہوتا ہے تو آپ نے اسلام کی رسی گردن سے اُکھاڑ پھینک دی، پھر کہا" میں تمہارے لئے دو باتوں میں سے کوئی ایک پسند کرتا ہوں، یا تو دل میں کدورت کے ساتھ ساتھ محبت رکھنا، یا اچھے طریقے سے چھوڑنا، بلکہ چھوڑنا (ہی مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے) " اس کے بعد کہا "اللہ کیلئے میرے اُوپر لازم ہے کہ میں آپ سے ہمیشہ کیلئے بات نہ کروں۔"

حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ کے ساتھ تعلق ختم کرر کھا تھا یہاں تک کہ دونوں انتقال کر گئیں۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے حضرت عبدالرحمن بن

عوفؓ سے تعلق ختم کر رکھا تھا، یہاں تک کہ دونوں وفات کر گئے۔ حضرت طاؤس کا وہب بن منبہ کے ساتھ بھی یہی حال رہا۔

امام حسن بصری اور امام ابن سیرین کے درمیان کچھ باتیں آئی تو جب حسن بصری کا انتقال ہوا، ابن سیرین جنازہ میں حاضر نہ ہوئے۔ حضرت سعید بن المسیب نے اپنے والد کے ساتھ قطع تعلقی کی تھی تو مرتے دم تک اس سے بات نہیں کی۔ امام سفیان ثوریؒ امام ابن ابی لیلی کے متعلق کچھ کلام کرتا تھا (یعنی ان کے بعض افعال پر کچھ تحفظات تھے) تو جب ابن ابی لیلی کا انتقال ہوا تو سفیان ثوری اس کے جنازہ میں حاضر نہیں ہوئے۔"[1]

یہ صرف ایک نمونہ ہے ورنہ کتب حدیث میں ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام اور بیسوں تابعین کا قطع تعلق کرنا مذکور ہے جس کی یہاں ضرورت نہیں، یہاں تو صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ جن نصوص میں "ہجران مسلم" کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد دنیوی مفاد کیلئے ہجران کرنا ہے۔

اگر دینی مصلحت کیلئے تعلق ختم کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ حضور نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین بلکہ ہمیشہ سے علماء وصالحین کا طریقہ رہا ہے، اس کو ناجائز کہنا اور ہجرانِ مسلم کے نصوص اس پر چسپان کرنا نہایت جرأت مندی اور یقیناً غلط ہے۔

فقہاءِ کرام اور محدثینِ عظام کی رائے

تمام فقہاءِ کرام اور محدثین نے بھی ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں

[1] المعارف، المتهاجرون 1/550

کہ اگر ہجران کی بنیاد دنیا اوراس کے مفاد ہوں تو ناجائزاور حرام،اورا گر دینی مصالح کیلئے ایسا کردیا جائے تو عظیم عبادت اورکار ثواب ہے، نمونہ کے طورپر چندایک عبارات درج کی جاتی ہے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۷۵ھ) نےاپنی سنن میں ہجرانِ مسلم کی وعید میں ایک حدیث ذکرفرمائی ہے ، اس کے بعد بعض وہ روایات لکھے جن میں حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی مسلمان کے ساتھ تعلق ختم کردیا تھا،ان دونوں قسم کی روایات کوذکرکردینے کے بعد دونوں میں یہی تطبیق دی ہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا:

"عن أبي هريرة، عن النبي ﷺ، قال: " تفتح أبواب الجنة كل يوم اثنين، وخميس فيغفر في ذلك اليومين لكل عبد لا يشرك بالله شيئا إلا من بينه وبين أخيه شحناء، فيقال: أنظروا هذين حتى يصطلحا " قال أبو داود: النبي ﷺ هجر بعض نسائه أربعين يوما، وابن عمر هجر ابنا له إلى أن مات قال أبو داود: «إذا كانت الهجرة لله فليس من هذا بشيء» وإن عمر بن عبد العزيز غطى وجهه عن رجل۔"

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایاکہ ہر پیراور جمعرات کوجنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اوران دونوں ایام میں ہر اس بندہ کی مغفرت کردی جاتی ہے جو

اللہ کے ساتھ ذرہ بھر شرک نہیں کرتا سوائے وہ شخص جس کے مسلمان بھائی اور اس کے درمیان بغض وعداوت ہو اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مہلت دو یہاں تک کہ دونوں صلح کرلیں۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ اگر ترک تعلق اللہ کے لئے ہو تو وہ ان احادیث کے گناہ میں شامل نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔"[1]

صحیحِ مسلم میں صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ آپ نے ایک شرعی مصلحت کی بنیاد پر اپنے متعلقین میں سے ایک شخص کے ساتھ تعلق ختم کیا تھا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی٦٧٦ھ) اس حدیث کے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں:

"فيه هجران أهل البدع والفسوق ومنابذي السنة مع العلم وأنه يجوز هجرانه دائما والنهي عن الهجران فوق ثلاثة أيام إنما هو فيمن هجر لحظ نفسه ومعايش الدنيا وأما أهل البدع و نحوهم فهجرانهم دائما وهذا الحديث مما يؤيده مع نظائر له كحديث كعب بن مالك وغيره۔"

"اس حدیث میں مبتدعین، فاسق اور سنت چھوڑنے والوں کے ساتھ قطع تعلقی کا ذکر ہے، اور یہ بھی (معلوم ہوا) کہ ہمیشہ ان لوگوں سے تعلق ختم کرنا

[1] سنن أبي داود،كتاب الأدب،باب فيمن يهجر أخاه المسلم،رقم الحديث: 4916

جائز ہے،(بعض احادیث میں)جو تین دن سے زائد قطع تعلقی کو منع فرمایا گیا ہے، وہ اس شخص کے متعلق ہے جو نفسانی اغراض اور دنیوی مفاد کیلئے ایسا کرے، اہل بدعت وغیرہ کے ساتھ تعلق ختم کرنا ہمیشہ کیلئے بھی جائز ہے، یہ حدیث (الباب)اور اس کے علاوہ دیگر احادیث اس کی تائید کرتے ہیں جیسے حدیث کعب بن مالک۔"[1]

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۵۲ھ) اس میں مزید تاکید کرکے اس کو سنتِ ماضیہ قرار دیتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعمیم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"قد ذهب الجمهور إلى أنه لا يسلم على الفاسق ولا المبتدع ۔وقال المهلب ترك السلام على أهل المعاصي سنة ماضية وبه قال كثير من أهل العلم في أهل البدع وخالف في ذلك جماعة كما تقدم في الباب قبله ۔ وألحق بعض الحنفية بأهل المعاصي من يتعاطى خوارم المروءة ككثرة المزاح واللهو وفحش القول والجلوس في الأسواق لرؤية من يمر من النساء ونحو ذلك وحكى بن رشد قال قال مالك لا يسلم على أهل الأهواء۔"

"جمہور کے نزدیک فاسق اور مبتدع پر سلام کرنا جائز نہیں۔ مہلب نے کہا کہ گناہگار لوگوں پر سلام نہ کرنا پرانا سنت ہے، بہت سے اہل علم نے اہل بدعت

[1] شرح النووي على مسلم ، كتاب الصيدوالذبائح،باب إباحة ما يستعان به على الاصطياد والعدو وكراهة الخذف، رقم الحديث: 1954

کے بارے میں یہی کہا بعض حضرات نے اس کی مخالفت بھی کی۔ بعض حنفیہ نے گناہگار لوگوں کی فہرست میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا جو مروت کے خلاف کام کرتے ہیں جیسے زیادہ مزاح کرنا، اور بری باتیں کرنا، گزرنے والی عورتوں کو دیکھنے کیلئے بازار میں بیٹھ جانا وغیرہ، علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا، اہل بدعت پر سلام نہ کیا جائے۔"[1]

حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی۸۰۶ھ) کے داماد امام ابوزرعہ (المتوفی۸۲۶ھ) مزید وضاحت کرتے ہوئے اور اپنی تائید میں متقدمین کے نصوص وآراء درج کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(مسلمان کے ساتھ جو قطع تعلقی ناجائز ہے یہ) اس وقت ہے جب کسی غیر دینی بات کی وجہ سے غصہ کے نتیجہ میں تعلق ختم کر دیا جائے، گناہ و بدعت وغیرہ کسی دینی مصلحت کی خاطر ایسا کرنا ممنوع نہیں، خود حضور ﷺ نے کعب بن مالک، ھلال بن امیۃ اورمرارۃ بن الربیع بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ تعلق ختم کرنے کا حکم دیا تھا، علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث کعب اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ یا برائی کا عمل صادر ہو جائے اور اس کے ساتھ تعلق ختم کر دینے میں اس کے سوچنے سمجھنے یا اس عمل سے رکنے کا گمان ہو، تو اس کے ساتھ تعلقات چھوڑ دینا جائز ہے۔

علامہ ابوالعباس القرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گناہ وبدعت کی وجہ سے

---

[1] فتح الباري، كتاب الاستئذان،قوله باب من لم يسلم على من اقترف ذنبا، 11/ 40

تعلق ختم کرنا اس وقت تک واجب ہے جب کہ وہ شخص اس گناہ سے توبہ کرے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی مسلمان کا اپنے (مسلمان) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ تعلق ختم کرنا جائز نہیں، مگر اگر اس کے ساتھ بات کرنے اور تعلقات برقرار رکھنے میں دینی خرابی ہو یا اس کی وجہ سے کوئی ایسی مضرت لاحق ہو جائے جس سے دینی یا دنیوی نقصان پیدا ہوتا ہو، اگر ایسا ہو تو بائیکاٹ کر کے اس سے بچے رہنے کی گنجائش ہے، اور کبھی کبھی بہتر طور پر تعلقات ختم کرنا برے طریقہ سے بحال رکھنے سے (نتیجۃً) بہتر ہوتا ہے۔ علامہ خطابی نے لکھا کہ والد کا بیٹے سے، شوہر کا بیوی سے تعلق ختم کرنا تین دن سے زیادہ ممنوع نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں سے ایک مہینہ تک تعلق ختم کیا تھا۔"[1]

ترکِ تعلق کا دورانیہ

اُوپر ذکر کیا جا چکا کہ دینی مصلحت کیلئے کسی سے تعلق ختم کر لینا بالکل جائز بلکہ ایک عظیم عبادت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کیلئے کوئی وقت مقرر ہے یا نہیں؟ یعنی کچھ محدود عرصے تک تعلق ختم کر دیا جائے یا ہمیشہ کیلئے بھی قطع تعلقی جائز ہے؟

تو اس کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، جن احادیث میں اس کا جواز مذکور ہے اس میں اس کیلئے کوئی تحدید نہیں کی گئی

---

[1] تكملة طرح التثريب في شرح التقريب، فائدة الهجران لمصلحة دينية، 98/8

بلکہ حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام وغیرہ حضرات سے (موقع و محل، معصیت کے چھوٹے بڑے ہونے اور کرنے والے کے صورت حال کے مطابق) مختلف مدت تک کے لئے ایسا کرنا منقول ہے، بلکہ بعض نصوص میں تو مرتے دم تک بات نہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ اُوپر نصوص میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا۔

اسلئے محض عقل سے اس کیلئے وقت خاص کرنا ممکن نہیں، اور فی الواقع مفید بھی نہیں، کیونکہ اصل مقصود گناہ کرنے والے کو احساس دلانا اور گناہ سے روکنا ہے، اور اس حوالے سے مختلف طبائع اور مزاج کی وجہ سے تفاوت ہو سکتا ہے، اسلئے قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کوئی تحدید نہ کی جائے۔

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

"جب تک اس (فاسق اور گناہگار شخص) کی درست توبہ واضح نہ ہو (تب تک اس سے لاتعلقی رکھی جائے) (ترجمۃ الباب سے امام بخاری کا) مقصود یہ ہے کہ محض توبہ ہی سے اس کے صحیح ہونے کا حکم نہیں دیا جائیگا، بلکہ اتنی مدت بھی گزر جانی ضروری ہے جس میں قرائن سے توبہ کا واقعی اور درست ہونا معلوم ہو جائے۔ مثلاً گزرے ہوئے گناہوں پر ندامت، اور باقی زندگی میں تلافی کا عزم وغیرہ۔

ابن بطال نے فرمایا کہ اس کیلئے کوئی مقررہ مدت نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اسی وقت یا اسی دن توبہ واضح نہیں ہو گا جب تک اس پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ وجود میں نہ آئے، بعض نے ایک سال تک اس کا حال دیکھنے کا قول اختیار کیا، بعض نے چھ مہینے، بعض نے پچاس دن جیسا کہ حضرت کعب کی حدیث میں پیش آیا، اور یہ قول مردود ہے کیونکہ حضور ﷺ نے پچاس دن کی تحدید نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے تک ان

کے ساتھ بات کرنے کو مؤخر کیا(جو اتفاق سے پچاس دن گزرنے کے بعد اجازت ملی) اور یہ ایک واقعہ ہے جس میں عموم نہیں(کہ اس کو ضابطہ بنایا جائے بلکہ) جرم اور مجرم کے لحاظ سے یہ مدت مختلف ہو سکتی ہے۔"[1]

علانیہ فساق وفجار کے ساتھ تعلق رکھنے کا حکم

جو لوگ علانیہ فسق وفجور میں مبتلا ہوں، کھلم کھلا احکامِ شرعیہ کی مخالفت کرتے ہوں، یا وہ آزاد منش اور روشن خیال مخلوق جن کو شرعی احکام کا کوئی احساس نہیں، ان لوگوں سے مودت ومحبت کے رشتے قائم کرنا، پیار ومحبت اور دوستی کا تعلق رکھنا انتہائی مضر ہے جس سے بچنا چاہیے۔

دوستی اور تعلق ہمیشہ ایسے افراد سے رکھنا چاہیے جو صحیح معنی میں مؤمن ہو، احکامِ شرعیہ کا دل وجان سے قدردان ہو، اگر کہیں کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر ڈٹا نہ رہے، بلکہ تنبہ حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی دربار میں توبہ تائب ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

" عن أبي سعيد، عن النبي ﷺ، قال: «لا تصاحب إلا مؤمنا، ولا يأكل طعامك إلا تقي۔"

"صرف مسلمان ہی کو اپنا ساتھی بناؤ، اور آپ کا کھانا صرف متقی اور پرہیز

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري، كتاب الاستئذان،قوله باب من لم يسلم على من اقترف ذنبا، 247/22

گار شخص ہی کھائے۔"[1]

مشہور مفسر علامہ قرطبّی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی۶۷۱ھ)آیت کریمہ "ولا ترکنوا "کی تفسیر میں رقم طراز ہے:

"وأنها دالة على هجران أهل الكفر والمعاصي من أهل البدع وغيرهم، فإن صحبتهم كفر أو معصية، إذ الصحبة لا تكون إلا عن مودة، وقد قال حكيم:عن المرء لا تسأل وسل عن قرينه ... فكل قرين بالمقارن يقتدي-"

"یہ آیت کفاراوراہل بدعت وغیرہ گناہگارلوگوں سے تعلق ختم کرنے پر دلالت کرتی ہے، ان لوگوں کی صحبت یاتوکفرہے یاگناہ، کیونکہ صحبت محبت کے بعدہی ہوتی ہے۔ایک دانانے کہانے کہ (اگرکسی کاحال معلوم کرناہو تو) اسکے بارے میں دریافت نہ کروبلکہ اس کے دوست کاحال معلوم کرو، کیونکہ ہر شخص اپنے دوست کی پیروی کرتاہے۔"[2]

فساق وفجار سے تعلق رکھنے کی صورتیں

اسلئے علانیہ فسق وفجور کے مرتکب افراد سے عام حالات میں پیارودوستی کے روابط بالکل استوار نہیں کرنے چاہئے،الّا یہ کہ:

1. کہیں واقعۃً مجبوری ہو۔

---

[1] سنن أبي داود،كتاب الأدب، باب من يؤمر أن يجالس، رقم الحديث:4832

[2] تفسير القرطبي، سورة هود، رقم الأية:113، 9 / 108

2. یا تعلق رکھنے میں کوئی ایسی دینی مصلحت ہو جو تعلق ختم کرنے کی مصلحت سے زیادہ اہم ہو۔

3. یا تعلق نہ رکھنے میں کوئی ایسا بڑا مفسدہ ہو جو تعلق رکھنے کے مفسدہ سے زیادہ ہو۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"وذلك أن مقارنة الفجار إنما يفعلها المؤمن في موضعين: أحدهما أن يكون مكرها عليها والثاني: أن يكون ذلك في مصلحة دينية راجحة على مفسدة المقارنة أو أن يكون في تركها مفسدة راجحة في دينه فيدفع أعظم المفسدتين باحتمال أدناهما وتحصل المصلحة الراجحة باحتمال المفسدة المرجوحة وفي الحقيقة فالمكره هو من يدفع الفساد الحاصل باحتمال أدناهما وهو الأمر الذي أكره عليه۔"

"فسق وفجور کرنے والوں کے ساتھ مسلمان صرف دو صورتوں میں مل سکتا ہے، ایک یہ کہ اس کو مجبور کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس طرح گھل ملنے میں کوئی ایسی دینی مصلحت ہو جو اس کے خرابی اور مفسدے پر غالب ہو، یا اس کے چھوڑنے (یعنی بالکل الگ تھلگ رہنے) میں کوئی ایسا دینی مفسدہ (خرابی) ہو جو اس مصلحت کے مقابلے میں راجح ہو، تو (دوسری صورت کے دونوں شقوں میں یا تو) چھوٹی خرابی کو برداشت کرکے بڑی خرابی کو دفع کیا جائے، یا کم تر خرابی کو برداشت کر کے بڑی خرابی سے بچا جاتا ہے، اور مجبور بھی درحقیقت وہ شخص ہے جو کم تر خرابی کو برداشت کرکے بڑے خرابی کو دفع کرے، یعنی (کم تر خرابی سے مراد وہ

خرابی ہے) جس پر اس کو مجبور کیا جارہا ہے۔"[1]

اہلِ بدعت کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنے کا حکم

جو لوگ دینِ اسلام میں بدعات کا ارتکاب کرتے ہوں، ان کے ساتھ قلبی تعلق اور دلی لگاؤ رکھنے کا بھی یہی حکم ہے کہ عام حالات میں ان سے تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں، بعض روایات میں اس سے ممانعت وارد ہوئی ہے، صرف مندرجہ بالا صورتوں میں اس کی گنجائش ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے حسبِ عادت بڑی اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایک سوال کا یہی جواب ارشاد فرمایا۔

چنانچہ امداد الفتاویٰ میں ہے:

"سوال: جو لوگ عرس وغیرہ بدعتوں میں شریک ہوتے ہیں، ان کی جو لوگ تعظیم و تکریم کرتے ہیں وہ اس حدیث "من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الإسلام أو كما قال" کے مصداق ہے یا نہیں؟

جواب: اگر یہ تعظیم و تکریم کسی دینی مصلحت یا دنیوی ضرورت سے نہ ہو تو بے شک اس میں داخل ہے۔" [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ، تفسیر سورۃ النور، 15 / 324

[2] امداد الفتاویٰ، ۲۸۰/۴

ترکِ تعلق کا حربہ کب استعمال کیا جائے؟

واضح رہے کہ یہ ترکِ تعلق منکرات پر نکیر کرنے کا بالکل آخری مرحلہ ہے، جب زبانی وعظ ونصیحت وغیرہ دعوت کے تمام درجات کو بر سر کار لا کر آزمائے جائے، اور ان سارے مراحل کے باوجود مخاطب معاصی اور بدعات سے نہ رک جائے، نیز جن جن اعذار کی موجودگی میں ہاتھ اور قوت کا استعمال شرعاً ناجائز ہو یا ناجائز تو نہیں، البتہ واجب نہ ہو اور داعی کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے، تو ایسی صورت میں داعی کو حالات کا جائزہ لے کر اس بات کا اطمینان بخش فیصلہ کر لینا چاہئے کہ تعلق رکھنے میں مصالح زیادہ ہیں یا ختم کرنے کی صورت میں؟ اگر قطعِ تعلق کرنے کی صورت میں شرعی مصالح زیادہ ہوں تو پھر یہ صورت اختیار کر لینی چاہئے۔

ان اُمور کو بالائے طاق رکھ کر جذباتی فیصلے کرنا اور بات بات پر تعلق ختم کر دینے میں تجربہ شاہد ہے کہ انجام کار مفاسد ہی کا غلبہ ہوتا ہے۔

۹۹۹

مداہنت کی لغوی و شرعی تحقیق

لفظِ "مداہنت" کا مادہ "دہن" ہے،اور یہ اسی سے مشتق ہے، "دہن "بنیادی طور پر تیل کیلئے استعمال ہوتا ہے،یہ مادہ مختلف ابواب سے مختلف معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے، تیل لگانا، کسی چیز کو گیلا کرنا وغیرہ،اسی معنی کی مناسبت سے مختلف مواقع پر استعمال ہوتاہے،"باب افعال"اور "مفاعلہ" سے استعمال ہونے کی صورت میں اپنے ما فی الضمیر کے خلاف اظہار کرنے کو مداہنت کہا جاتاہے۔

چنانچہ عرب یہ مادہ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کہ کوئی اپنی ضمیر کے خلاف کسی بات کا اظہار کرے، اور اسی لئے بعض اہل لغت نے اس کا معنی "نافق" بھی کیاہے،جب کوئی شخص اپنے قلب و ضمیر کی غلط ترجمانی کرے تو عرب کہتے ہیں "داہن" اس نے مداہنت اختیار کی۔

نرمی اور غیر پختگی چونکہ تیل کے لازمی صفات میں سے ہیں، اسلئے بعد کے ادوار میں "ادہان" اور "مداہنت" کا لفظ اس مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ بے جا نرمی، اپنے مؤقف میں پختہ نہ ہونے اور دلی رائے کے خلاف کسی قول و فعل کے اظہار کرنے میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے، خود قرآن کریم نے بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا۔

علامہ خلیل ابنِ احمد رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۷۰ھ) نے بڑی اختصار کیساتھ یہی معنی بیان فرمایا:

"دهن: الدهن: الاسم. والدهن: الفعل المجاوز، والادهان: الفعل اللازم. وناقة دهين: قليلة اللبن حدا يمرى ضرعها فلا يدر قطرة۔والدهن من المطر: قدر ما يبل وجه الأرض. والإدهان: اللين والمصانعة. قال الله تعالى: ودوا لو تدهن

فيدهنون أي: تلين لهم فيلينون. والمداهن: المصانع الموارب۔"[1]

اسی لغوی معنی اور عرفی استعمال کی مناسبت سے شریعت میں اس کا مصداق یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے سامنے گناہ کا ارتکاب ہوتا ہوا دیکھے اور اس کو ختم کرنے یا اس پر نکیر کرنی کی بھی اس کو قدرت حاصل ہو، لیکن کرنے والے کی رعایت ولحاظ رکھنے کی وجہ سے یا شرعی احکام کے پامال ہو جانے کی پرواہ نہ کرنے کی وجہ اس پر نکیر نہ کرے بلکہ خدا اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں مخاطب کی رعایت کو ترجیح دیکر خاموشی اختیار کرے یا اپنے کسی مفاد کی خاطر حق کا اظہار نہ کرے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں "مداہنت" کہا جاتا ہے۔

علامہ میر سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۱۶ھ) اس شرعی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"المداهنة: هي أن ترى منكرًا وتقدر على دفعه ولم تدفعه؛ حفظًا لجانب مرتكبه، أو جانب غيره، أو لقلة مبالاة في الدين. "

"مداہنت یہ ہے کہ تو کسی منکر کو دیکھے اور استطاعت کے باوجود اس کو ختم نہ کرے، کرنے والے کی یا کسی اور کے خاطر، یا دین کے زیادہ پرواہ نہ کرنے کی

---

[1] كتاب العين (مادة دهن ،4 / 27) نیز ملاحظہ ہو:الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية،مادة:دهن ،5 / 2115) (لسان العرب ،فصل الدال المهملة،13 / 162)

وجہ سے۔"[1]

علامہ محمد بن بیر علی البرکوی(المتوفی ۹۸۱ھ)اسی کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"المداهنة:وهي الفتور والضعف في أمر الدين كالسكوت عند مشاهدة المعاصي والمناهي مع القدرة على التغيير بلا ضرر۔"

"دینی اُمور میں کمزوری کا نام مداہنت ہے مثلاً کسی گناہ اور ناجائز چیز کو دیکھا جائے، اور بغیر کسی ضرر لاحق ہونے اس کو بدلنے کی قدرت ہونے کے باوجود (اس کو ختم نہ کیا جائے بلکہ)خاموشی اختیار کی جائے۔"[2]

مداہنت کا شرعی حکم

شریعت کی نگاہ میں مداہنت وہ عظیم جرم ہے جس سے قرآن وحدیث میں جابجا منع فرمایا گیا، مختلف انواع واسالیب سے اس کی مذمت سمجھائی گئی، متعدد آیات واحادیث میں اس پر قسم قسم کی وعیدات وارد ہوئی، ضرورت کے موقع پر قدرت رکھنے کے باوجود حق کا اظہانہ کرنا بھی مداہنت ہی ہے جس کو سورۃ البقرہ میں موجبِ لعنت قرار دیا گیا۔

ارشادِ خداوندی ہے:

" إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ۔"

"جولوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارا صاف حکم اور راہ کے

---

[1] التعريفات ،المداهنة:١٤٤/1،مكتبه رحمانية، لاهور

[2] الطريقة المحمدية،ص330، مكتبه حقانية، پشاور

نشان، بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں، ان کو لعنت دیتا ہے اللہ، اور لعنت دیتے ہیں سب لعنت دینے والے۔[1]

ایک حدیث شریف میں اسی کتمانِ علم کے متعلق انتہائی سخت وعید وارد ہوئی، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سئل عن علم علمه ثم كتمه ألجم يوم القيامة بلجام من نار. "

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص سے کسی ایسے مسئلہ کے بارے میں پوچھا جائے جس کو وہ جانتا ہو اور پھر بھی چھپائے (سوال کرنے والے کو جواب نہ دے) تو قیامت کے دن اس کو آگ کا لگام دیا جائیگا۔"[2]

علامہ خطابی اور امام بغوی وغیرہ محدثین و شارحین نے فرمایا کہ یہ وعید تب ہی ہے جب حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا مسئلہ ہو، اور کوئی دوسرا مسئلہ بتانے والا بھی موجود نہ ہو، تو ایسی صورتِ حال میں اگر کسی سے کوئی اس قسم کا مسئلہ دریافت ہو جائے تو اس کا بتانا ضروری ہے، اگر ایسے موقع پر بھی مسئلہ بتانے سے خاموشی اختیار کی جائے اور سائل

---

[1] البقرة : 159

[2] رواه الترمذي في سننه وحسنه، انظرسنن الترمذي ، أبواب العلم، باب ما جاء في كتمان العلم، رقم الحديث:2649

کی درست رہنمائی نہ کی جائے تو یقیناً مذکورہ وعید کا مستحق ہوگا۔

اس روایت میں سوال کے الفاظ ہیں، لیکن اس کا یہ معنی ہر گز نہیں کہ اگر سوال نہ ہو تو عالم دین یا مسئلہ کا علم رکھنے والے افراد اس سے بالکل پہلو تہی کرتے رہیں، بلکہ معاصی کے ہوتے ہوئے سکوت اختیار کرنا بالکل درست نہیں، جیسا کہ اس روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"عن جابر قال: قال رسول الله - ﷺ: «لا ينبغي للعالم أن يسكت على علمه، ولا ينبغي للجاهل أن يسكت على جهله. "

"عالم کیلئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے علم (کو لے کر) خاموش بیٹھے اور جاہل کیلئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے جہل کو لے کر خاموش رہے۔"[1]

قرآن وسنت کی ان واضح ارشادات وتعلیمات کی روشنی میں فقہاءِ کرام نے اس کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا، چنانچہ علامہ برکوی رحمۃ اللہ علیہ نے گناہِ کبیرہ نمبر ۴۹ میں اس کو شمار کیا، علامہ ابنِ حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "الزواجر عن اقتراف الکبائر" میں اس کو ذکر کیا ہے۔

مداہنت کی مذمت عقل کی روشنی میں

ان نصوص کے علاوہ عقلاً بھی یہ ایک ایسی بلا اور خطرناک مرض ہے جو سخت سزا کا موجب ہے، جب انسان حقیقی معنی میں دل سے کسی نظام و نظریہ کو مان لیتا ہے، اس

---

[1] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، كتاب العلم، باب فيما ينبغي للعالم والجاهل، 1/ 164

کی پاسداری، بقاء وحفاظت کا عہد وپیمان کرلیتاہے، اس کی اشاعت وترقی کیلئے کمرِ ہمت باندھ لیتاہے، اور یہ یقین کرلیتاہے کہ پوری قوم کی کامیابی اسی راہ میں مضمر ہے، اس کے خلاف کرنا پوری قوم کی ہلاکت کا سامان کرناہے، تواس کے بعد اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہر قیمت پر اس کالحاظ رکھے، اس کے درودیوار میں کسی بھی قیمت پر کوئی آنچ نہ آنے دے، پوری قوم کی نجات وحفاظت کے مقابلے میں اپنے کچھ ذاتی مفادات کو ترجیح دینا عقل مندی کا تقاضا نہیں ہوسکتا، اپنے عارضی مصالح کے حصول کیلئے ساری انسانیت کو ہلاکت کے گڑھے میں گرانا یا گرنے دینا کسی دانشمند آدمی کی ترجیح ہر گز نہیں ہوسکتی۔

نظامِ حکومت میں فوج وپولیس کا تقریباً یہی کچھ کردار ہوتاہے اور اگر کسی سلجھے ہوئے واقعی حکومت میں فوج اپنے چند ٹکوں کے بدلے آئین وقانوں شکنی کی سودا بازی کرنا شروع کریں تو حکومت اس کو برداشت نہیں کر پاتی۔

فرامینِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں مداہنت کی ایک حسی مثال

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حقیقت کو سمجھانے کیلئے ارشاد فرمایا:

" مثل المدهن في حدود الله، والواقع فيها، مثل قوم استهموا سفينة، فصار بعضهم في أسفلها وصار بعضهم في أعلاها، فكان الذي في أسفلها يمرون بالماء على الذين في أعلاها، فتأذوا به، فأخذ فأسا فجعل ينقر أسفل السفينة، فأتوه فقالوا: ما لك، قال: تأذيتم بي ولا بد لي من الماء، فإن أخذوا على يديه أنجوه ونجوا أنفسهم، وإن تركوه أهلكوه وأهلكوا أنفسهم۔"

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے حدود میں نرمی برتنے والے اور اس میں مبتلا ہونے والے کی مثال اس قوم کی ہے جس نے ایک کشتی میں قرعہ اندازی کی بعض کے حصہ میں بالائی حصہ اور بعض کے حصہ میں نچلا حصہ آیا اور جو لوگ نیچے تھے وہ پانی لینے کے لئے اُوپر والوں کے پاس آمدورفت کرنے لگے جس سے ان لوگوں کو تکلیف ہوئی ایک شخص نے کلہاڑا لیا اور نچلے حصہ میں سوراخ کرنے لگا تاکہ اس سے پانی لے اور اُوپر والوں کو زحمت نہ ہو اُوپر والے لوگ اس کے پاس آئے اور اس سے کہا تجھے کیا ہوگیا ہے اس نے کہا تم لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی اور میرے واسطے پانی ضروری چیز ہے اگر ان لوگوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس کو بھی بچالیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچالیں گے اور اگر اس کو چھوڑ دیتے ہیں تو خود بھی تباہ ہوں گے اور اس کو بھی تباہ کریں گے۔"[1]

اس حدیثِ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ نے اس معاشرہ کی ایک حسی مثال دی جس میں مداہنت کا مرض سرایت کر گیا ہو کہ مداہنت کی مثال ایسی ہے کہ کسی کشتی کے اُوپر اور نیچے دو طبقے ہوں نیچے طبقے کے کچھ افراد کلہاڑی سے نیچی سطح میں سراخ کرنے لگے ایسی صورت میں اگر اُوپر طبقے کے افراد خاموشی اختیار کریں اور اس کو سراخ کرنے سے نہ روکیں تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں تمام افراد پانی کی نذر ہو جائیں گے، ذرا سی خاموشی اپنی اور بے شمار افراد کی ہلاکت اور غرق بالی کا ذریعہ بن

[1] الصحيح للإمام البخاري، كتاب الشهادات، باب القرعة فى المشكلات قبيل كتاب الصلح، رقم الحديث: 2686

جائیگا۔

یہی حال مداہنت کا بھی ہے کہ اگر منکرات کا سلسلہ آنکھوں کے سامنے ہے اوراس پر تنبیہ یا نکیر نہیں کی جارہی بلکہ خاموشی اختیار کی جائے تو ایک دن پورا معاشرہ روحانی طور پر معاصی و منکرات کے سمندر میں غرق ہو کر عذابِ خداوندی کا شکار ہوگا، ظاہر میں اس خاموشی کی خواہ کتنی تعریف کی جائے،اس کو رواداری وسعت ظرفی وغیرہ حسین القابات سے کتنا ہی نوازا جائے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ پورے معاشرے کے نقصان و خسارہ کا سبب ہے۔

انسانیت کی حقیقی کامیابی کا راز محسن انسانیت ﷺ کی نظر میں

اصل حقوقِ انسانی کے سب سے زیادہ فکر منداور بنی نوع آدم کا سب سے زیادہ خیر خواہ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ ہی ہے، یہی وہ مبارک ہستی ہے جس نے انسان کہلائے جانے والوں کواصل انسانیت سکھلائی ان کو اصل معنی میں انسان بنایا، اوراس راہِ حق میں اتنے مصائب ومشکلات کواس خوش اسلوبی اورانتہائی عالی ہمتی سے برداشت کیا جس کی نظیر لانے سے جن وانس ہمیشہ قاصر رہے ہیں، یہی وہ بلند پایہ شخصیت ہے جن کی تعلیمات وتربیت کا یہ حال ہے کہ جن کو دیکھ کر دوست ودشمن ہر منصف مزاج آدمی اس کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ :

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

ایسی شخصیت کے مندرجہ بالا فرمان کے بعد کسی عقل مند آدمی کیلئے اس بات میں کسی ادنی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ پاتی کہ انسانیت کی حقیقی کامیابی

اورابدی فلاح ونجاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکرہی میں مضمرہے، بلاوجہ حق سے خاموش رہنے، انسانیت کے حقیقی رہنمائی سے سکوت اختیار کرنےاور مداہنت کی چادراوڑھنے میں صرف اپناہی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تباہی وبردبای ہے۔

کیامداہنت مطلقاًحرام ہے ؟

عام طورپریہ سمجھاجاتاہے کہ مداہنت مطلقاًناجائزوحرام ہے، کسی صورت میں اس کی اجازت نہیں، داعی کیلئے ہرحال میں حق کااظہارکرناواجب ہے خاموش رہنے کی قطعاًکوئی گنجائش نہیں۔

لیکن قرآن وسنت کے نصوص میں گہرے غور وفکر کرنے اور نبی کریم ﷺ اورصحابہ کرام کی سیرۃ وسوانح کامطالعہ کرنے سے یہ مؤقف درست معلوم نہیں ہوتا۔

اختصارکیلئے صحیحِ بخاری کے صرف مندرجہ ذیل ایک باب سےاس بات کا اندازہ لگایاجاسکتاہے:

"ویذكر عن أبي الدرداء: إنا لنشكر في وجوه أقوام، وإن قلوبنا لتلعنهم عن عروة بن الزبير، أن عائشة، أخبرته: أنه استأذن على النبي ﷺ رجل فقال: «ائذنوا له، فبئس ابن العشيرة - أو بئس أخو العشيرة -» فلما دخل ألان له الكلام، فقلت له: يا رسول الله، قلت ما قلت، ثم ألنت له في القول؟ فقال: أي عائشة، إن شر الناس منزلة عند الله من تركه - أو ودعه الناس - اتقاء

فحشه۔"

"حضرت ابوالدرداء نے فرمایا کہ ہم بعض اوقات لوگوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں لیکن ہمارے دل ان پر لعنت کرتے ہیں۔

عروہ بن زبیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے اندر آنے دو وہ قبیلہ کا برا بیٹا ہے یا قبیلہ کا برا بھائی ہے جب وہ اندر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نرمی سے گفتگو کی میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے اس کے متعلق فرمایا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پھر جب وہ اندر آیا تو آپ نے اس سے نرمی سے گفتگو کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ، اللہ کے نزدیک سب سے برا آدمی درجہ کے لحاظ سے وہ ہے جس کو لوگوں نے اس کی فحش باتوں سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔"[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرزِ عمل اور حضرت ابوالدرداء حفظہ اللہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طور وطریقہ سے مافی الضمیر کے خلاف اظہار کرنا ہر حال میں مذموم نہیں، بلکہ بعض دینی مصالح کی بنیاد پر اس طرح کیا جا سکتا ہے، اگر یہ ہر حال میں مذموم اور حرام ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی ایسا نہ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کا کم از کم محمل جواز واباحت ہے۔

علامہ احمد بن ادریس القرافی المالکی (المتوفی ۶۸۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ اپنی مفید کتاب "الفروق" میں اس بات پر مستقل باب باندھتے ہیں، کہ مداہنت کن کن صورتوں میں

---

[1] صحيح البخاري،كتاب الأدب،باب المداراة مع الناس،8 / 31

حرام ہے اور کون کونسی صورتوں میں اس کی شرعاً اجازت ہے؟

آپ تحریر فرماتے ہیں:

"مداہنت کا معنی لوگوں کے ساتھ ان کے پسند کا معاملہ کرنا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے "ودوا۔۔۔" یعنی مشرکین چاہتے ہیں کہ آپ ان کے کارناموں اوران کی عبادتوں کی تعریف کرے (اس کے نتیجہ میں) وہ آپ کی بھی تعریف کریں۔ مداہنت کی یہ صورت حرام ہے، اسی طرح ظالم کے ظلم کی، مبتدع کے بدعت کی اور غلطی کرنے والے کے غلطی کی تعریف کرنا مداہنت محرمہ میں داخل ہے، کیونکہ ایسی تعریف اس ظلم وفساد کے زیادہ ہونے کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابوموسیٰ حفظہ اللہ سے منقول ہے کہ آپ کہتے تھے کہ بعض لوگوں کے سامنے ان کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ ہمارے دل ان پر لعنت کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد وہ ظالم وفاسق لوگ ہیں جن کی شر وفساد کا ان کو خوف تھا، (مقصود یہ تھا) کہ (بعض اوقات) ان لوگوں کے سامنے تبسم کرتے ہیں اور حقیقت کے مطابق چند کلمات سے ان کی تعریف کرتے ہیں۔

کیونکہ ہر کسی میں تعریف کی کوئی صفت ضرور موجود ہوتی ہے چاہے وہ سب سے زیادہ منحوس ہی کیوں نہ ہو، تو ان کی شر وفساد سے بچنے کی خاطر ان واقعاتی صفات کی تعریف کیا کرتے تھے۔ مداہنت کی یہ صورت کبھی جائز اور کبھی واجب ہو جاتی ہے اگر اس کے ذریعے کسی ناجائز ظلم یا مظالم کو دفع کیا جائے جو اسی کے ذریعے دفع ہو سکتے ہوں اور وقت کا بھی یہ تقاضا ہو (تو ان دونوں صورتوں میں واجب ہوگی)، اور اگر (اس طرح مداہنت کرنا) کسی مستحب کام کا وسیلہ ہو تو یہ مستحب ہوگا۔ اور اگر بلا ضرورت محض کمزوری کی وجہ سے ایسا کیا جائے یا ایسا رویہ کسی

مکروہ بات میں پڑ جانے کاذریعہ ہو تو(ان دونوں صورتوں میں) یہ مکروہ قرار پائے گا۔

تومداہنت ان پانچ شرعی احکام میں تقسیم ہو گئیں، اور اسی سے حرام اور غیر حرام مداہنت کے درمیان فرق بھی واضح ہو گیا، لوگوں میں مشہور ہے کہ مداہنت مطلقاً نا جائز ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں، صحیح بات وہی ہے جو اُوپر ذکر ہو چکی۔"[1]

علامہ برکوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کچھ تحریر فرمایا، چنانچہ علامہ ابوسعید خادمی (المتوفی ۱۱۵۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ آپ کے کلام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" (التاسع والأربعون المداهنة) --(فهذا) (حرام فقد ورد في الخبر أن «الساكت عن الحق شيطان أخرس»لكونه دليل الرضا سيما عند القدرة -- (فإن كان سكوته) -(لدفع ضرر عن نفسه أو عن غيره فهو) أي السكوت (مدارة جائزة) معنى المداراة أن يبتسم ويضحك وإن كان قلبه ينكر كما في حديث الجامع «مدارة الناس صدقة» قال في شرحه المداراة اللين والتعطف يعني من ابتلي بمخالطة الناس معاملة ومعاشرة وتلطف ولم ينفرهم

[1] أنوار البروق في أنواء الفروق،الفرق الرابع والستون والمائتان بين قاعدة المداهنة المحرمة وبين قاعدة المداهنة التي لا تحرم، وقد تجب،4 / 236

كتب له صدقة والمدارة محثوث عليها مأمور بها۔وفي شرح البخاري المداراة الرفق بالجاهل في التعليم وبالفاسق في النهي عن فعله وترك الأغلاط عليه والمداهنة معاشرة الفاسق وإظهار الرضا بما هو فيه الأولى مندوبة والثانية محرمة۔ (بل مستحبة في بعض المواضع) كما إذا ظن عموم الضرر الحاصل أو عدم صبره عليه۔في الحديث جواز غيبة المعلنين بالفسق مع جواز مداراتهم اتقاء شرهم ما لم يؤد إلى المداهنة والفرق بين المداهنة والمداراة أن المدارة بذل الدنيا لصلاح الدنيا أو الدين أو هما معا فمباحة وربما استحسنت. والمداهنة بذل الدين لصلاح الدنيا۔"

"مداہنت حرام ہے، حدیث شریف میں ہے کہ(موقع ومحل اور استطاعت کے باوجود) حق بات سے خاموش رہنے والا کانا شیطان ہے کیونکہ یہ خاموشی رضامندی کی دلیل ہے خصوصاًجب قدرت بھی ہو، پس اگر یہ خاموشی اپنے سے یا دوسرے سے ضرر وتکلیف دور کرنے کیلئے ہوتو یہ مدارات (کہلاتا) ہے جوکہ جائز ہے، مدارات کا معنی یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہنسی خوشی سے ملاجائے، اگرچہ دل میں مناکرت ومنافرت موجود ہوجیساکہ جامع کی حدیث میں ہے کہ لوگوں کے ساتھ مدارات کابرتاؤکرناصدقہ ہے، حدیث کی تشریح نرم برتاؤکے ساتھ کی گئی ہے، یعنی جو شخص لوگوں کے ساتھ لین دین اور رہن سہن کرتاہواوروہ نرم برتاؤ کرے اوران کو متنفرنہ کرے تواس کیلئے صدقہ کاثواب لکھاجاتا ہے۔

مدارات کی ترغیب دی گئی ہے اوراس کاحکم دیاگیاہے۔ بخاری کی شرح میں

ہے کہ مدارات ناواقف آدمی کو سکھلانے میں اور گناہ کے مرتکب شخص کو غلط کام سے روکنے میں سختی کے بجائے نرمی اختیار کرنے کا نام ہے، اور مداہنت گناہ گار کے ساتھ رہن سہن اختیار کرنے اور اس کے (ناجائز) افعال پر خوشی (اور اتفاق و یکجہتی) کا اظہار کرنے کو کہا جاتا ہے، پہلا (مدارات) جائز ہے اور دوسرا (مداہنت) حرام۔

(بلکہ مدارات) بعض صورتوں میں مستحب ہے مثلاً اگر (اس طرح نہ کرنے اور درشت رویہ اختیار کرنے میں) عمومی ضرر کا اندیشہ ہو یا (مدارات نہ کرنے کے نتیجہ پر) صبر نہ کر سکنے کا ڈر ہو۔ حدیث شریف میں کھلے عام فسق و فجور کا ارتکاب کرنے والوں کی غیبت کا جواز مذکور ہے اور ساتھ ساتھ ان کے شر سے بچنے کیلئے مدارات اختیار کرنا بھی جائز ہے جب تک مدرات مداہنت کے حدود میں نہ آجائے۔

مداہنت اور مدارات میں فرق یہ ہے کہ مدارات صرف دنیوی یا دینی یا دونوں کے مشترکہ مفاد کیلئے دنیا خرچ کرنے کا نام ہے، اور یہ مباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن ہے، اور مداہنت دنیوی مفاد کیلئے دین لگانے کا نام ہے۔"[1]

دونوں حضرات کے کلام میں در حقیقت کوئی تعارض نہیں، علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ نے مداہنت کی جس صورت کو جائز لکھا، علامہ خادمی بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں، البتہ اس کو مداہنت کہنے کیلئے تیار نہیں، بلکہ مداہنت کے بجائے مدارات کہتے ہیں، یہ صرف

---

[1] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية،آفات اللسان، التاسع والأربعون المداهنة ،3 / 127

اصطلاح کا فرق ہے جس کے بارے میں "الامشاحۃ فی الاصطلاح" قانون مسلم ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اپنی دنیوی مفاد و مصالح کی خاطر قدرت رکھنے کے باوجود کسی کے گناہ پر نکیر نہ کرنا، ناراضگی کے اظہار کے بغیر اس کے ساتھ اس کی مرضی کا سلوک کرنا، کسی کے جاہ و جلال یا عزت و منصب یا دیگر دنیوی اُمور کی خاطر دین کی قربانی دینا شرعاً بالکل حرام اور ناجائز اور عقلاً و قانوناً بالکل ممنوع اور قابل مؤاخذہ جرم ہے، البتہ اگر اس طرح سلوک کرنے کی بنیاد واقعۃً دینی مصالح ہوں، اور وہ مصالح بھی اس درجہ کے ہوں کہ ان جیسے مواقع میں خاموشی کے نقصانات کے مقابلے میں زیادہ مہتم بالشان ہو تو ایسی صورت کو حرام یا ناجائز نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ان مصالح کے تفاوت کے لحاظ سے اس کے مختلف درجات و احکام ہیں، بعض صورتوں میں صرف جائز، بعض میں مستحب اور بعض میں واجب و ضروری ہوتا ہے۔

البتہ اس بات کا دیانتدارانہ جائزلینا ضروری ہے کہ واقعۃً وہ مصالح ایسے ہیں جن کیلئے فی الحال خاموشی اختیار کی جائے یا صرف نفس و شیطان کی تدبیر و تلبیس ہے جو صرف مداہنت اور خاموشی اختیار کرنے کیلئے مزین کر کے پیش کی گئی۔

دعوت دینے سے پہلے مصالح ومفاسد کا دیانتدارانہ جائزہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب لعینہٖ نہیں ہے، بلکہ اسلام کے ان احکام میں سے ہے جن کو وسائل سے تعبیر کیا جاتا ہے، علماء اُصولِ فقہ کی اصطلاح میں یہ "وسائل" میں سے ہے مقاصد میں سے نہیں، شریعتِ مطہرہ کی رو سے بندوں کو جن افعال اوراقوال کا حکم دیا گیااور جن اُمور سے روکا گیا، اس میں حکم کا اصل مدار موجودہ یاممکنہ صلاح وفساد ہی پر ہوتا ہے، جن اُمور کا حکم دیا جاتا ہے اس میں کوئی مصلحت موجود ہوتی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے شریعت یہ حکم جاری کرتی ہے، بعض اوقات یہ مصلحت موجود ہوتی ہے اور بعض اوقات متوقع۔

یہی حال ان احکام کا بھی ہے جن میں شریعت اپنے ماننے والوں کو کسی کام سے روکتی ہے، اب اگر کوئی مکلف شخص کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، تواس سے یقیناًوہ فساد وجود میں آئیگا جس سے بچنے کی خاطر قرآن وحدیث نے اس کو ممنوع کرر کھا تھا، اسی طرح جن اُمور کے کرنے کا حکم دیا، اگر کوئی بندہ خدااس کو چھوڑرہاہے تواس سے یقیناًوہ مصلحت مفقود ہو گی جس کو مد نظرر کھ کر قرآن وحدیث میں یہ حکم دیا گیا تھا۔

اور شریعتِ خداوندی چونکہ بندوں کے دینی ودنیوی کامیابی کی مکمل کفیل ہے، اوراس سے بڑھ کراس کے دامن میں رحمت وشفقت کا عظیم سرمایہ بھی پنہاں ہے، اسلئے اس کو یہ منظور نہیں کہ کسی بندے سے کوئی حقیقی مصلحت فوت ہو جائے یاوہ کسی فساد کا شکار ہو جائے اوراس طرح وہ دین یادنیا کی تباہی وناکامی کا شکار ہو جائے۔

اسی مقصد کی خاطر مسلمانوں پرامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری

ڈالدی گئی، اگر کسی انسان سے دانستہ یانادانستہ طورپر یہ مصالح فوت ہورہے ہیں یاوہ کسی فساد کے زدمیں آجاتاہے تواس کادینی بھائی اس کی صحیح رہنمائی کرسکے، خاموش رہنے کی صورت میں چونکہ اس کے انجام کے خراب ہونے کاتعلق ہے جس پر خاموش رہنا گویا اس کےاِس منطقی نتیجہ پرراضی ہوناہے جوکسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔

دوسری طرف اس سے اجتماعیت پر بھی اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں جس سے اُمت کی اجتماعیت میں بھی ان اُمورکااثرِبد ممکن ہےاسلئے شریعت نےاس خاموشی کو کوتاہی وغفلت قرار دیااوراس کو "مداہنت"سے تعبیر کیا گیاجوایک عظیم اورناقابل برداشت جرم اورکبیرہ گناہ ہے۔

وجہ اس کی ظاہرہے کہ اگرکوئی فرد منکرکواپنے آنکھوں سے ہوتادیکھے اوراس پرنکیرنہ کرے، اس کوختم کرنے کی کوشش نہ کرے، توایک طرف بلافائدہ خاموشی ہے جس کااصل سبب اوربنیادی منشاغفلت اورکوتاہی ہی ہے،اوردوسری طرف مخاطب کااتنابڑانقصان ہے،اورپھرصرف فردکاہی نہیں، بلکہ پوری اُمت کامسئلہ ہے، توایک طرف سستی اورکوتاہی کے سواکچھ نہیں، اوردوسری طرف اتنابڑاخسارہ! اس کے باوجود اگرکوئی شخص اس نقصان کاکچھ خیال وپاس نہ رکھے توبےشک یہ ایک عظیم جرم ہے جس کو برداشت نہیں کیاجاسکتا۔

موقع ومحل دیکھنے کی اہمیت

چونکہ امر بالمعروف اورنہی عن المنکر نیکیوں کووجود میں لانےاور منکرات ختم کرنے کا ایک وسیلہ ہے بذات خود مقصود نہیں ، اسلئے امرونہی کرنے میں مصالح ومفاسد کادامن پوری مضبوطی سے تھامے رکھناضروری ہے، مصالح ومفاسد کاخیال رکھنا

اور موقع و محل کا لحاظ رکھنا، انجام و عاقبت کا پاس رکھنا دعوت دین کا ایک اہم اور ضروری باب ہے، جس سے استفادہ کئے بغیر وہ مصالح پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے جن کی خاطر اُمت مرحومہ کے کندھوں پر یہ بھاری بھر ذمہ داری عائد کی گئی۔

بلکہ بعض حالات میں تو اس سے فائدہ کے بجائے اُلٹا نقصان بلکہ دوگنا خسارہ ہو جاتا ہے، ایک منکر پر نکیر کے سلسلے میں جب کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں اس کے طریقہ کار، انجام و عاقبت کا پورے طور پر جائزہ نہ لیا گیا ہو تو اس سے وہ منکر ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بڑھ کر منکرات کا ایک سیل روان جاری ہو جاتا ہے۔

سیرتِ نبویہ کی روشنی میں چند مثالیں

اس نقطہ نظر سے جب ہم سیرتِ نبوی (علی صاحبہا الوف تحیۃ وسلام) کا مطالعہ کرتے ہیں، اور آپ ﷺ کے طریقہ دعوت کو دیکھتے ہیں، تو قدم قدم پر اس بات کی رہنمائی ملتی ہے، آپ ﷺ نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں اپنے خداداد قوت فکر و نظر اور بے مثال ملکہ اجتہاد سے ایسے فیصلے صادر فرمائے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، آپ ﷺ کے حکیمانہ فیصلوں کو دیکھ کر بڑے بڑے عقل مند محو حیرت رہ جاتے ہیں۔

ذیل میں سیرت نبویہ سے چند ایک واقعات ذکر کئے جاتے ہیں جس سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"وعن حذيفة قال: كنت آخذا بزمام ناقة رسول الله - ﷺ - أقود، وعمار يسوق - أو عمار يقود وأنا أسوق به - إذ استقبلنا اثنا عشر رجلا متلثمين. قال: هؤلاء المنافقون إلى يوم القيامة. قلت: يا رسول الله، ألا تبعث

إلى كل رجل منهم فتقتله؟ فقال: أكره أن يتحدث الناس أن محمدا يقتل أصحابه، وعسى تكفهم الدبيلة. قلنا: وما الدبيلة؟ قال: شهاب من نار يوضع على نياط قلب أحدهم فيقتله.

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (ایک بار) میں آپ ﷺ کی اونٹنی کا لگام لئے آگے آگے جارہا تھا اور حضرت عمار پیچھے سے ہانک رہے تھے کہ (اچانک) بارہ نقاب پوش لوگوں نے ہمارا سامنا کیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ قیامت تک منافق ہی ہوں گے، میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ: کیا آپ ان میں سے ہر آدمی کے پاس کوئی نہیں بھیجتا جو اس کا قصہ تمام کرے؟ حضور ﷺ نے فرمایا "میں یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے، اور قریب ہے دبیلہ ان کیلئے کافی ہو جائیگی۔" ہم نے عرض کہ دبیلہ کیا چیز ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آگ کا شعلہ جو اُن میں سے ایک (ایک) کے شہ رگ پر رکھی جائیگی اور انکو ختم کردے گی۔"[1]

حضور ﷺ کو یقین تھا کہ یہ حملہ آور لوگ حقیقتاً مسلمان نہیں، بلکہ منافق و کافر ہیں، پھر اُنہوں نے جو کچھ منصوبہ بنایا وہ بھی کوئی معمولی جرم نہیں، بلکہ ایسا اقدام خود موجبِ کفر اور بڑی شقاوت کی بات ہے، انبیاء کرام کے قتل کی کوشش کرنا تحقیر و استخفاف کو مستلزم ہے جس سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور ایسا آدمی اگر رنگے ہاتھ پکڑا جائے تو اس کی سزا قتل ہے، صرف اسلام ہی

[1] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، كتاب الإيمان، باب منه في المنافقين، رقم الحديث: 109/4221

میں نہیں بلکہ دنیوی قانون کے مطابق بھی سربراہ مملکت کے قتل کی سزا پھانسی ہی ہے۔

لیکن ان سب اُمور کے ہوتے ہوئے حضور ﷺ نے ان کو قتل نہیں کروایا، حالانکہ آپ ﷺ کیلئے یہ کوئی مشکل اقدام نہیں تھا، بلکہ جانثاران آپ ﷺ کے ایک اشارہ پر یہ سب کچھ کرنے کیلئے تیار تھے، اور بیرونی دنیا میں بھی کوئی انصاف پسند شخص اس اقدام کو ناجائز یا خلاف قانون نہیں کہہ سکتا تھا، بلکہ پوری دنیا ہمیشہ سے اس پر عمل پیرا ہے، لیکن حضور ﷺ نے ان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ خود آپ ہی نے ﷺ اس کی وضاحت فرمادی کہ " أكره أن يتحدث الناس أن محمدا يقتل أصحابه" جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ تبدیل نہ ہو جائے، اس طرح کرنے میں اگرچہ ان افراد کا منکر ختم ہو جاتا، لیکن اس کے مقابلے میں ایک عظیم دینی مصلحت فوت ہو رہی تھی، کہ اگر ان کو قتل کر دیا جائے تو بعض ناسمجھ لوگ اس کو غلط رُخ نہ دیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے بارے میں لوگوں کے اچھے جذبات اور تاثرات تبدیل ہو جائیں، اور نیک نامی بدنامی میں بدل نہ جائے جو غیر مسلم لوگوں کیلئے دائرہ اسلام کے اندر داخل ہونے سے رکاوٹ بنے، اس عظیم تر مصلحت کی خاطر آپ ﷺ نے ان کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں جہاں اسی مصلحت کے لئے ان افراد کو زندہ چھوڑا گیا جو بظاہر ایسے جرائم کا ارتکاب کر چکے تھے جن کی وجہ سے ان کا خون مباح ہو چکا تھا، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ان کے معدوم کر دینے میں ذرا دیر نہیں لگتی تھی، ایسے افراد کا قتل کرنا یقیناً ایک دینی مصلحت ہے لیکن چونکہ

اسکے مقابلے میں اس سے بڑی اور عظیم مصلحت فوت ہورہی تھی، اس لئےاس کے حصول کیلئےاس مصلحت پر عمل نہیں کیا گیا۔

اسی اُسلوبِ دعوت کی ایک نظیر وہ بھی ہے جو امام بخاری رحمۃاللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل فرمائی کہ :

"قال النبي ﷺ: " يا عائشة لولا قومك حديث عهدهم - قال ابن الزبير - بكفر، لنقضت الكعبة فجعلت لها بابين: باب يدخل الناس وباب يخرجون۔ "

"حضرت عائشہ ﷺ فرماتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا، اے عائشہ: اگرآپ کی قوم نئے نئے (کفرسے)اسلام نہ لائی ہوتی تو میں کعبہ کومنہدم کرتا اور پھر (نئے سرے سے تعمیر کرکے) اسکے دو دروازے بناتا، ایک دروازے سے لوگ اندر جاتے اور دوسرے سے باہر نکلتے۔"[1]

محدثینِ کرام اور مؤرخین کہتے ہیں کہ قریش نے کعبہ کے دوبارہ تعمیر جدید میں دو غلطیاں کی تھیں، ایک یہ کہ حطیم کو کعبہ سے باہر رکھاگیا، حالانکہ بنائےابراہیمی میں یہ جگہ کعبہ کا باقاعدہ حصہ تھی،اوردوسری غلطی یہ ہوئی کہ پہلے اندر جانےاور باہر آنے کے لئے دو مختلف دروازے نصب تھے جن کو مشرکین نے ختم کر دیا اور دو کے بجائے ایک دروازہ برقرار رکھا۔

---

[1] صحيح البخاري ،كتاب العلم، باب من ترك بعض الاختيار، مخافة أن يقصر فهم بعض الناس عنه، فيقعوا في أشد منه، رقم الحديث: 126

بیت اللہ کے تعمیر جدید نہ کرنے کی وجہ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کعبہ مبارکہ اسلام کا قبلہ اور شعائر اسلام میں سے بڑی عظمت کا حامل ہے، اس کی بقاء و حفاظت ایک اہم اور بنیادی ذمہ داری ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیاد رکھی تھی، اور ان ہی کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا، ان کی تعمیر و ترتیب کو برقرار رکھنا ایک ضروری اقدام تھا، جس کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا تمنا فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ قریش کے طرز تعمیر کو ختم کر کے ایک بار پھر اپنے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز پر اس کی تعمیر کی جائے تاکہ قیامت تک وہی یاد تازہ رہے، قریش اپنی وقتی مجبوری کی بناء پر اس کی کماحقہ تعمیر نہ کر سکے تھے، لیکن اب وہ مجبوری باقی نہ رہی تھی، اسلئے بظاہر اس تعمیر کو برقرار رکھنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔

لیکن چونکہ لوگ ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہو گئے تھے، کعبہ کو منہدم کرنے اور پھر نئی ترتیب کے ساتھ بنانے میں ان کے ایمان ویقین میں تزلزل آجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس مبارک تمنا کو عملی طور پر پورا نہیں فرمایا۔

اگر دیکھا جائے تو بیت اللہ کے پرانے طرز پر تعمیر کرنے میں یقیناً ایک دینی مصلحت ہی مضمر تھی کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی یاد تازہ رہے اور خانہ خدا کے اصل حدود وانداز برقرار رہیں، مگر اس مصلحت کو حاصل کرنے میں چونکہ ایک اور مصلحت ہاتھ سے نکل رہی تھی جس کا نقصان و خسارہ کعبۃ اللہ کے موجودہ صورت حال پر چھوڑنے کے نقصانات سے کہیں زیادہ اور شدید تھا، اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ تعمیر نہیں فرمائی۔

حالات و مواقع کے جائزہ لینے کی اہمیت

رحمتِ عالم ﷺ کے ان جیسے تمام واقعات کو مد نظر رکھ کر یہ سبق ملتاہے کہ داعی کو ہر جگہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا ضروری نہیں، ناعاقبت اندیشی کے ساتھ وقتی جذبات کی موجوں میں بہہ کر انسان غیر ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتاہے، اسلئے داعی کو چاہیئے کہ وہ موقع و محل کے لحاظ سے موجودہ و ممکنہ تمام مصالح و مفاسد کا دیانتدارانہ موازنہ کرے، اس کے بعد ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فیصلہ کرے۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تصنیف" القواعد الکبریٰ"میں تحریر فرماتے ہیں:

"الأمر بالمعروف وسيلة إلى تحصيل ذلك المعروف المأمور به، رتبته في الفضل والثواب مبنية على رتبة مصلحة الفعل المأمور به في باب المصالح--وكذا النهي عن المنكر وسيلة إلى دفع مفسدة ذلك المنكر المنهي عنه، ورتبته في الفضل والثواب مبنية على رتبة درء مفسدة الفعل المنهي عنه في باب المفاسد۔"

"امر بالمعروف اس نیکی کے موجود ہونے کا وسیلہ ہے جس کا حکم دیا جارہا ہو، اس کی فضیلت وثواب اسی کام کے مصالح پر موقوف ہے، اسی طرح نہی عن المنکر بھی اس منکر کے ختم کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے جس سے کسی

کو روکا جارہا ہو،اس کی فضیلت وثواب بھی اس کام کے فساد دور کرنے
کے مرتبہ پر موقوف ہے۔"[1]

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے تفصیل ووضاحت کے ساتھ مصالح ومفاسد کی اس بحث کو تحریر فرمایا ہے،ملاحظہ فرمائیں: مجموع الفتاویٰ ،کتاب الجہاد، ج28ص129۔

[1] قواعد الأحكام في مصالح الأنام،فصل في بيان الوسائل إلى المصالح،1 / 124

سلفِ صالحین کے دعوت دینے کا ایک ضروری باب

سلفِ صالحین اور اکابرینِ اُمت کا یہی وطیرہ رہا، اُنہوں نے دعوتِ دین کی راہ میں ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا، اپنی خداداد صلاحیت واستعداد اور گہرے فہم وفراست سے ایسی روشن مثالیں قائم فرمائی جن پر اُمت مسلمہ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے، ان روشن ضمیر ہستیوں نے حالات کے مختلف موجوں کا سامنا کیا، زندگی کے متعدد باغ وبہار دیکھے، موافق ومخالف کے درمیان اپنی زندگیاں گزاری، خدمتِ دین کے میدان میں مختلف مراحل دیکھے جس میں متنوع رنگ وڈھنگ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت پیش آتی رہی۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان حضرات نے حالات وماحول کو مدِ نظر رکھ کر ایسے حکیمانہ اور عاقلانہ فیصلے کئے، امر و نہی کا فریضہ اتنی خوش اسلوبی اور احسن انداز سے نبھایا کہ جن میں ایک طرف مصالحِ شرع اور مقاصدِ شریعت کا بھرپور لحاظ کیا گیا تھا، دوسری طرف حد درجہ مؤثر ومفید بھی تھا، بعض اوقات کوئی ظریفانہ طریقہ کار اپنا کر بھی دعوت خیر کا کام انجام دیا کرتے، اس موضوع کے حوالے سے ان حضرات کے سیر وسوانح کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

عبداللہ بن مبارک کا ستار توڑنا

حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ جارہے تھے وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا جو ستار مار گانے بجانے میں مشغول تھے، آپ نے ان سے کہا کہ یہ ستار مجھے ہدیہ کے طور پر دیدو پھر دیکھو کہ میں کس طرح مارتا ہوں، اُنہوں نے سمجھا کہ

شاید یہ بھی ہماری ہی طرح ستار مار کیف وسرور کی فضاء قائم کرے گا،اس لئے ستار آپ کے حوالہ کر دیا، آپ نے لیتے ہی زمین پر گرا کر ستار کو توڑ ڈالا۔[1]

معلوم ہوا کہ داعی کے لئے ہوشیار اور سمجھ دار ہونا چاہئے کہ وہ موقع و محل کے مناسب کوئی طریقہ کار اپنائے اور نہی عن المنکر کے لئے کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کرے جس میں شرعی و قانونی لحاظ سے اس پر کوئی ایسی قدغن نہ آتی ہو جس کے برداشت کرنے کی استطاعت نہ ہو، صرف جذبات کی رو میں بہنا خدمتِ دین کیلئے مفید ثابت نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات ایسا کرنا فتنہ وفساد اور پہلے سے بڑھ کر منکرات کا ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے۔

حالات کو سمجھے بغیر دعوت دینے کے نقصانات

تاریخِ اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفاءِ راشدین کے سنہرے دور کے بعد خلافت و حکومت اور ولایت کے متعلق جتنے فتنے وفساد کھڑے ہوئے، ان کا زیادہ تر سرچشمہ اور بنیاد اسی اُصول سے غفلت و کوتاہی تھی، جن لوگوں کے ہاتھوں مختلف فتنوں نے جنم لیا، وہ سب کے سب ان فتنوں کے حامی نہ تھے بلکہ بعض اوقات بہت سے مخلص اور وفا شعار بندگانِ خدا کے ہاتھوں بھی لاشعوری طور پر معاصی و منکرات کا وہ سلسلہ قائم ہوا کہ جس کا انجام دیکھ کر وہ خود بھی افسردہ و پشیمان تھے۔

ابتداء یہی سے ہوئی کہ کسی منکر کو دیکھا، دینی حمیت سے اس کو برداشت نہیں کیا اور اس کو ختم کرنے کے لئے متعدد ایسے معاصی و منکرات وقوع پذیر ہوئے جو

---

[1] نصاب الاحتساب،ص324-

پہلے سے کہیں بڑھ کر منکر و شنیع تھے، لیکن چونکہ بر وقت اس بات کا جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی شروع کرتے وقت ان باتوں پر غور وخوض کیا گیا تھا، اسلئے اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ بارش سے بچنے کیلئے پرنالے کا سہارا لیا گیا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے باب دوم میں جو اُصول وضوابط، شرائط وارکان اور آداب واخلاق کا ذکر ہوا، ان میں سے متعدد اُمور کی بنیاد ہی یہی ہے کہ داعی دعوت دینے سے پہلے مصالح ومفاسد کا اچھی طرح موازنہ کرے، انجام وعواقب پر غور کرے، حالات وماحول اور مخاطب کی صورتحال کو پرکھنے کے بعد ہی کوئی اقدام کرے۔

لوگوں کی مخالفت اور منفی پروپیگنڈا

قسامِ ازل کی طرف سے انسان کے اندر یہ فطرت ودیعت رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی مخالفت برداشت نہیں کرسکتا، ناموافق فضاء میں زندگی گزارنا طبیعت کے لئے وبالِ جان سے کہیں کم نہیں، مشکل حالات میں ہر ممکن طریقے سے دفاع کرنے کو اپنا ضروری حق سمجھتا ہے، اگر اور کچھ نہ بھی کرسکے تو کم از کم دل میں اس زخم کو تازہ رکھنا اور متعلقہ فرد سے نفرت وعداوت کے جذبات استوار رکھنا رکھنا انسانیت کی ایک ایسی کمزوری ہے جس سے مجموعی طور پر بہت کم افراد کو نجات نصیب ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ برتن سے وہی کچھ ٹپکتا ہے جو اس کے اندر سمویا ہوتا ہے، جب دل اس قسم کے جذبات سے بھرا پڑا ہو تو موقع ملتے ہی اس کا اظہار ہوتا رہے گا، اگر دیگر اعضاء وجوارح سے دلی بھڑاس نکالنے کی راہ نہ مل سکے تو کم از کم زبان سے ان جذبات کی ترجمانی ہوتی رہتی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا راستہ بھی ایسا ہی پرخار ہے، جو شخص کماحقہ

اس سے وابستہ ہو جاتا ہے اس کا صلہ دنیا میں عام طور پر مخالفت ہی سے ملتا ہے، اپنے اور پرائے طعن و تشنیع کے تیر برسانا شروع کر دیتے ہیں، اور اگر ماحول ہی ناموافق ہو تو اس سے بڑھ کر قسم قسم کے پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، نت نئے قسم کے الزامات باندھنے کا سلسلہ رواں ہو جاتا ہے، ان سب نتائج کو دیکھ کر داعی حق کو اکتانا یا دل برداشتہ ہونا نہیں چاہئے، بلکہ تجربہ کار طبیب اور خیر خواہ باپ کی طرح یہ سب کچھ برداشت کر کے انسانیت کی اس کمزوری پر مزید توجہ مرکوز رکھ لینی چاہئے۔

داعی بلکہ ہر مسلمان کیلئے صبر و برداشت کی صفت اپنانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان جیسے حالات میں جب وہ سمجھتا ہے کہ دوسروں کی نفع رسانی اور رہنمائی کے نتیجے میں اسے مخالفت و عداوت ہی سے نوازا جارہا ہے یہ دیکھ کر وہ ہمت ہار جاتا ہے اور آئندہ خاموشی اور مداہنت کا رویہ اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور خیال کرتا ہے۔

دعوتِ دین کا ایک لازمی نتیجہ تاریخی شخصیات کے تناظر میں

تاریخ گواہ ہے کہ یہی مخالفانہ فضاء ہی وہ نشانِ منزل ہے جس سے داعی صحیح رُخ کی تعیین کر سکتا ہے، اس سے دعوت کی افادیت کا کسی حد تک فیصلہ کیا جا سکتا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے راستے پر گامزن ہر راہی کو اس سے واسطہ پیش آنا ضروری ہے۔

آخر کوئی تو بات ہے کہ جب سے حضور ﷺ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عملی اقدام شروع فرمایا تو وہی لوگ جو آج تک آپ ﷺ ثنا خوان تھے، دل و جان سے آپ ﷺ صداقت و امانت اور اعلیٰ اخلاق کے مداح تھے، اُنہوں نے ہی مکہ مکرمہ کے طول و عرض میں پروپیگنڈے کا اتنا نہایت وسیع جال بچھایا ، الزامات اور اتہامات کی ایسی بوچھاڑ

کردی کہ بہت سے حقیقت شناس اور انصاف پسند افراد کو بھی آپ ﷺ کے قریب جانے اور زیور اسلام سے آراستہ ہونے میں طویل عرصہ تک تامل رہا، باہر سے آنے والے مہمان بھی بڑے خوف و خطر سے مکہ میں داخل ہوتے کہ کہیں نعوذ باللہ اس آدمی کے جال میں نہ پھنسے، لیکن آپ ﷺ دعوت دین کی مثالی نمونہ کے طور پر کھڑے رہے اور سو فیصد حقانیت اور پختہ یقین کے باوجود نہ اپنے حلقہ بگوش کی کمی سے متاثر ہوئے نہ ہی مخالفین واغیار کی لامتناہی لشکروں کو دیکھ کر آپ ﷺ پر کوئی مایوسی چھائی بلکہ نہایت صبر واستقامت سے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے، پھر کیا تھا کہ کچھ ہی عرصہ بعد مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ میں نہیں دنیائے انسانیت میں ایک بے نظیر انقلاب برپا کیا۔

داعی کیلئے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ایک اہم سبق

امام ابو بکر ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور تابعی حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ نقل فرمایا ہے کہ:

"إن قيام المؤمن بحق الله لم يبق له طريقا، والله إنا لنأمر بالمعروف وننهى عن المنكر، فتتخذونا أعداء، ويجدون على ذلك من الفساق أعوانا، حتى رموني بالعظائم، والله لا يمنعني ذلك من أن أقوم لله بحق۔"

"مردِ مؤمن جب اللہ تعالیٰ کے حقوق قائم رکھتا ہے تو اس کی وجہ اس کا کوئی دوست باقی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کی قسم: جب ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں تو لوگ ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں، اور اس دشمنی میں ان کے

اور یار و مدد گار بھی پیدا ہوتے ہیں، اللہ کی قسم: اُنہوں نے مجھ پر بڑی بڑی تہمتیں اور الزامات بھی لگائے، اللہ کی قسم: یہ سب باتیں میرے لئے اللہ کے حقوق قائم کرنے سے روک نہیں سکتے۔ "[1]

انہی کے حالات بیان کرتے ہوئے امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا ایک اور ملفوظ نقل فرمایا کہ:

"إن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لم يدع للمؤمن صديقاً۔"

" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے مسلمان شخص کا کوئی دوست نہیں چھوڑا (یعنی اس کی وجہ سے مرد مؤمن کی ساری دوستیاں دشمنیوں میں اور محبتیں نفرتوں میں بدل جاتے ہیں۔)"[2]

حضرت مسعر بن کدام کے تجربات کا خلاصہ

حضرت مسعر بن کدام (المتوفی ۱۵۵ھ) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"ما نصحت أحدا إلا طلب عيوبى فالشيطان وأعوانه يؤدون أن لايأمر أحد بمعروف ولا ينهي عن منكر، وإذا أمرهم أحد أو نهاهم عابوه بما فيه و بما ليس فيه۔"

"میں نے جب بھی کسی کو نصیحت کی تو وہ میرے عیوب اور کمزوریاں تلاش

[1] الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر لابن أبي الدنيا، 118

[2] صفة الصفوة،رقم الترجمة: 398، أويس بن عامر بن جرير بن مالك القرني 31/2، وكذاذكره العلامة الشاطبى فى الاعتصام ،مقدمة المؤلف، 39/1

کرنے لگ گیا، شیطان اور اس کے مدد گار چاہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص نہ نیکیوں کی طرف لوگوں کو بلائے نہ برائیوں سے کوئی کسی کو منع کرے، اور جب کوئی نیکی کا حکم یا برائی سے منع کرتا ہے تو یہ لوگ اس کی عیب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں چاہے وہ عیب اس میں واقعۃً موجود ہو یا نہیں۔"

حضرت مطرق بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ:

"قال لي مالك: ما يقول الناس في؟ قلت: أما الصديق فيثني وأما العدو فيقع، قال: ما زال الناس كذا لهم صديق وعدو ولكن نعوذ بالله من تتابع الألسنة كلها۔"

"مجھ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: لوگوں کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے جواب میں کہا کہ دوست اور موافق لوگ تو تعریف کرتے ہیں اور دشمن لوگ تنقیص، امام مالک نے فرمایا: دوست و دشمن کا یہ تسلسل ہمیشہ سے جاری ہے، البتہ تمام لوگوں کی مخالفت سے اللہ کی پناہ۔"[1]

جو لوگ بروقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہیں دیتے، بلکہ لوگوں کی کوتاہیوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر بلا وجہ خاموشی اختیار کرتے ہیں، عام طور پر ایسے ہی لوگوں کی مقبولیت و محبوبیت زیادہ ہوتی ہے، کم علم لوگ دلوں میں وہی افراد بساتے ہیں جو ان سے ظاہری خوشی و مدارات سے پیش آتے ہیں، حقیقی مصلح اور خیر خواہ سے نفرت کی سی فضاء موجود رہتی ہے۔

---

[1] الكنز الأكبرمن الأمربالمعروف والنهي عن المنكر، باب معاداة العصاة لأمرين بالمعروف والناهين عن المنكر، ص296تا299

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"إذا رأيتم العالم كثير الأصدقاء فاعلموا أنه مخلط؛ لأنه إن نطق بالحق أبغضوه. "

"جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ اسکے دوست واحباب زیادہ ہیں تو سمجھو کہ وہ خلط ملط کرنے والا ہے، کیونکہ اگر وہ حق بات کرتا تو لوگ اس سے نفرت رکھتے۔"[1]

لیکن جب داعی کے پیش نظر لوگوں کی تعریف و مدح نہ ہو بلکہ رضاء خداوندی مد نظر ہو تو اس کو لوگوں کی مخالفت وعداوت پریشان نہیں کرتی، نہ ہی مخالفین اس کی حوصلہ شکنی کا باعث بن سکتی ہیں، دعوت الی اللہ کا راستہ اپناتے ہوئے داعی کو پہلے ہی سے یہ باور کرلینا چاہیئے کہ یہ پھولوں بھرا سیٹج نہیں بلکہ کانٹوں سے بھرپور ایک ایسا راستہ ہے جس میں ہر ہر قدم پر تکلیف ومشقت ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نیکی کی طرف بلانا یا برائی سے روکنا یقیناً ایک احسان ہے، لیکن ایسا احسان جس کا بدلہ دنیا میں عام طور پر تکلیف واذیت اور مخالفت وبدنامی ہی سے ملتا ہے، داعی مخاطب کا بدخواہ نہیں ہوتا ، لیکن انسان اپنی نفسیاتی مجبوری کی بناء پر اس کو برداشت نہیں کر پاتا، اسلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کیلئے آخرت کے ثواب وانجام پر یقین کر کے ان سب باتوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی ہدایت

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صحابی رسول حضرت عمیر بن حبیب رضی اللہ عنہ کا وصیت

---

[1] المدخل لابن الحاج،فصل في العالم وكيفية نيته، 1 / 66

نامہ نقل فرمایا ہے کہ جس کی روشنی میں داعی کے لیے دعوت دین کے اس مشکل میں نجات کا راستہ واضح ہو جاتا ہے، آپ وصیت میں ہے:

"وإذا أراد أحدكم أن يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر فليوطن نفسه قبل ذلك على الأذى وليوقن بالثواب من الله فإنه من يوقن بالثواب من الله لا يجد مس الأذى۔"

"جب تم میں سے کوئی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے تو اس کو چاہئے کہ پہلے سے اپنے نفس کو تکلیف کا خو گر بنائے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ثواب کا یقین کرے کیونکہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ثواب پر بھروسہ کرلیتا ہے وہ تکلیف کو محسوس نہیں کرتا۔"[1]

٩٩٩

[1] السنن الكبرى للبيهقي ،كتاب آداب القاضى، قبيل باب كراهية الإمارة وكراهية تولي أعمالها لمن رأي من نفسه ضعفا،رقم الحديث: 10،162/20210

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق چند متفرق کثیر الوقوع فقہی مسائل

گناہوں پر مشتمل محفلوں میں شرکت کرنے کا حکم

خوشی، شادی اور غمی کے موقعوں پر منعقد کرائے جانے والے وہ تمام مجالس و محافل جو کسی ناجائز عنصر پر مشتمل ہوں، مثلاً تصویر سازی، گانا بجانا، بے پردگی اور بے حیائی، مرد و عورت کا ناجائز اختلاط، کسی غیر شرعی نظریے کا پرچار، اسی طرح وہ سیمینار جو کسی ناجائز پالیسی کی تبلیغ و تلقین کیلئے منعقد کرائے جاتے ہیں، ان تمام کانفرتوں میں شرکت کرنے کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اگر پروگرام کے ذمہ دار افراد نے دعوت دی ہو، لیکن جس کو بلایا جارہا ہے، اس کو علم ہے کہ پروگرام میں کچھ ناجائز عناصر شامل ہوں گے تو ایسی صورت میں جانا شرعاً درست نہیں۔

۲۔ اگر پروگرام میں شرکت کرنے سے پہلے اس بات کا اندازہ نہ تھا، وہاں پہنچ کر پتہ چلا تو دو صورتیں ہیں:

الف: یا تو یہ غیر شرعی اُمور پروگرام میں ایسے شامل ہوں گے کہ شرکت کرنے والے کا اس سے بچنا ناممکن یا مشکل ہوگا، مثلاً پروگرام ہال میں مرد و زن کا اختلاط، ناجائز اُمور کی ترویج و اشاعت وغیرہ، تو ایسی صورتحال میں کسی بھی مسلمان کیلئے وہاں ٹھہرنا جائز نہیں۔

ب: اور اگر یہ اُمور مجلس سے الگ کسی ایسی جگہ میں ہو کہ شریک ہونے والے افراد اس معصیت میں شریک نہ ہوں، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ دیندار اور معزز افراد کیلئے اس میں شمولیت درست نہیں، عام افراد کیلئے گنجائش ہے۔

3۔اگر کسی کو معلوم ہو کہ اس کے جانے اور پروگرام میں شمولیت اختیار کرنے کی وجہ سے منکرات ختم ہو جائیں گے تو اس کے لئے وہاں جانا ضروری ہے اور قدرت کے باوجود بلا عذر نہ جانا شرعاً درست نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ" میں ہے:

"ومن دعى إلى وليمه أو طعام فوجد ثمة لعبا أو غناء فلا بأس بأن يقعد ويأكل ۔وهذا لأن أجابة الدعوة سنة قال عليه الصلاة والسلام من لم يجب الدعوة فقد عصى أبا القاسم فلايتركها لما اقترنت به من البدعة من غيره كصلاة الجنازة واجبة الإقامة وإن حضرتها نياحة فإن قدر على المنع منعهم وإن لم يقدر يصبر وهذا إذا لم يكن مقتدى به فإن كان مقتدى ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين۔ ولو كان ذلك على المائدة لا ينبغي أن يقعد وإن لم يكن مقتدى لقوله تعالى { فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين } وهذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر لأنه لم يلزمه حق الدعوة ۔"

"جس شخص کو کسی ولیمہ ، کھانے وغیرہ کی دعوت دی گئی اور وہاں (جا کر) گانا وغیرہ کوئی ناجائز چیز دیکھی تو اس کیلئے بیٹھنے اور کھانے کی گنجائش ہے، کیونکہ دعوت قبول کرنا سنت ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو دعوت قبول

نہ کرے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی، لہذا اس سنت عمل کو ملے ہوئے بدعات کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاسکتا، جیسا کہ نماز جنازہ میں اگر کوئی نوحہ گر حاضر ہو جائے تب بھی نماز پڑھنا ضروری ہے۔ پس (جا کر دیکھنے کے بعد) اگر اس کے روکنے کی قدرت ہو تو ان کو روکے ورنہ برداشت کرے۔"

لیکن یہ تب ہے جب یہ حاضر ہونے والا شخص لوگوں کا مقتدا نہ ہو، اگر ہو اور ان کو منع کرنے کی استطاعت نہ ہو تو خود ہی نکل جائے اور ان کے ساتھ (بالکل) نہ بیٹھے، کیونکہ اس میں دین کی بدنامی ہے اور (اتباع کرنے) مسلمانوں پر گناہ کا دروازہ کھولنا ہے، اور اگر یہ معصیت دستر خوان پر موجود ہو تو بیٹھنا بالکل مناسب نہیں اگرچہ مقتدا نہ بھی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یاد آجانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو، اور یہ ساری تفصیل تب ہے جب موقع پر حاضر ہونے کے بعد ان چیزوں کا پتہ چلا، اگر پہلے سے اس کا علم ہو تو حاضر ہی نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں دعوت (قبول کرنا) لازم ہی نہیں"۔[1]

علامہ اِتقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فإن علم قبل الدخول إن كان محترما يعلم أنه لو دخل عليهم يتركون ذلك احتراما له فعليه أن يذهب؛ لأن فيه ترك المعصية والنهي عن المنكر. "[2]

---

[1] الهداية شرح البداية ، كتاب الكراهية، قبيل فصل في اللبس،ج4 ص80.

[2] حاشية الشلبي على تبيين الحقائق،كتاب الكراهية،ج6ص13.

مرتکبِ گناہ کے سرپرست یا ذمہ دار افراد کو اطلاع دینے کا حکم

اگر کسی شخص کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ کسی اعتقادی یا عملی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، تو اولاً نہی عن المنکر کے سابقہ اُصولوں کی روشنی میں خود اس کو سمجھانا چاہئے، اگر تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اپنی روش سے باز نہ آئے، تو کیا اس کے سرپرست یا دیگر ذمہ دار افراد کو حقیقت حال کی اطلاع دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ ایسا کرنا غیبت اور چغل خوری میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ذمہ دار افراد کو آگاہ کرنے کی صورت میں یہ اطمینان ہو کہ وہ مخاطب کو اس گناہ سے روک سکے گا تو ایسی صورت میں ان کو اطلاع دینا جائز ہے ورنہ نہیں۔

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

"رجل علم أن فلانا يتعاطى من المنكر هل له أن يكتب إلى أبيه بذلك قالوا إن كان يعلم أنه لو كتب إلى أبيه يمنعه الأب عن ذلك و يقدر عليه يحل له أن يكتب، و إن كان يعلم أن أباه لو أراد منعه لا يقدر عليه فإنه لا يكتب كي لا تقع العداوة بينهما و كذلك فيما كان بين الزوجين و بين السلطان والرعية و الحشم إنما يجب الأمر بالمعروف إذا علم أنهم يسمعون۔"

"ایک شخص کو دوسرے کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہے تو کیا وہ اس کے باپ کو اس کے متعلق خط لکھ سکتا ہے؟

فقہاء کرام نے فرمایا کہ اگراس کو یقین ہو کہ باپ کو لکھنے کی صورت میں وہ اس کو گناہ سے منع کرے گا اور باپ اس پر قادر بھی ہو تو پھر (اس کو خط) لکھنا جائز ہے، اور اگراس کو پتہ ہے اگر باپ منع بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں خط نہ لکھے تاکہ ان کے درمیان (بلا فائدہ) دشمنی پیدا نہ ہو جائے، یہی حکم میاں بیوی اور حاکم ورعیہ کا بھی ہے، (کیونکہ یہ خط لکھنا بھی امر بالمعروف ہی کی ایک صورت ہے اور ضابطہ یہ ہے کہ) امر بالمعروف تب ہی ضروری ہے جب پتہ ہو کہ مخاطب لوگ بات سنیں گے۔"[1]

ناجائز اُمور کا تماشا کرنا

قرآن وسنت کی رو سے جن کاموں کا کرنا شرعاً ناجائز ہے، عام حالات میں اس کا نظارہ کرنا، اس کے دیکھنے کیلئے خاموش تماشائی بننا بھی شرعاً ناجائز اور گناہ ہے، کیونکہ اولاً تو اپنی استطاعت کے مطابق منکر پر نکیر کرنا اور اس کو ختم کرنا ضروری ہے، اگر کسی ایسے اعذار کی وجہ سے نکیر نہ کر سکے جو شریعت کی نگاہ میں ترک نکیر کیلئے کافی ہے (جس کی تفصیل اسی کتاب کے شرائط وارکان کے باب میں ذکر کی جاچکی) تو خاموش تماشائی بننا ان کی معصیت پر ایک گونہ رضامندی ہے جس کے گناہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لئے قرآن کریم میں بھی اس سے منع فرمایا گیا۔

چنانچہ سورۃ النساء میں ہے:

"وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ

---

[1] فتاوى قاضيخان ،كتاب الحظروالإباحة، فصل في التسبيح و التسليم و الصلاة على النبي ﷺ و التعاويذ و ما يرجع إلى الأمور الدينية ،3 / 263

بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ إِنَّ اللهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا۔"

"اور اللہ نے تم پر قرآن میں حکم اُتارا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں پر انکار اور مذاق ہوتا سنو توان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ کسی بات میں مشغول ہوں ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے اور اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں ایک ہی جگہ اکٹھا کرنے والا ہے۔"[1]

سورۃ الانعام کی آیت نمبر ٦٨ میں بھی یہی حکم ارشاد فرمایا گیا، علامہ ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"حضرات مفسرین نے اس کی تفسیر میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، یہ جو لوگ ظلم وجور یا فسق وفجور میں مشغول ہوں ان کے مجالس میں بیٹھنا درست نہیں، بلکہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ حالات و مواقع کو مد نظر رکھ کر پہلے ہاتھ یا زبان سے اس منکر پر نکیر کرے، جو لوگ اس میں مبتلا ہوں ان کو سمجھایا جائے تاکہ وہ اس منکر سے باز آجائیں اگر کسی موقع پر یہ تمام کاروائی مفید ثابت نہ ہو اور مخاطب بہرحال اس کو کر رہا ہو یا کہیں نکیر کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے تو ایسی صورت میں ان کے ساتھ بیٹھنا، ان کے کام میں شریک ہونا ہونا جائز نہیں بلکہ داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے بالکل الگ تھلگ رہے۔"

علامہ جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ " معصیت

---

[1] النساء : 140

کے اظہار کے باوجود نکیر کئے بغیر بیٹھنا ایک گونہ رضامندی ہے جس کی قباحت محتاج بیان نہیں۔"[1]

اس سے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ناجائز اُمور کا تماشا کرنا جائز نہیں، آج کل دیندار حلقے میں بھی اس کا خیال نہیں رکھا جاتا، گانے بجانے اور بعض دیگر مشہور منکرات کے مجالس میں جانے کو ہر کوئی غلط سمجھتا ہے، لیکن کھیل وکھود کے وہ میدان جہاں سترِ عورت کا پورا لحاظ نہیں رکھا جاتا، نماز وغیرہ فرائض و حقوق کی رعایت نہیں کی جاتی، وہاں جانے اور تماشا کرنے کو کوئی ناجائز نہیں سمجھتا۔

غیرِ مسلم لوگوں کے وہ پروگرام جن کی بنیاد ان کے مذہبی عقائد ہوں، اسی طرح اہلِ بدعت کے وہ جلسے وجلوس یا مجالس ومحافل جو شریعت کی نگاہِ بصیرت میں ناجائز ہوں، ان تمام جگہوں پر تماشا کیلئے جمع ہونے والوں میں سے ایک جمِ غفیر مسلمانوں کی بھی ہوتی ہے۔

حالانکہ تمام مقامات کا حکم ایک ہی ہے کہ کہ اولاً تو معصیت پر نکیر کرے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو کم ازکم دل میں اس سے نفرت رکھے اور وہاں سے دور ہو جائے، بغیر تغییر و نکیر کے وہاں خاموش تماشائی بننا بالکل جائز نہیں، اگر کہیں نکیر کرنے سے کوئی معتبر عذر مانع بھی ہو تو بھی نظارہ ومشاہدہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

علامہ ابن النحاس شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا:

---

[1] أحكام القرآن للجصاص،باب النهي عن مجالسة الظالمين،تحت قوله تعالى" وإذا رأيت الذين يخوضون" 3/3 دار الكتاب، كانسی رود

"من علم أن بموضع من بلدته منكرا لايرجع إليه في إنكاره لزمه أن لايحضر ذلك الموضع ويعتزل في بيته حتي لايشاهده، ولايخرج إلالحاجة مهمة أو واجب، لأن عجزه عن الإنكار ليس عذرا في مشاهدة هذا المنكر من غيرضرورة۔"

"جس آدمی کو معلوم ہوا کہ اس کے شہر کے فلاں جگہ کوئی ایسا منکر ہے جس کو یہ ختم نہیں کر سکتا تو اس پر ضروری ہے کہ اس جگہ حاضر ہی نہ ہو اور گھر میں جدا بیٹھا رہے، تاکہ اس منکر کا مشاہدہ ہی نہ ہو، کسی شدید ضرورت کے بغیر نہ نکلے، کیونکہ محض نکیر کرنے سے عاجز آنا منکر کے مشاہدہ کرنے کیلئے کوئی عذر نہیں۔"[1]

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت اور صفاءِ قلب سے نوازا ہے، وہ ان جیسی مجلسوں میں گناہوں کی ظلمت اور بدعات کی تاریکی محسوس کرتے ہیں، اسی لئے "اولیاء الرحمن" (اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے) ان جیسی محافل میں جانے سے قطعاً گریز کرتے ہیں، تاریخ کے اوراق میں ایسے حضرات کی یادیں بھی محفوظ ہیں جن کو رسمی علوم سے کوئی خاص تعلق نہ تھا بلکہ اس باب میں ان کو "اُمی" (اَن پڑھ/ناواقف) کہا جاتا تھا لیکن کسی بھی محفل کو دیکھ کر، کوئی بھی بات سن کر اس کی پوری پوری تشخیص کرتے اور بالکل ٹھیک تبصرہ کرتے، یہ ظاہری تجربہ یا رسمی علوم وفنون کا کمال نہ تھا کیونکہ وہ اس سے یکسر خالی تھے بلکہ تزکیہ باطن اور طاعت الٰہی میں کمال حاصل ہونے کا ایک

---

[1] تنبيه الغافلين،فصل إذاعلم أن كلامه لاينفع ولايفيد ص118

ادنیٰ انعام تھا جو ان کو حاصل ہوا۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل فرمائی جس سے اس کی تائید ہو جاتی ہے:

"قال رسول الله- ﷺ: "لا تقفنّ عند رجل يقتل مظلوما، فإن اللعنة تنزل على من حضره حين لم يدفعوا عنه، ولا تقفنّ عند رجل يضرب مظلوما؟ فإن اللعنة تنزل على من حضره حين لم يدفعوا عنه"۔"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص ظلماً قتل کیا جارہا ہو اس کے پاس کھڑے نہ ہو، کیونکہ جب وہاں موجود لوگ اسکا دفاع نہیں کرتے تو ان پر لعنت نازل ہوتی ہے۔ اور جو آدمی ظلماً مارا جارہا ہو اس کے پاس بھی بالکل کھڑے نہ ہونا جب وہاں حاضر لوگ اس کو نہیں بچاتے تو ان پر لعنت اُترتی ہے۔"[1]

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ جہاں اور جن مجالس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے، وہاں اگر کوئی شخص عملی طور پر معصیت میں شریک نہ بھی ہو تب بھی وہاں خاموش تماشائی بن کر رہنا خود خود اس حاضر ہونے والے شخص کے لیے بھی نقصان کا باعث ہے کہ وہاں لعنت خداوندی پھٹکتی ہے اور دیگر ناظرین کے لیے بھی مضر ہے کہ وہ ان جیسی

[1] ذكره البوصيري في إتحافه وقال بعده" رواه الطبراني والبيهقي بإسناد حسن "انظر إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة ، كتاب الحدود،باب النهي عن المثلة أو أن يحضر إنسان قتل إنسان ظلما ضربه،4 /271

حرکات ومجالس کو جائز سمجھنا شروع کریں گے۔

گناہوں سے بچنے کے مواقع پیدا کرنے کی اہمیت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کچھ اسی میں منحصر نہیں ہے کہ آپ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی، یا کسی گناہ کا ارتکاب ہوتا ہوا دیکھ کر اس پر نکیر کرے، بلکہ معاشرے کے لئے ایسے مواقع مہیا کرنا بھی دعوت دین کی ایک اہم اور ضروری صورت ہے جس سے ان میں شرعی احکام بجالانے کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جائے یا جن میں لوگوں کو گناہوں کا ارتکاب ہی نہ کرنا پڑے، یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک بنیادی اور مفید شکل ہے جس پر دعوت وعزیمت کے راہی گامزن رہے ہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصود یہی ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک معاصی کا خاتمہ یا اس کی تقلیل کی جائے اور یہ مقصود جس طرح گناہ کے ارتکاب کے موقع پر نکیر کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے، یوں ہی اگر پیش قدمی کر کے کوئی ایسی ترتیب عمل میں لائی جائے جس کے بعد گناہ کے ارتکاب کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے، اس سے بھی منکرات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے متعدد غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں، چنانچہ عموماً دعوتِ دین کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص کافر یا فاسق ہے اس کو نیکی کی ترغیب دی جائے یا برائی سے بچنے کی تلقین کی جائے اور بس۔ حالانکہ امر بالمعروف یا دعوتِ دین کو اس مفہوم میں منحصر سمجھنا بالکل درست نہیں ہے، اسی طرح تبلیغی جماعت کے متعلق بہت سے حلقوں میں یہ تصور بھی کیا جاتا ہے کہ یہ صرف امر بالمعروف کا کام کرتی ہے نہی عن المنکر کا فریضہ مکمل طور پر چھوڑ رکھا ہے، یہ اور اس قسم کی متعدد علمی و

عملی غلط فہمیوں کا منشا یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محدود تصور ہے۔

قیام خلافت کی اہمیت وضرورت

شریعتِ اسلامیہ میں قیامِ خلافت پر زیادہ زور اسی لئے دیا جاتا ہے کہ دین وشریعت کی تعلیمات وہدایات پر مبنی نظام کی حیثیت ایک حفاظتی حصار کی ہے جس کے ذریعے پوری اُمت مسلمہ بہت سے شر ور وفتن سے محفوظ رہ جاتی ہے اور اسی کی برکت سے مسلمان ان گنت معاصی ومنکرات کے ارتکاب سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، چنانچہ معاصی ومنکرات کی ایک لمبی فہرست ایسی بھی ہے کہ غیر اسلامی طرزِ زندگی میں رہنے کی وجہ سے مسلمان اس کا بادل نخواستہ بھی ارتکاب کرنے لگتا ہے اسی طرح بہت سے گناہ غیر شعوری طور پر بھی عمل میں آجاتے ہیں اور کچھ غیر شرعی نظام کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں اُمت کے عام افراد کے دل میں وہ دینی جذبہ برقرار رکھنا نہایت مشکل ہوتا ہے جو ان کو دینی فرائض پر گامزن رہنے اور گناہوں سے بچنے پر مجبور کرتی ہے، اب کہنے کو تو قیامِ خلافت کا دعوت دین یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس میں ظاہری طور پر نیکی کی ترغیب دی جاتی ہے نہ ہی کسی گناہ سے روکا جاتا ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ ایک کام ہزاروں واجبات کے قیام وبقاء کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اسی طرح اسی ایک اقدام سے منکرات ومعاصی کے دسیوں طوفان رخ موڑ لیتے ہیں ،یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحلت فرمانے کے بعد صحابہ کرام بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نے تمام اُمور سے اسی قیام خلافت کی ذمہ داری کو ہی زیادہ اور فوری نوعیت کا فریضہ سمجھا۔

عصرِ حاضر میں اس کی غیر معمولی اہمیت

ہم جس دور میں جی رہے ہیں اس میں دعوتِ دین کے دیگر شکلوں کی طرح اس باب کی بھی نہایت ضرورت ہے، چنانچہ اگر صرف اپنے ملک خداداد پاکستان کا جائز لیا جائے تو روزانہ کے حساب سے ہزاروں بلکہ لاکھوں معاصی ایسے ہیں کہ صحیح شرعی نظم نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اس کا ارتکاب کر جاتے ہیں، مثلاً مروجہ "عدالتوں" کا ہی جائزہ لیا جائے کہ اگر دو افراد کے درمیان تنازع پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عدالت میں کیس لے جانا چاہیں تو عدالت میں جانے سے لیکر فیصلہ ہو جانے تک منکرات و معاصی کی ایک لمبی لڑی ہوتی ہے جس کا ارتکاب ہر فریق کو کرنا پڑتا ہے، ہر پیشی کے موقع پر جھوٹ، دھوکہ، غیبت والزام تراشی، بلاوجہ تذلیل و توہین، ہتکِ عزت کے متنوع طریقے، جھوٹی گواہی اور قسم، رشوت کا لین دین اور شریعتِ اسلامیہ سے ہٹ کر کسی چیز کو قانون وفیصل بنانا، وغیرہ خرابیوں کو بار بار دہرانا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ چیزیں معمول و عادت کا درجہ پالیتی ہیں جس کے بعد اس کو ناجائز کہنے کا تصور واعتقاد بھی کمزور یا بالکل ہی مضمحل ہو جاتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کمزور اور دھندلا اعتقاد ہو بھی تو عملی لحاظ سے اس میں خواہش نفسانی کے مقابلے کرنے کا سکت باقی رہتا ہے نہ ہی کسی فرد کو گناہ سے رکنے پر اُبھارنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

تعلیمی میدان کا بھی یہی حال ہے، عصری علوم وفنون کو حاصل کرنا بذات خود کوئی ناجائز یا قابل مذمت چیز نہیں بلکہ مستحسن ہے لیکن غیر اسلامی نظام زندگی میں رہنے کی وجہ سے اس کا جو نصاب و نظام رائج ہے اس کا طرز وڈھنگ ہی کچھ ایسا ہے کہ جب ایک معصوم بچہ تعلیمی ادارے میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے لیکر اپنا تعلیمی سفر جاری

رکھ کر کوئی قابل ذکر ڈگری حاصل کر کے فارغ ہو جاتا ہے اس دوران وہ ہزاروں معاصی کا ارتکاب کر چکا ہوتا ہے، عموماً حالت یہ ہوتی ہے کہ دین اسلام کے بنیادی احکام سے بھی اگر اعتقادی و نظریاتی طور پر نہ سہی، تو کم از کم عملی طور پر دل برداشتہ ہو چکا ہوتا ہے اور چونکہ مزاج و مذاق ایسا ڈھلا ہوتا ہے کہ اس میں دین اسلام کے احکام کی پابندی کی روایت باقی نہیں رہ پاتی، اس لئے اس کے بعد کی زندگی بھی منکرات کی زہر سے سالم نہیں رہ پاتی، یہ بے راہ روی کا عادی اور حال کا جوان فرد تو ماضی میں بالکل معصومانہ حالت میں تعلیمی ادارے میں داخل ہوا تھا لیکن نصاب و نظام نے اس معصوم بچے کو کہاں سے کہاں تک پہنچایا!۔

دعوتِ دین کے کام کرنے کے دو طریقے

یہ تو صرف بطور مثال ان دونوں میدانوں کا ذکر کیا گیا ورنہ دیانتدارانہ جائزہ لیا جائے تو مغربی تمدن میں رہتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں کا یہی حال ہے کہ وہاں ٹھیٹ اسلامی تشخص اور دینی روایات پر استقامت کے ساتھ رہنا خاصا مشکل اور صبر ازما کام ہوتا ہے، اب ان جیسے مواقع میں یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کی دو صورتیں ممکن ہیں:

الف: ایک تو یہ ہے کہ مثلاً جب کوئی شخص عدالت میں جائے اور جھوٹ بولے یا تعلیمی میدان کا مسافر کسی گناہ مثلاً بد نظری و بے حیائی کا ارتکاب کرے تو موقع پر اس کو اس خاص گناہ سے روک دیا جائے اور بس۔

ب: دوسرا طریقہ یہ ہے کہ محض اتنے کام پر اکتفاء نہ کیا جائے، بلکہ اپنی استطاعت کی حد تک کوئی ایسا نظام تشکیل دیا جائے جس میں ان معاصی کے ارتکاب

کرنے کی ضرورت یا اس کا موقع ہی نہ ملے، مثلاً شرعی "نظامِ قضاء" قائم کیا جائے یا کم از کم اگر کچھ نہ ہو سکے تو اپنی حد تک "نظامِ تحکیم" کو شرعی بنیادوں اور مناسب خطوط پر استوار کیا جائے، اسی طرح اسلامی تعلیمات وہدایات کے مطابق کسی نظام تعلیم کا اہتمام کیا جائے اور اس میں کوئی ایسا متوازن نظام ونصاب رائج کیا جائے جس میں کوئی شرعی خامی بھی نہ رہے اور تعلیمی کمزوری بھی ختم ہو جائے۔

بلاشبہ یہ دونوں ہی طریقے دعوتِ دین کا حصہ اور کارِ ثواب بلکہ اُمت کی مجموعی ذمہ داری ہے لیکن ظاہر ہے کہ دوسرا طریقہ کار پہلے کی بنسبت زیادہ مفید، دور رس اور بہت کار آمد ہے کہ پہلے طریقہ کار سے تو صرف ظاہری چند منکرات کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا کچھ بڑے واجبات پر عمل ہو جاتا ہے لیکن دوسرے طریقہ کار کی برکت سے افرادِ اُمت کا نظریہ ومزاج محفوظ رہے گا جو قدم قدم پر اس کو ظاہری اور خفیہ گناہوں سے بچاتا رہے گا، لہٰذا ہمت وعزیمت کی بات یہی ہے کہ صرف پہلے طریقہ کار پر انحصار نہ رکھا جائے، بلکہ اگر خدا کی زمین کو خدا کی نافرمانیوں سے پوری طرح پاک کرنا مقصود ہو یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو کم کرنا مطلوب ہو تو دوسرے طریقہ کار کے مطابق کوئی معیاری نظم وترتیب قائم کر لینا ضروری ہے۔

منکرات کے اسباب اور ان کا خاتمہ

اسی طرح غور کیا جائے تو تقریباً تمام منکرات ومعاصی کے بنیادی اسباب وعوامل دو ہی چیزیں ہیں: دینی احکام ومسائل سے جہالت وغفلت۔2۔دنیا کی محبت۔بہت سے معاصی اس لئے عمل میں لائے جاتے ہیں کہ کرنے والے کو اس کے گناہ ومعصیت ہونے کا علم ہی نہیں ہوتا اور اگر کسی عمل کے متعلق معلوم ہو کہ وہ شریعت کی نگاہ میں

معصیت ہے تو عموماً دینا کی محبت ہی کی وجہ سے اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے کہ حب دنیا کی وجہ سے آدمی گم سن ہو کر ایسے کام بھی کر گزرتا ہے جو اس کے خیال میں مناسب نہیں ہوتے، البتہ پھر حبِ دنیا کی مختلف شکلیں ہیں چنانچہ سیم وزر کی محبت بھی حب دنیا ہے اور جاہ ودبدبہ کی محبت بھی اسی کی ایک شاخ ہے، اب اگر کچھ افراد اخلاص وللھیت کے ساتھ اس فکر کو لیتے ہیں اور طریقِ کار میں شرعی حدود وقیود کی پابندی کریں اور اہتمام کے ساتھ منکرات کے اس دواعی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہیں تو وہ لوگ بھی بلاواسطہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر رہے ہیں چاہے وہ تعلیم وتعلم اور مدارس کی صورت میں ہو یا تبلیغی جماعت کی شکل میں، یا اس کے علاوہ کسی خدمت کے عنوان سے ہو، کیونکہ یہی چیزیں معاصی کے بنیادی اسباب ودواعی ہیں اور جب مرض کے اسباب ختم ہو جائیں تو امراض بھی خود رخصت ہو جاتے ہیں۔

اگر اربابِ اختیار اس پہلو پر توجہ دیکر زندگی کے سب شعبوں میں اس طرح نظم قائم کرنے کا سنجیدگی سے اہتمام فرمائیں اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اس کام کو جاری رکھا جائے تو امید ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں اس کے اثرات وبرکات ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے، معاصی ومنکرات کی سیلِ رواں میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے گی اور ساتھ ساتھ ایسا کرنا اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی نظامِ مملکت کی طرف بھی شوق ورغبت کا موجب ہو گا جو بذاتِ خود خوشی ونیکی کی بات ہے۔

عملی طور پر دعوت دینے کی افادیت

دعوتِ دین ہو یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ صرف زبانی طور پر ہی نہیں دی جاتی، بلکہ عملی طور پر دعوت دینا بھی حضور نبی کریم ﷺ بلکہ دیگر تمام حضرات انبیاء

کرام ؑ کی مشترکہ سنت ہے، قرآن کریم نے حضور ﷺ کی زندگی کو اسوہ حسنہ قرار دیا، اہلِ مدین نے جب ان کی بات کو بے جا طور پر رد کردیا تو اس وقت حضرت شعیب ؑ نے ارشاد فرمایا تھا کہ :

"وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَى مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ " [هود : 88]

یعنی جن باتوں کی دعوت میں آپ لوگوں کو دیتا ہوں، خود بھی اس پر کار بند رہتا ہوں، یہ تو محض ایک مثال ہی ہے ورنہ تو انبیاء کرام ؑ کا یہی طریق کار رہا ہے کہ وہ لوگوں کو صرف اپنی زبان سے ہی دعوت نہیں دیتے تھے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے کردار واعمال سے بھی لوگوں کو دین حق کی طرف بلاتے تھے۔

انسانی نفسیات کے لحاظ سے بعض اوقات یہ طریق کار زیادہ مفید اور کار گر ثابت ہوتا ہے اور بہت سی جگہوں پر یہ اندازِ دعوت زبانی دعوت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں جہاں مکہ مکرمہ کے اندر اسلام کا سورج طلوع ہوا اور مشرکین کی طرف سے اسلام قبول کرنے پر اور اس کی تبلیغ و تلقین کرنے پر طرح طرح کے مصائب و مظالم کے طلسم توڑے جانے لگے وہاں زبانی دعوت دینا گو مشکل تھا لیکن مسلمان عملی لحاظ سے داعی تھے وہ تجارت و معاشرت اور صناعت و حرفت ہر باب میں اپنے صاف کردار کے ذریعہ داعی بن کر رہتے تھے، یہ دعوت بہت کار گر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی، جس کی برکت سے اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ نے احرام کھولنے کا ارادہ فرمایا تو اس وقت ایک تو زبانی طور پر اس کا اعلان فرمایا اور ساتھ عملی طور پر بھی آپ ﷺ نے اپنا احرام کھولا، لیکن پہلی بات کی بنسبت یہ دوسرا اقدام زیادہ مؤثر ثابت ہوا، حضرات

صحابہ کرام ﷺ نے آپ کی دیکھا دیکھی اپنے احرام کھولے، یہ ایک عملی دعوت تھی جس نے اپنا اثر دکھایا۔

خاموش طریقہ دعوت

افریقہ وغیرہ بہت سے ممالک میں جہاں صحابہ کرام یا ان کے نقش بردار چلے گئے وہاں لوگ ان کے عمل وکردار کو دیکھ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو کر سچے مسلمان بنتے گئے اور یوں کفر وشرک جیسے منکرات کا خاتمہ ہوتا رہا، عملی دعوت کا یہ طریقہ کار اس زمانہ کے ساتھ خاص ہے نہ ہی کفار ومشرکین کے ساتھ مقید ہے بلکہ آج کے دور میں بھی مسلمانوں کے معاشرہ میں رائج بہت سے منکرات کا خاتمہ اس کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، یہ ایک خاموش طریقہ دعوت ہے جس سے بہت سے اصحابِ دعوت وعزیمت نے ماضی میں بہت سے فوائد وثمرات حاصل کئے ہیں آج بھی دینی درد ولگن رکھنے والے حضرات بہت کچھ دینی فوائد سمیٹ سکتے ہیں۔

اگر کچھ دینی فکر رکھنے والے افراد مل کر اخلاص ومتانت کے ساتھ ایسی کوئی ترتیب عمل میں لائیں کہ تمام شعبوں میں دینی احکام ومسائل کی پابندی کریں گے تو بہت سے لوگ ان کے عمل سے سبق سیکھنے اور پھر اس کو عملی طور پر کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا، مثلاً ہمارے برصغیر میں شادی وغمی کے موقع پر دسیوں رسوم وبدعات کا ارتکاب کیا جاتا رہتا ہے اگر کچھ افراد مل کر عزم واستقامت کے ساتھ یہ فکر جاری رکھیں کہ ہمارے ہاں جب بھی خوشی وغمی کا موقع ہوگا تو اس میں کوئی ناجائز رسم عمل میں نہیں لائیں گے بلکہ شرعی تعلیمات کے مطابق ہر کام انجام دیں گے تو اگر زبانی طور پر لوگوں کو اس بات کی دعوت نہ بھی دیں، لوگ خود بخود ان کو دیکھ کر بہت سے منکرات سے احتراز

کریں گے اور یوں رفتہ رفتہ کافی حد تک ناجائز رسوم و منکرات میں کمی واقع ہو جائے گی۔

عبرت آموز داستان

عبرت کے طور پر مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ قابلِ عبرت ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ آپ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مہتمم صاحبؒ کا معمول یہ تھا کہ مدرسہ کے چندہ میں جو زیورات آتے اُن کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کراتے تھے، بلکہ خود بہ نفسِ نفیس گھر آتے یا جاتے فروخت کر کے لایا کرتے۔ اور ہیرا نام کا ایک بہت بڑا صراف تھا، اُسی سے معاملہ ہمیشہ کیا کرتے تھے۔۔ جب طلائی زیور فروخت کرتے تو اوّل اُس صراف سے چاندی کے روپے قرض لیا کرتے اور اس سے خرید و فروخت کر کے پھر اُس کے روپے قرض کے واپس کر کے چلے آتے۔ وہ بہت غور سے دیکھا کرتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور جب چاندی کے زیور کی خرید و فروخت ہوتی تو اس سے پہلے اشرفیاں قرض لیا کرتے اور اس سے معاملہ کرنے کے بعد پھر واپس کر دیا کرتے۔ وہ پوچھتا مولانا صاحب! اس ہیر پھیر میں کیا فائدہ ہوا؟ بات تو ایک ہی رہی۔ تو حضرت مہتمم صاحبؒ اُس کو سمجھایا کرتے کہ ہمارے مذہب میں چاندی سونے کے فروخت کرنے میں خاص طریقہ ہے اور اُسے سمجھاتے۔ وہ صراف بھی بیع صرف کے مسئلوں میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ عام لوگوں کو تو نہیں مگر جب کوئی مولوی قسم کا آدمی اُس کے یہاں خرید و فروخت کے لے جاتا تو اوّل تو وہ صراف عام طریقہ سے بیچ دیتا اور جب وہ مولانا صاحب اُٹھتے تو وہ صراف کہتا مولانا صاحب! ذرا تشریف رکھئے، یہ جس طرح خریدا ہے یہ آپ کے مذہب میں ناجائز ہے۔ اکثر مولوی تو یہ لفظ سُن کر چکراتے، اور بعضے جو شیلے اُس کو کہتے کہ ہمارے مذہب سے ہم واقف ہیں یا تو بہت بڑھا تھا، وہ کہتا مولانا صاحب پہلے تشریف رکھئے، خفا نہ

ہوئے، پہلے میری بات سُن لیجئے۔ پھر اُسے سمجھاتا کہ آپ کے مذہب میں اس طرح جائز ہے تو وہ بھی سوچ میں پڑ جاتا، اس لئے کہ اس مسئلہ میں وہ مولوی صاحب جاہل ہوتے تھے اور وہ مشرک مسئلہ کا واقف تھا۔ منتہیٰ کے اعتبار سے تو بات ایک ہی رہتی، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کھجوروں کی طرح سے ذرا سے تغیر سے وہ ناجائز معاملہ جائز بن جاتا۔"[1]

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس عملی پابندی کی وجہ سے بازار میں "بیع صرف" کا باب کسی حد تک زندہ ہوگیا اور جو لوگ غیرہ دانستہ طور پر ناجائز معاملہ کرتے تھے، ان کو جائز طریقہ پر معاملہ کرنے کا موقع ہاتھ آگیا، اس طرح عملی پابندی کرنے کے بعد اگر داعی زبان سے کسی کو دعوت نہ دے تو بھی لوگ اس کا اثر ضرور لیتے ہیں اور یوں بہت سے شرعی احکام کو معاشرہ میں زندہ کیا جاسکتا ہے۔

٩٩٩

[1] اکابر علماء دیوبند اتباع سنت کی روشنی میں، ص ١٠

باب ہفتم

- بعض خاص خاص مواقع کے منکرات و معاصی
- مسجد میں رائج منکرات
- راستے اور بازاروں میں مروجہ چند منکرات

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق جو ضروری مباحث تھے، سابقہ صفحات میں اس کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی، یہاں بعض خاص خاص مواقع کے منکرات کے متعلق کچھ تفصیل ذکر کی جاتی ہے، ان سے مقصود نہ ہی زندگی کی تمام شعبوں کا احاطہ ہے اور نہ ہی ہونے والے تمام منکرات کا استیعاب، بلکہ خاص ان ہی منکرات کی نشاندہی کی جاتی ہے جو عام طور پر معمولِ زندگی بن چکے ہیں، اور عام لوگوں کے دلوں سے اس کا گناہ ہونا نکلتا جا رہا ہے۔

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا

مسجد کی بنیاد ذکرِ الٰہی اور عبادتِ خداوندی جیسے بلند مقاصد کیلئے رکھی جاتی ہے، مساجد میں یہی اُمور انجام دینے چاہئے، جن کاموں کیلئے مسجد کی بنیاد نہیں رکھی گئی یا جو کام ان مقاصد کے حصول کی راہ میں خلل انداز ہو ان سے منع فرمایا گیا ہے، نبی کریم ﷺ کسی کو مسجد میں ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو منع کرتے ہوئے یہی حکمت بیان فرمائی کہ:

"إن هذه المساجد لم تبن لهذا۔"

"ان مساجد کی بنیاد اس کام کیلئے نہیں رکھی گئی۔"

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا ان ہی اُمور میں داخل ہے جن سے احادیث مبارکہ میں منع فرمایا گیا، امام حاکم نیشابوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستدرک میں یہ روایت نقل فرمائی کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"يأتي على الناس زمان يتحلقون في مساجدهم وليس

همتهم إلا الدنيا ليس لله فيهم حاجة فلا تجالسوهم۔ "

"ایسازمانہ آئیگاکہ لوگ مسجدوں میں حلقے لگائیں گے، انکامقصد صرف دنیاہی ہوگی ، اللہ تعالیٰ کوان کی کوئی ضرورت نہیں ہے،پس ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔"[1]

علامہ ابوسعید خادمی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"ابن علوان شافعی کی کتاب "أسنى المقاصد" میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کیامیں تم کوایسے لوگ نہ دکھلاؤں جن کااسلام میں کوئی حصہ نہیں، نہ ان کاوضو ونماز قبول ہے نہ زکاۃ اورحج اورایمان، وہ اللہ تعالیٰ سے دور رکھے جائیں گے، پوچھا گیا :اے اللہ کے رسول وہ کون سے لوگ ہیں؟

حضور ﷺ نے فرمایا: یہ میری اُمت کے وہ افراد ہیں جو اذان سن کر تیاری کرنے لگتے ہیں وضوپوری کرکے مسجد آجاتے ہیں، اوردو چھوٹی رکعتیں پڑھ کر محراب کی طرف پشت کرکے دنیوی اُمور میں مشغول ہوجاتے ہیں، اللہ کی قسم: فرشتے ہمیشہ سے ان کو کہتے ہیں کہ :اے اللہ کے ناپسندیدہ شخص خاموش ہوجا، اے اللہ کے غضب والے خاموش ہوجا، اے اللہ کے دشمن: خاموش ہوجاؤ، تم پراللہ کی لعنت ہو، پس جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نمازان کے چہروں پر ماردی جاتی ہےاوروہ اس حال میں لوٹتے ہیں کہ اللہ ان سے ناراض ہوتا ہے۔۔ حضرت ابن عباس نے فرمایاکہ میں نے حضور ﷺ کو بارہا عرض

[1] ذكره الحاكم وقال بعد روايته: هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه، وأقره الذهبي، انظر المستدرك على الصحيحين للحاكم ،كتاب الرقاق،4 / 359

کیا کہ مسجد کے اندر بات کرنے میں رخصت دی جائے لیکن حضور ﷺ نے (ہر بار جواب میں) سختی ہی فرمائی۔"[1]

علامہ ابن النحاس شہید رحمۃ اللہ علیہ مسجد میں رائج منکرات کو تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومنها: جلوس الناس في المسجدلحديث الدنيا، وهو بدعة إذ المساجد بنيت لذكر الله تعالي و للصلاة ولنشر العلم و نحو ذلك، وعلي هذا يجتمع السلف الصالح في المسجد لا في التحدث بما يتعلق بأمور الدنيا۔"

"اوران منکرات میں سے ایک (منکر مسجد میں) لوگوں کا دنیا کی باتوں کیلئے بیٹھنا بھی ہے، یہ بدعت ہے کیونکہ مساجد اللہ تعالیٰ کی ذکر، نماز اور دینی علوم کی نشر واشاعت وغیرہ مقاصد کیلئے بنائی جاتی ہیں، مساجد میں سلف صالحین ان ہی اُمور کیلئے جمع ہوتے تھے دنیا کے متعلق بات چیت کرنے نہیں آتے تھے۔"[2]

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں ہے:

"الجلوس في المسجد للحديث لا يباح بالاتفاق؛ لأن

---

[1] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية، آفات اللسان، الأربعون كلام الدنيا فى المساجد، 3 / 269

[2] تنبيه الغافلين،الباب السابع في ذكرجمل من المنكرات، الفصل الأول، ص439

المسجد ما بني لأمور الدنيا، وفي خزانة الفقه ما يدل على أن الكلام المباح من حديث الدنيا في المسجد حرام.
"

"مسجد میں (دنیوی) باتوں کیلئے بیٹھ جانا بالاتفاق جائز نہیں، کیونکہ مسجد دنیوی اُمور کیلئے نہیں بنائی گئی، اور خزانہ الفقہ (علامہ سمرقندیؒ کی کتاب کا نام ہے) میں کچھ ایسا بھی لکھا ہے کہ دنیوی اُمور کے متعلق جائز باتیں مسجد میں حرام ہیں۔"[1]

ان چندروایات واقوال سے بخوبی اندازہ لگایاجاسکتاہے کہ مسجد کے اندر دنیا کی باتیں کرنے کا کتنا وبال ہے؟

ایک حدیث کی تحقیق

مسجد میں دنیااوراس کے متعلق باتوں کے بارے میں عام طورپر یہ ایک حدیث نقل کی جاتی ہے" الكلام المباح في المسجد يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب "یہ حدیث عوام وخواص میں اتنی مشہورہوگئی کہ بعض بڑے درجہ کے مصنفین نےاس کوبلاسنداپنی تصنیفات میں ذکرکیاہے اوراس سے استدلالات بھی کئے، لیکن سند کے اعتبارسے یہ حدیث درجہ صحت یاحسن تک بالکل نہیں پہنچتی۔

---

[1] الفتاوى الهندية ، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد،5 / 321

علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس حدیث کی کوئی اصل معلوم نہیں ہوئی، حضرت ملا علی قاریؒ نے فرمایا یہ حدیث موجود نہیں۔[1]

مسجد اور مدرسہ وغیرہ کے اشیاء کا ذاتی استعمال

مسجد وقف ہوتی ہے اور جو اشیاء مسجد کیلئے دی جاتی ہے وہ مسجد کی ملکیت ہو جاتی ہے جس کو فقہاءِ کرام مملوک مسجد اور مملوکِ وقف سے تعبیر فرماتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ خود مسجد ہو یا مملوک مسجد، دونوں کو مسجد ہی کے مصالح و منافع میں استعمال کیا جاسکتا ہے، مسجد کے مقاصد واغراض سے ہٹ کر اپنے ذاتی مفاد میں مسجد کی زمین، رقبہ یا اس کے منقولی اشیاء کا استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں۔

مساجد کے پانی، بجلی، دری، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کسی بھی چیز کے استعمال کرنے کیلئے تین شرائط ہیں:

۱۔ مسجد کے اندر استعمال کی جائے۔

۲۔ فضول دنیوی گپ شپ وغیرہ اُمور کیلئے ان چیزوں کو استعمال میں نہ لایا جائے، کیونکہ جیساکہ پہلے تحریر کیا گیا مسجد کے اندر ایسا کرنا شرعاً گناہ ہے تو اس کیلئے مسجد کی بجلی وغیرہ اشیاء کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ جتنے استعمال کی ضرورت یا فائدہ ہو اتنا ہی استعمال کیا جائے، ضرورت سے زائد استعمال کرنا چونکہ بلا فائدہ اور اسراف ہے، اسلئے ایسا کرنا جائز نہیں۔

---

[1] المغني عن حمل الأسفار للعراقی، 1 / 180 وکشف الخفاء، 1 / 354

ہمارے ہاں ان تینوں شرائط کی رعایت نہیں رکھی جاتی، لوگ مسجد کی چیزیں باہر لے جاکر استعمال کرتے ہیں، بلکہ بعض دیہاتوں میں تو یہاں تک مشاہدہ ہوا کہ مسجد کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگ مسجد ہی کی اشیاء پر زندگی بسر کرتے ہیں، ولیمہ، پروگرام اور خوشی کے دیگر مواقع میں تو اکثر جگہ مسجد ہی کے اشیاء کام آتے ہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الإسعاف فی أحکام الأوقاف" میں ہے:

"ولیس لمتولي المسجد أن یحمل سراج المسجد إلی بیته۔"[1]

"مسجد کے متولی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ مسجد کا چراغ گھر لیجا(کر استعمال) کرے۔"

مسجد کے اندر جو چیز دی جاتی ہے وہ مسجد کے مصالح میں استعمال کرنا ضروری ہے، مسجد کے علاوہ دیگر اُمور میں یہ اشیاء استعمال کرنا بالکل جائز نہیں، بلکہ فقہاءِ کرام نے یہاں تک لکھاہیں کہ اگر کوئی طالب علم مسجد کے چراغ سے دینی کتب کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کیلئے مستقل طور پر چراغ جلانا درست نہیں، الا یہ کوئی ایسا وقت ہو جس میں نماز وغیرہ اُمور کیلئے چراغ خود بخود روشن کیا جاتا ہو تو اس کی روشنی میں مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے علاوہ اوقات میں خاص مطالعہ کیلئے مسجد کے تیل سے چراغ جلانا درست نہیں۔

---

[1] الإسعاف فی أحکام الأوقاف، باب بناء المساجد والربط والسقایات والدور، 1/ 78

چنانچہ اسی کتاب "الإسعاف فی أحکام الأوقاف" میں تحریر ہے:

"ويجوز الدرس بسراج المسجد إن كان موضوعا فيه للصلاة وإن كان موضوعا فيه لا للصلاة بأن فرغ القوم من الصلاة وذهبوا إلى بيوتهم وبقي السراج فيه قالوا لا بأس بأن يدرس بنوره إلى ثلث الليل لأنهم لو أخروا الصلاة إلى ثلث الليل لا بأس به فلا يبطل حقه بتعجيلهم وفيما زاد على الثلث ليس لهم تأخيرها فلا يكون له حق الدرس۔"[1]

"مسجد میں اگر نماز کیلئے چراغ رکھا گیا ہو تو اس کی روشنی میں درس کرنا جائز ہے، اور اگر نماز کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے رکھا گیا ہو مثلاً پوری قوم نماز سے فارغ ہو چکی ہو اور چراغ جل رہا ہو تو ایسی صورت میں رات کے تین تہائی تک اس کی روشنی کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اگر وہ نماز کو اس وقت تک مؤخر کرتے تو بھی درست تھا تو جلدی پڑھنے سے ان کا حق ختم نہیں ہو گا، اور تین تہائی کے بعد تک نماز کو مؤخر کرنا چونکہ شرعاً جائز نہیں، اسلئے اس دورانِ درس کرنے کا بھی اختیار نہیں۔"

غور کرنے کی بات ہے کہ دینی کتابوں کا درس و مطالعہ یقیناً ایک عبادت اور کارِ ثواب ہے، لیکن فقہاء کرام اس کیلئے بھی مستقل طور پر مسجد کے چراغ جلانے اور بجلی

[1] الإسعاف فی أحكام الأوقاف ، باب بناء المساجد والربط والسقايات والدور في الثغور،1 / 78

استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے، تو مسجد کے اندر بے فائدہ گپ شپ اور غیر مفید یا ناجائز اُمور میں مشغولیت کیلئے کیسے اجازت دی جاسکتی ہے؟ جبکہ مسجد کے اندر دنیوی جائز گفتگو کیلئے بیٹھنا بھی درست نہیں جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا۔

جب ایک جائز اور عظیم عبادت کیلئے مسجد کے گیس بجلی وغیرہ کا استعمال درست نہیں تو جن اُمور کی شریعت کی طرف سے مسجد کے اندر اجازت ہی نہیں بلکہ مسجد کو اس سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ایسے اُمور کیلئے اشیاء مسجد کا استعمال کیونکر درست قرار دیا جاسکتا ہے!

مسجد کی اشیاء ضرورت کے موافق ہی استعمال کی جاسکتی ہیں، ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا درست نہیں کیونکہ یہ واقف کے منشا کے خلاف ہے، فقہاء کرام نے یہاں تک تحریر فرمایا ہیں کہ وضوء میں جن اعضاء کو جتنی بار دھونے کا حکم ہے اتنے ہی بار دھونا چاہیئے، اس سے زیادہ نہیں دھونا چاہیئے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ بار دھونے کو سنت سمجھ کر کرنا شروع کرے تو یہ بالکل ناجائز ہے، اسی طرح مساجد و مدارس کا پانی چونکہ شرعی وضو اور غسل کیلئے مہیا کیا جاتا ہے، اسلئے اس سے شرعی وضو اور غسل ہی کیا جاسکتا ہے، اس سے زائد استعمال درست نہیں ہوگا۔

علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"الإسراف في صب الماء" الإسراف العمل فوق الحاجة الشرعية، في فتاوي الحجة يكره صب الماء في الوضوء زيادة على العدد المسنون والقدر المعهود لما ورد في الخبر شرار أمتي الذين يسرفون في صب

الماء اهـ وفي الدر ويكره الإسراف فيه تحريما لو بماء النهر أو المملوك له أما الموقوف على من يتطهر به ومنه ماء المدارس فحرام اهـ. "

"اسراف شرعی ضرورت سے زیادہ عمل کرنے (یعنی کوئی چیز استعمال کرنے) کا نام ہے، فتاویٰ الحجہ نامی کتاب میں ہے کہ وضوء کے دوران مسنون اور معہود مقدار سے زیادہ پانی بہانا مکروہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ میری اُمت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو پانی بہانے میں اسراف کرتے ہیں، اور درمختار میں ہے کہ اگر بہتے نہر یا اپنے ذاتی پانی سے وضوء کیا جائے تو اس میں اسراف مکروہ تحریمی ہے اور طہارت کیلئے وقف شدہ پانی استعمال کرنے میں اسراف کرنا حرام ہے، مدارس کے پانی کا بھی یہی حکم ہے۔"[1]

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب تین کے بجائے چار بار اعضاء وضو دھونا درست نہ ہو وہاں فضول استعمال کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

واضح رہے کہ پانی کی بات صرف بطور مثال لکھی گئی ورنہ مسجد و مدرسہ بلکہ تمام اوقاف کا یہی حکم ہے کہ جو اشیاء جن مقاصد کیلئے وقف کئے جاتے ہیں یا وقف کو مالکانہ طور پر دئے جاتے ہیں، ان سب کا یہی حکم ہے کہ واقف کے مقررہ (جائز) اُصول و شرائط کے مطابق بقدرِ ضرورت ہی استعمال کرنا درست ہوگا، واقف کی شرائط کے برخلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اسی طرح جتنا استعمال

---

[1] حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،كتاب الطهارة،فصل فى المكروهات، 80/1

کرنا ضروری ہو اتنا ہی استعمال کرے اس سے زیادہ ہر گز استعمال نہ کرے۔

علامہ ابو بکر بن علی الحدادی الحنفی (المتوفی ۸۰۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"لو وقف على دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه لجميع الليل بل بقدر حاجة المصلين ويجوز إلى ثلث الليل أو نصفه إذا احتيج إليه للصلاة فيه وهل يجوز أن يدرس الكتاب على سراج المسجد ينظر إن كان وضع لأجل الصلاة فلا بأس بذلك إلى أن يفرغوا من الصلاة. "

"اگر مسجد کے چراغ کیلئے کوئی وقف کرے تو پوری رات اس کو جلائے رکھنا جائز نہیں، بلکہ نمازیوں کی ضرورت کے بقدر جلایا جائے، تہائی یا آدھی رات تک اگر روشنی میں نماز پڑھنے کی ضرورت ہو تو بھی جلانا درست ہے، کیا مسجد کے چراغ کی روشنی میں (کوئی دینی) کتاب پڑھا پڑھایا جاسکتا ہے؟

تو اس میں یہ تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی کے نماز پڑھنے کیلئے چراغ جلایا گیا ہے تو ان کے فارغ ہونے تک (اس کا) کتاب پڑھنا بھی درست ہے (لیکن مستقلاً کتاب پڑھنے کیلئے ہی جلانا درست نہیں۔)"[1]

مال وقف کے استعمال میں ہماری کوتاہیاں

ہمارے ہاں مساجد و مدارس بلکہ تمام اوقاف کا یہ حال ہے کہ لوگ دھڑا دھڑ ان کی اشیاء استعمال کرتے ہیں، اس میں ضرورت کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ اگر ایک

---

[1] الجوهرة النيرة على مختصر القدوري،كتاب الوقف،ج1/ 338

پنکھے سے ضرورت پوری ہوسکتی ہے تو دو تین پنکھے مزید استعمال کئے جاتے ہیں ، یہ رویہ بالکل ناجائز اور انتہائی خطرناک ہے کیونکہ ایک تو ضرورت سے زیادہ استعمال ہے جس کو اسراف کہا جاتاہے جو کہ ناجائزاور گناہ ہے۔

اور دوسری خطرناک بات یہ ہے کہ یہ اسراف بھی کسی ایک فرد کے مال میں نہیں کہ جس سے معافی تلافی کرکے آخرت کا معاملہ سدھار لیا جائے بلکہ او قاف عموماً بے شمار مسلمانوں کا حق ہوتا ہے اسلئے ان جیسے اموال میں اسراف کرناان تمام مسلمانوں کی حق تلفی کے مترادف ہے جس سے معافی و تلافی بھی عملاًانتہائی مشکل ہے، اسلئے اس سے بچنے کااہتمام کرناضروری ہے۔

دیوار مسجد کی چوما چمٹی

بعض جگہوں میں یہ رواج بھی چل پڑاہے کہ مسجد کے سامنے گزرتے وقت اسکے درو دیوار کو ضرور چوماجائے، مرد ہویاعورت، ہروقت مسجد کے دیوار سے گزرتے وقت ایسا کرتے ہیں اوراس کو کارثواب سمجھتے ہیں، یہ خیال درست نہیں،اس تصور کے ساتھ مسجداوراس درودیوار کوچومنااوراس کااتنااہتمام کرنابالکل درست نہیں،اس سے احتراز کرناچاہئے۔

بعض لوگ محض مسجد کی احترام و تعظیم کیلئے ایسا کرتے ہیں، لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کیونکہ تعظیم کا اصل طریقہ وہی ہے جو حضور ﷺ نے ہمیں اپنے قول و فعل سے سکھایا اور سمجھایاہے،اوروہ یہ ہے کہ مساجد کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذکر وعبادت کی جائے، خشوع وخضوع سے بھرے ہوئے اعمال، کامل سپردگی اور مکمل بندگی سے اس کو معمورومنوررکھا جائے۔

علامہ ابن الحاج المالکی (المتوفی ۷۳۷ھ) رحمۃ اللہ علیہ اس تصور کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ولأجل ذلك كره علماؤنا رحمة الله عليهم التمسح بجدار الكعبة، أو بجدران المسجد، أو بالمصحف إلى غير ذلك مما يتبرك به سدا لهذا الباب ولمخالفة السنة؛ لأن صفة التعظيم موقوفة عليه - ﷺ -، فكل ما عظمه رسول الله - ﷺ - نعظمه ونتبعه فيه، فتعظيم المصحف قراءته، والعمل بما فيه لا تقبيله ولا القيام إليه كما يفعل بعضهم في هذا الزمان، وكذلك المسجد تعظيمه الصلاة فيه لا التمسح بجدرانه."[1]

"اور اسی وجہ سے اس رواج کو بند کرنے کیلئے اور سنت کی مخالفت کی وجہ سے ہمارے علماء نے کعبہ اور مسجد کے در و دیوار اور مصحف وغیرہ کے چھونے اور چومنے کو مکروہ جانا ہے، کیونکہ تعظیم حضور ﷺ (کے تعلیمات) پر موقوف ہے جس چیز کی حضور ﷺ نے تعظیم فرمائی ہم آپ کی اتباع میں اس کی تعظیم کریں گے، لہٰذا قرآن کی تعظیم اس کی تلاوت کرنی اور اس کے احکامات پر عمل کرنا ہے نہ کہ اس کا چومنا اور اس کی طرف کھڑا ہونا جیسا کہ آجکل بعض لوگ کرتے ہیں، اسی طرح مسجد کی تعظیم اس میں نماز (وعبادت) کرنا ہے نہ کہ اس کے دیواروں کو چومنا۔"

---

[1] المدخل لابن الحاج، فصل زيارة سيد الأولين والآخرين، 263/1

مساجد میں منکرات پر نکیر نہ کرنا

مساجد کے اندر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا ضروری ہے، دورِ حاضر میں عام طور پر خاموشی اور دوسرے سے تعرض نہ کرنے کا فلسفہ اپنایا جا رہا ہے، دنیوی اُمور اور بے فائدہ مشاغل کی حد تک تو یہ جذبہ قابل ستائش ہے البتہ جہاں کسی کے منکرات و معاصی کے متعلق تعرض نہ کرنے کا تعلق ہے تو یہ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے نقصان دہ اور ناقابل برداشت اقدام ہے، اگر تمام لوگ یہی رویہ اپنائیں تو معاشرہ معاصی و منکرات کا سرچشمہ بن جائیگا۔

منکرات کے سیلِ رواں کے مقابلے میں اگر ایک بھی بندہ خدا ایسا نہ ہو کہ جو صالح معاشرہ اور معصوم نسل کو اس کے تند و تیز موجوں میں غرق یابی سے بچانے کی خاطر پل باندھے، تو انجام کار چند ہی لمحوں میں معاشرہ وہ خطرناک اور افسوسناک منظر نامہ پیش کرے گا جس کا آج بعض ملکوں میں مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ شکل و صورت میں بنی آدم کا قوم و وطن نظر آ رہا ہوتا ہے، لیکن صفات و اخلاق کو دیکھنے سے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں آدم کے بیٹوں کا معاشرہ ہے یا خنازیر و کلاب کا اجتماع؟

ماحول کی آلودگی کا ایک بنیادی سبب

انسانیت ترقی اور مادر پدر آزادی کے نام پر وہ حیاء سوز کرتوت کر چکی ہے جس کے سامنے جانوروں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے، بنی آدم غیرت و حمیت، شرم و حیاء اور عزت نفس کے حدود پامال کر کے اتنے دور جا پہنچے کہ جہاں اس سے پہلے کوئی پہنچا تھا نہ ہی پہنچنے کا گمان تھا، معاشرے کی یہ ساری روش اور ماحول کا سارا تعفن اسی فرضِ منصبی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ترک کرنے اور اس میں غفلت و کوتاہی برتنے

کا بھیانک انجام ہے۔

اگر باہر معاشرے میں اس حوالے سے کچھ عناصر کی بنیاد پر کمی یا کوتاہی ہو تو شاید اس کو برداشت کرنے کیلئے کوئی عذر تراشا جاسکے لیکن مساجد و مدارس تو دین کے مراکز اور اسلام کے قلعے ہیں وہاں تو اس میں کسی طرح کمی و کوتاہی قابل برداشت نہیں ہونی چاہئے۔

حضور ﷺ کی عادت مبارکہ

حضور ﷺ کی عادتِ مبارکہ بھی یہی تھی کہ ویسے تو ہر جگہ اور ہر وقت آپ ﷺ احکام الٰہی کا عملی مظہر، قرآن کی چلتی پھرتی صورت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا واقعہ نمونہ تھے، اسی لئے آپ ﷺ کے سکوت و تقریر کو مستقل حجت کی حیثیت حاصل ہے کہ کسی منکر پر آپ ﷺ کا خاموش رہنا ممکن نہیں تھا، اس لیے خاموشی دلیل جواز ہے، لیکن مساجد میں خاص کر آپ ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔

صحیح بخاری وغیرہ کتبِ حدیث میں مشہور واقعہ موجود ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی (علی صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ) کے اندر آیا اور نماز پڑھ کر حضور ﷺ کے دربار میں سلامی لیکر حاضر ہوا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا" ارجع فصل، فإنك لم تصل" (واپس جاکر نماز پڑھو کیونکہ آپ نے نماز نہیں پڑھی) اس نے فرمانِ نبوی پر عمل کرنے کیلئے دوبارہ نماز پڑھی اور پہلے کی طرح حاضر ہوا، آپ ﷺ نے دوبارہ وہی کچھ ارشاد فرمایا، جس پر اس نے پھر عمل کیا، اسی طرح تین بار ہوجانے کے بعد اس کی درخواست پر حضور ﷺ نے نماز کا پورا طریقہ سمجھایا جس سے اعرابی کی غلطی بھی واضح ہوگئی، یہ بھی نہی المنکر کا بہترین انداز اور نہایت

مؤثر اسلوب تھا۔

اسی طرح ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث میں ایک اعرابی کا وہ واقعہ بھی معروف ہی ہے کہ وہ آکر مسجد کے اندر پیشاب کرنے لگا، حضور ﷺ نے پیشاب کر چکنے کے بعد بلایا اور مسجد کی حیثیت و مقام سمجھایا جس سے آئندہ کیلئے اس طرح کام کرنے کی شناعت ظاہر ہوئی۔

باجماعت نماز پڑھنے کیلئے صفوں کو سیدھا کرنے کا بھی شریعت میں حکم دیا گیا، عام طور پر اس میں کوتاہی آجاتی ہے حضور ﷺ اس کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے اور صفوں کو بالکل سیدھا اور برابر کیا کرتے تھے، جہاں کہیں خلل یا ٹیڑھاپن دیکھتے تو تنبیہ فرما کر سیدھا کرا لیتے کیونکہ یہ ایک منکر تھا جس کو ختم کرنا ضروری تھا۔

حضور ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء راشدین (بسم اللہ الرحمن الرحیم) کا بھی یہی طریقہ رہا کہ وہ نماز پڑھتے وقت صف سیدھا کرنے کا خصوصی انتظام وانصرام فرماتے

حضور ﷺ کے اس مبارک سنت کو مد نظر رکھ کر مساجد میں اس کا خصوصی انتظام کرنا ضروری ہے، خصوصاً ائمہ مساجد وغیرہ حضرات کو تو اس کا انتہائی اہتمام کرنا چاہئے۔

ناجائز فیصلوں کے لئے مسجد کا استعمال

دینِ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ دیگر ادیان ومذاہب کی طرح کچھ مخصوص پوجا پاٹ کا مجموعہ ہی نہیں، بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات اور کامل دستورِ زندگی ہے، انسان کے تمام احوال، اقوال اور افعال کے احکامات اس میں موجود ہیں جس کا حضرتِ انسان کو مکلف بنا دیا گیا، اور مسلمان کو صرف ظاہری عبادات ہی کا حکم نہیں دیا،

بلکہ اپنے باہمی نزاعات اور اختلافات کا فیصلہ کرنے کیلئے بھی شریعت نے کچھ اُصول و حدود مقرر فرمائے جس کا اس کو مکلف بنایا گیا کہ اپنے باہمی تنازعات اور درمیانی رنجشوں کو شریعت اسلام ہی کی روشنی میں حل کرنا ضروری ہے، قانونِ الٰہی کے علاوہ دیگر آئین وقوانین پر فیصلہ کرنے کو قرآن کریم میں بالترتیب کافر، فاسق اور ظالم کہا گیا۔

اسلئے شریعتِ اسلام کے بالمقابل دیگر بنیادوں (مثلاً خلاف اسلام قانون، علاقائی رسم رواج) کے مطابق فیصلہ کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے جس سے مسلمان کو بچنا نہایت ضروری ہے، ہمارے ہاں اس قسم کے جرگے اور فیصلے مساجد میں منعقد کئے جاتے ہیں جو بالکل ہی غلط، سخت ناجائز اور احکام شرعیہ کے مقابلہ میں نہایت جرأت کے مترادف ہے۔

مسجد میں بیٹھ کر قرآن کریم کی آغوش میں آکر اس کے خلاف فیصلے کرنا موجودہ اصطلاح میں اس کو "چیلنج" کرنے کے مترادف ہے جو ایک مسلمان کی شان سے انتہائی بعید ہے، اسلئے اس سے بھی احتراز کرنا ضروری ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۷۴ھ) نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل فرمائی کہ:

"عن ابن عباس،قوله:{ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون} قال: من جحد ما أنزل الله فقد كفر. ومن أقر به ولم يحكم فهو ظالم فاسق. "

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے احکامات کا انکار کرے وہ یقیناً کافر ہے

اور جو کوئی اس کو مانتا تو ہے لیکن اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ ظالم اور فاسق ہے۔"[1]

بلکہ چند آیات کے بعد آپ نے دوبارہ اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی اور آیت کریمہ "أفحكم الجاهلية يبغون" کی تفسیر میں بڑی جوش وجذبے کے ساتھ تحریر فرمایا کہ قرآن وسنت کے قوانین کے مقابلے میں اس طرح قواعد وضوابط مقرر کرنا کہ فیصلے ہمیشہ اپنے خود ساختہ قواعد ہی کے مطابق ہو، اور قرآن وسنت کے مقابلے میں اپنے قوانین کو ترجیح دی جائے، یہ کفر ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدۃ، رقم الآیہ: ۵۰)۔

مسجد میں مختلف قسم کے اعلانات کرنا

مسجد کا بنیادی مقصد ذکر وعبادت ہے کئی ایک روایات میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا، لہٰذا جو چیز اس مقصد کے حصول کی راہ میں حائل یا مخل ہو وہ مسجد میں کرنا درست نہیں، اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرنے میں چونکہ بجلی کا بھی استعمال ہے گو تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو جب کہ مسجد کی بجلی مسجد ہی کے مصالح میں استعمال کی جاسکتی ہے، اسلئے دنیوی اغراض و مقاصد کیلئے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرنا دنیوی بات کرنے کے علاوہ مسجد کے بجلی کا غلط استعمال بھی ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔

اعلانات کے سلسلہ میں اسی اُصول کو مدنظر رکھ لینا چاہیئے، جو اعلان ان دو اُصول پر منطبق ہوتا ہو وہ درست ہوگا، اور جو اعلان ان سے متصادم ہو وہ درست نہیں۔

---

[1] تفسير ابن كثير، سورة المائدة، رقم الآية:44

واضح رہے کہ یہاں ان اُمور کے اعلان کی بات ہو رہی ہے جو فی نفسہ جائز ہے، جو کام خود خلاف شرع ہو ان کا اعلان کرنا تو بالکل جائز نہیں، خواہ مسجد کے اندر ہو یا باہر، کیونکہ ناجائز اُمور کا اعلان درحقیقت اس کی دعوت دینا اور اس برائی کو معاشرے کے اندر جگہ اور اہمیت دینا ہے جو کہ بالکل ناجائز ہے، لہٰذا جن علاقوں میں التزام و پابندی کے ساتھ تیجہ، چالیسواں وغیرہ رسومات ہوتی ہیں وہاں ان اُمور کا اعلان کرنا بالکل ناجائز ہے، خصوصاً مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کو اس کیلئے استعمال کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔

مسجد کے اندر گم شدہ اشیاء کے اعلان کا حکم

مسجد کے اندر گمشدہ چیز کے اعلان کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" إذا رأيتم من يبيع أو يبتاع في المسجد، فقولوا: لا أربح الله تجارتك، وإذا رأيتم من ينشد فيه ضالة، فقولوا: لا رد الله عليك"

"حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مسجد میں خرید و فروخت کرتا ہے تو کہو اللہ تیری تجارت کو نفع بخش نہ بنائے اور جب کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرتے دیکھو تو کہو کہ اللہ تمہاری چیز واپس نہ لوٹائے۔"[1]

[1] سنن الترمذي ، أبواب البيوع، باب النهي عن البيع في المسجد، 3 /

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کے اندر گمشدہ اشیاء کا اعلان کرنا شرعاً درست نہیں، لاؤڈ اسپیکر پر ہو یا اس کے بغیر۔

البتہ یہ مسئلہ قابلِ تحقیق ہے کہ اگر مسجد ہی کے اندر کوئی چیز گم ہو جائے یا مسجد ہی کے اندر کوئی چیز پائی جائے تو کیا اس کا اعلان مسجد میں کیا جا سکتا ہے یا یہ بھی اس حدیث میں داخل ہے؟

بعض حضرات کے نزدیک یہ دونوں صورتیں مندرجہ بالا حدیث کے حکم سے مستثنی ہیں، اور ان صورتوں میں مسجد کے اندر بھی اعلان کیا جا سکتا ہے بعض روایات سے اس کی بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لیکن راجح اور بہتر یہی ہے کہ ان صورتوں میں بھی حدودِ مسجد کے اندر اعلان نہ کی جائے بلکہ وضوء خانہ یا مسجد کے دروازے وغیرہ پر کی جائے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے، اس حوالے سے حدیثی اور فقہی روایات تفصیلاً جمع کرنے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "نصوص بالا سے پہلی اور دوسری صورت (یعنی مسجد سے باہر گم ہوئی ہو یا مسجد کے باہر ملی ہو) کا عدم جواز واضح ہے، تیسری اور چوتھی صورت (یعنی مسجد میں گم ہوئی ہو یا مسجد میں ملی ہو) کا کوئی حتمی فیصلہ نظر سے نہیں گذرا، مراجعہ کتب اور حضور اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تعلیل "إن المساجد لم تبن لهذا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا اعلان بھی مسجد کے دروازے پر کیا

جائے۔"

عبارات بالا میں سے جن میں اسواق و مجامع کے ساتھ مساجد کا ذکر ہے ان سے جواز کا شبہ ہو سکتا ہے لیکن یہ بوجوہِ ذیل صحیح نہیں:

ا۔ یہ ممانعت کی دوسری عام تصریحات کے خلاف ہے۔

۲۔ بعض نے خود اس سے ابواب مساجد مراد ہونے کی تصریح فرمادی ہے جیساکہ " طحطاوی علی الدر" اور" أوجز المسالک" میں ہے۔

۳۔ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے "توضیح" سے اس کی توجیہ یہ نقل فرمائی ہے کہ یہ عبارات حذف مضاف پر محمول ہیں اور اس سے ابواب مساجد ہی مراد ہیں۔"[1]

حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں ہے:

"کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں: کہ مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دنیوی اُمور مثلاً فلاں جانور، رقم وغیرہ گم ہو گیا ہے، کیا اس قسم کے اعلانات مسجد لاؤڈ اسپیکر میں جائز ہے؟

الجواب: چونکہ مسجد ان اُمور کیلئے نہیں بنائی گئی ہے، لہٰذا اس قسم کے اعلانات سے احتراز ضروری ہے۔"[2]

واضح رہے کہ یہ ممانعت اعلان کرنے کا ہے، انفرادی پوچھ گچھ کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ اسی عبارت کے بعد حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] أحسن الفتاویٰ، کتاب الوقف، باب المساجد، ج ٦ ص ٤٨٣

[2] فتاوی فریدیة، کتاب الوقف، باب أحکام المساجد٦ /٣٥٤

"البتہ بدون اعلان انفراداً لوگوں سے پوچھنا یا وجدان لقطہ کی اطلاع دینا بلاشبہ جائز ہے، كما مر عن مواهب الجليل نص الإمام مالك رحمه الله و كذا عن شرح القسطلاني۔"

جنازہ کا اعلان مسجد میں

نمازِ جنازہ چونکہ ایک عبادت ہے اور میت کی غسل وتجہیز وغیرہ اُمور مسلمانوں کے ذمہ میت کے حقوق میں سے ہیں، اس بنیاد پر یہ محض دنیاوی کام ہی نہیں بلکہ ایک دینی، مذہبی اور انسانی تقاضا ہے، اسلئے نمازیوں کی اطلاع کیلئے اس مقصد کیلئے مسجد کا لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مسجد کے دروازے یا دیوار پر دنیوی اشتہار لگانا

عصرِ حاضر میں یہ منکر بھی وبا کی طرح عام ہے، دیندار اور غیر دیندار سب لوگ اس میں مبتلا ہیں، مساجد کے درودیوار بھی اشتہارات کی نحوست سے پاک نہ رہ سکے، بلکہ خانہ خدا کے مقدس چاردیواری پر بھی یہ طوفان بدتمیزی جاری ہے، اپنے ذاتی مکانات پر اشتہار بازی کو لوگ برا خیال کرتے اور منع کرتے ہیں لیکن مسجد کی صفائی و ستھرائی اور طہارت و نظافت کا جذبہ کم ہوتا چلا جارہا ہے۔

مسجد کے درودیوار پر اشتہارات لگانا شرعاً جائز نہیں، اس کی بنیادی وجہ ایک تو وہی ہے کہ مسجد کے درودیوار مسجد ہی کا حصہ ہے جو اسی کے مصالح کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اشتہار لگانے والے اس کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کررہا ہے جب کہ مسجد اور اس کے متعلقات کا ذاتی استعمال شرعاً جائز نہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الاشباہ والنظائر" میں ہے:

"ولا تجوز إعارة أدواته لمسجد آخر ولا يشغل المسجد بالمتاع إلا للخوف في الفتنة العامة۔"

"ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد کو عاریت پر منتقل کرنا جائز نہیں، اور مسجد کو سامان سے مشغول نہ رکھا جائے مگر کسی عام فتنہ وفساد کے وقت (سامان ضائع ہونے کا) خطرہ ہو۔"[1]

مساجد پر اشتہار نہ لگانے کی دوسری بڑی وجہ مساجد کی تعظیم واحترام اور اس کے صفائی وستھرائی کا اہتمام ہے، احادیثِ مبارکہ میں مسجد صاف کرنے کے بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں، ایک حدیث مبارک میں اس کو" مهور الحور العين"(یعنی جنت کی حوروں کا مہر) قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ جب شریعت کو مسجد کے صاف رکھنے کا اتنا اہتمام ہے تو مسجد گندا کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

عہد رسالت میں جب اس قسم کے بعض واقعات پیش آئیں تو حضور ﷺ نے بڑی مختصر اور جامع ہدایات ارشاد فرمائی کہ "إن المساجدلم تبن لهذا"، پس اس حدیث کے منشا ومقصد کی روشنی میں اشتہار لگانے کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مساجد کی بنیاد ان اُمور کیلئے نہیں رکھی جاتی، مساجد عبادت گاہ ہے اعلان گاہ نہیں، اعلان واشتہار مقاصدِ مسجد کے یقیناً خلاف ہے، اسلئے مسجد کے اندر وباہر اشتہارات لگانا شرعاً درست نہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"جواب: مسجد کے دروازوں اور دیواروں پر اشتہار لگانا چپکانا دو وجہ سے ناجائز ہے، ایک یہ کہ مسجد کی دیوار کا استعمال ذاتی مقصد کیلئے حرام ہے ،

[1] الأشباه والنظائر لابن نجيم،الفن الثالث،قبيل الخاتمة،1 / 321

چنانچہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ مسجد کے ہمسائے کیلئے یہ جائز نہیں کہ مسجد کی دیوار پر اپنے مکان کا شہتیر یا کڑی رکھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مساجد کی تعظیم اور صفائی کا حکم دیا گیا ہے، اور مسجد کی دیوار پر اشتہار لگانا اس کی بے ادبی بھی ہے اور اس کو گندا کرنا بھی، کیا کوئی شخص گورنر ہاؤس کے دروازے پر اشتہار لگانے کی جرأت کر سکے گا؟ اور اس کو اس کی اجازت دی جائے گی؟ اور کیا اپنے مکان کے در و دیوار پر مختلف النوع اشتہار لگائے جانے کو پسند کرے گا؟ کیا مسلمانوں کی نظر میں اللہ کے گھر کی عظمت اپنے گھر کے برابر بھی نہیں رہی؟

افسوس ہے کہ مسجد کے در و دیوار پر اشتہار لگانے کی وبا عام ہو رہی ہے، نہ تو اشتہار لگانے والوں کو خانہ خدا کا احترام مانع ہوتا ہے اور نہ ہی علماء کرام اس پر متنبہ فرماتے ہیں۔ یاد رہنا چاہیئے کہ خانہ خدا کی آبادی شہر اور محلے کی آبادی کا ذریعہ ہے اور خانہ خدا کی ویرانی ہمارے محلوں اور شہروں کی ویرانی و بربادی کا سبب ہے۔" [1]

٩٩٩

[1] آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج۳ ص۲۶۵

راستوں اور بازاروں کے کچھ مشہور منکرات

راستے میں خرید و فروخت کرنا

شریعت میں لوگوں کے جائز آرام اور سہولت کا خاص اہتمام کیا گیا، بلاوجہ کسی کے تکلیف پہنچانے کو ناجائز و حرام قرار دیا، جن اُمور سے عامۃ المسلمین کو بلاوجہ تنگی و پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہو اس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا، بلکہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کہا ہی اس شخص کو جس کے زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان بالکل مطمئن اور محفوظ ہوں، یعنی جو بلاوجہ اپنے کسی حرکت سے دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف نہ پہنچاتا ہو، محدثین کرام اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے قول و فعل سے بلاوجہ دوسرے مسلمان کو تکلیف و مشقت پہنچائے وہ کامل مسلمان نہیں۔

شریعتِ اسلام میں معاشرت پر انتہائی زور دیا گیا، آپس میں رہن سہن اور زندگی گزارنے کے متعلق بہت سے احکام مقرر کئے ہیں، وجہ ہے کہ معاشرت شریعت اسلام کے بنیادی شعبوں میں سے ایک ہے، اسی معاشرت کے بنیادی اُصولوں میں سے ایک یہ اہم سبق بھی ہے جو اس حدیث میں بڑی جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا کہ بلاوجہ کسی کو پریشان کرنا اور اس کو تکلیف پہنچانا شرعاً جائز نہیں، اسلئے عام راستوں میں ہر وہ فعل شرعاً ممنوع ہے جس سے گزرنے والوں کو بلاوجہ مشقت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔

احادیث میں تو یہاں تک ارشاد فرمایا گیا:

"اتقوا اللاعنين، قالوا: وما اللاعنان يا رسول الله؟ قال: الذي يتخلى في طريق الناس أو ظلهم۔

عن معاذ بن جبل، قال: قال رسول الله ﷺ: اتقوا الملاعن الثلاثة: البراز في الموارد، وقارعة الطريق، والظل۔ "

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا دو لعنت والے کاموں سے بچو۔ صحابہ ﷽ نے پوچھا وہ دو کام کون سے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا پاخانہ کرنا کسی گذرگاہ میں یا سایہ دار جگہ میں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین لعنت والے کاموں سے بچو یعنی پاخانہ کرنا پانی کے گھاٹ پر، کسی گذر گاہ پر اور سایہ دار جگہ میں۔[1]

ان روایات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام راستے کو بند یا تنگ کرنے کا شریعت کی نظر میں کیا مقام ہے؟

انہی روایات کی روشنی میں فقہاءِ اسلام نے لکھا ہے کہ شاہراہ اور راستے میں کوئی ایسا کام کرنا جائز نہیں جس سے دیگر لوگوں کو گزرنے میں کلفت ہو مثلاً اپنا مال ومتاع رکھ کر دکان نما بنانا جس سے راستہ بند یا تنگ ہو جائے، یا عام شاہراہ میں گاڑی کھڑی کرنا، پروگرام کیلئے ٹینٹ وغیرہ لگا کر بند کرلینا وغیرہ وغیرہ، یہ تمام وہ اُمور ہیں جن کی شرعاً

---

[1] سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب المواضع التي نهى النبي ﷺ عن البول فيها، رقم الحديث: 25و26

بالکل اجازت نہیں۔

فٹ پاتھ پر خرید وفروخت کرنا بھی ان ہی اُمور میں سے ہے جو اکثر بازاروں میں بلا نکیر رائج ہے کسی کو اس کے ناجائز ہونے کا خیال تک نہیں آتا، حالانکہ حکومت کی طرف سے یہ جگہیں پیادہ لوگوں کے گزرنے کیلئے مقرر کئے جاتے ہیں، اس پر ڈھیرا لگا کر تجارت کرنا قانوناً بھی ممنوع ہے، اور شرعاً بھی ناجائز ہے ۔

فٹ پاتھ پر یوں قبضہ جمانے کے کئی ایسے بھیانک مفاسد ہیں کہ جن کو دیکھ کر اکثر ملکوں میں اس پر کڑی پابندی ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے اس حوالے سے کوئی زیادہ محرک اور لائق تقلید کام نہیں کرسکی، عوام الناس کی راحت و سہولت کا کوئی خیال وپاس نہیں، یہی وجہ سے کہ چند ٹکوں کے بدلے پوری قوم کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، جگہ جگہ دوچار پیسوں کے بدلے قانون فروخت ہونے کا سب لوگ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

بے اختیار عوام کی ذمہ داری

ایسی صورت حال میں "بے اختیار عوام" کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اولاًان لوگوں کو مناسب طریقہ سے منع کریں، اور بہتر یہ ہے کہ کمیٹی وغیرہ کی شکل میں ان کیلئے کوئی متبادل انتظام کیا جائے، ورنہ فقہاءِ کرام نے تحریر فرمایاہے کہ ان لوگوں سے بلا ضرورت خرید وفروخت کا معاملہ ہی نہ کیا جائے کیونکہ یہی ان کی تائید وتقویت کا باعث بنتاہے اگرسب لوگ خریداری بند کریں گے تو راستہ میں کھڑے ہو کر بازار لگانے کی موقع نہیں آئے گا۔

فقہ حنفی کی کتاب "الفتاوی الغیاثیہ" میں ہے:

"من يبيع ويشتري على الطريق ولم يضر قعوده للناس لسعة الطريق لا بأس به، وإن أضر بهم فالمختار أنه لا يشترى منه لأنه إذا لم يجد مشتريا لا يقعد فكان الشراء منه إعانة على المعصية۔"

"جو شخص راستے میں خرید وفروخت کرتا ہو اور راستہ کشادہ ہونے کی وجہ سے اس کے بیٹھنے سے لوگوں کو تکلیف کا بھی سامنا نہ کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر اس کی وجہ لوگوں کو تکلیف ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس سے کوئی خریداری نہ کی جائے کیونکہ جب وہ کوئی خریدار نہ پائے گا تو راستہ میں یوں نہ بیٹھے گا، تو (گویا) اس سے خریدنا اس کی اس گناہ میں مدد کرنا ہے۔"[1]

علامہ ابن النحاس شہید رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"ومنها: جلوس البياعين ببضائعهم في الطرق والشوارع وفي أبواب المساجد والجوامع۔ ومنها:بناء الدكان من خشب وغيره علي أبواب الدور في الشوارع النافذة، وذلك حرام سواء أضر بالمارة أو لم يضرعلي الصحيح، ويجب علي كل قادر هدم ذلك والمنع منه۔"

"ان منکرات میں سے ایک دوکاندار لوگوں کا اپنا سامان لیکر راستوں، شاہراہوں اور مسجدوں کے دروازوں پر بیٹھنا بھی ہے، اور ایک منکر گزرنے والی شاہراہوں میں گھروں کے دروازوں پر لکڑی وغیرہ سے دوکان بنانا بھی

---

[1] الفتاوى الغياثية، كتاب البيوع،قبيل الباب السادس فى الاستقراض، ص ۱۵۳،مطبع بولاق

ہے، صحیح قول کے مطابق یہ بالکل حرام ہے چاہے گزرنے والوں کو تکلیف ہو یا نہ، جو شخص بھی استطاعت رکھتا ہے اس پر یہ سارا کچھ مٹانا اور لوگوں کو اس سے منع کرنا واجب ہے۔"[1]

غلط جگہ گاڑی پارک کرنا

ذکر کردہ تفصیلات سے اچھی طرح واضح ہو چکا کہ راستے اور شاہراہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ تمام گزرنے والوں کے درمیان مشترک ہے، لہٰذا ہر کوئی اپنے جائز مقاصد کیلئے اس کو استعمال کر سکتا ہے، لیکن ان جیسی مشترکہ چیزوں کے استعمال میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ دوسرے لوگوں کے حق میں یہ استعمال مضر نہ ہو، جس استعمال سے دیگر لوگوں کو بلاوجہ تکلیف ومشقت کا سامنا کرنا پڑے، ایسا استعمال شرعاً جائز نہیں، یہ وہ ضابطہ ہے جس کو فقہاء کرام "مرور في الطريق العام مقيد بشرط السلامة" سے تعبیر فرماتے ہیں۔

اس ضابطہ کی روشنی میں اس پر دورِ حاضر کے متنوع مسائل اور معاشرے کو چین وسکون سے محروم رکھنے والے کئی مشکلات وعوامل کو آسانی کے ساتھ خود بخود حل کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ دور میں ایک اہم مسئلہ گاڑی پارکنگ کا ہے، بے جگہ پارکنگ کرنے سے جہاں ایک آدمی کو وقتی فائدہ ہوتا ہے وہاں اس کے بعد آنے والے جم غفیر کو بڑی

---

[1] تنبيه الغافلين،الباب السابع، فصل في ذكر مايشاهدفي الأسواق والشوارع من البدع والمنكرات، ص457تا460

پریشانی اور انتہائی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسلیئے روڈ، شاہراہ اور کھلے عام راستوں میں اس طور پر گاڑی کھڑی کرنا جو پیادہ یا گاڑی میں گزرنے والوں کے لیے دقت کا باعث ہو، بالکل ناجائز ہے۔

علامہ ابن النحاس شہید رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"كذلك ربط الدواب علي الطريق بحيث تضيق الطريق وتنجس المجتازين منه منكر يجب المنع منه إلا بقدرحاجة النزول والركوب۔"

"راستہ میں سواری اس طور پر کھڑی کرنا جس کی وجہ سے راستہ تنگ ہو جائے اور جس سے گزرنے والے نجس ہو جائے، ناجائز ہے، (مسلمانوں پر) اس (عمل) سے روکنا ضروری ہے، تاہم اترنے یا سوار ہونے کے بقدر اگر سواری کھڑی کی جائے تو درست ہے۔"[1]

شریعت کے مطابق کاروبار کرنے کی اہمیت

دین اسلام ایک جامع اور مکمل دستور زندگی ہے، اس میں انسانی زندگی کے تمام نشیب و فراز کے متعلق احکامات موجود ہیں، زندگی گزارنے کے تمام گوشوں اور ہر ہر موقع پر حضرت انسان کی مکمل اور درست رہنمائی کا سامان اس میں موجود ہے، انسان کو اس بات کا مکلف بنایا کہ وہ اپنی پوری زندگی اس جامع اور مکمل دین کی تعلیمات کی روشنی میں گزارے۔

[1] حوالہ سابقہ

خرید و فروخت اور کاروبار بھی چونکہ انسانی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے جس سے انسان کو واسطہ پڑتا تھا اور دنیا میں اس کی اہمیت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ مادیت کی حد تک افراد اور ممالک کے ترقی اور استحکام کا دار مدار ہی معیشت پر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن دوسری طرف اگر انسان کو اس میدان میں بالکل آزاد چھوڑا جائے تو اس سے بے شمار خرابیاں جنم لیتی ہیں، اسلئے سیکولر ممالک میں بھی اس کیلئے کچھ نہ کچھ قوانین مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ ممکنہ مفاسد اور خرابیوں پر قابو پایا جاسکے۔

شریعتِ اسلام نے اپنی بے مثال شفقت کی خاطر اس مرحلہ میں بھی انسان کی خیر خواہی اور درست رہنمائی سے ہاتھ نہیں تھا بلکہ یہاں بھی اس کیلئے معتدل اور یادگار تعلیمات دی گئیں، اور انسان کو اس بات کا مکلف بنایا گیا کہ وہ ان ہی طے شدہ اُصولوں اور مقررہ طریقہ کار کے مطابق ہی اپنی یہ ضرورت پوری کرے۔

پھر صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جو کوئی نیک نیت کے ساتھ اپنی یہ ضرورت شریعت کے طے کردہ طریقہ کار کے مطابق پوری کرے اس کیلئے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا گیا، امانت و دیانت کے ساتھ اور شرعی اُصولوں کے ماتحت تجارت کرنے والوں کیلئے احادیث مبارکہ میں بڑے فضائل بیان فرمائے گئے، آخرت میں بلند درجات کی خوشخبریاں دی گئیں، جس کی ایک جھلک شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "فضائلِ تجارت" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خرید و فروخت کے مسائل جاننے کی ضرورت

ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ کسی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا شرعی

حکم معلوم کرے، عملی زندگی میں اس کو جن اُمور سے واسطہ پڑتا ہے، اس کے بارے میں شرعی تعلیمات سے آگاہ ہونا ضروری ہے، لہذا مسلمان تاجر کی یہ ذمہ داری ہے کہ تجارت شروع کرنے سے پہلے اس کے ضروری اور روزہ مرہ کے بنیادی مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر کاروبار شروع کرے اور تجارت میں کوئی بھی معاملہ کرنے سے پہلے اس بات کا جائزہ لے لے کہ یہ معاملہ شرعاً جائز بھی ہے یا نہیں؟

حضرات صحابہ کرام اور سلف صالحین کا اہتمام

حضرات صحابہ کرام بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نے اس کا بھرپور لحاظ رکھا، امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس بات پر بڑا زور دیتے تھے کہ بازار میں کاروبار کرنے کیلئے وہی شخص آئے جس کو کاروبار سے متعلق بنیادی مسائل مثلاً سود وغیرہ کا پتہ ہو، بلکہ بعض اوقات کوڑا لے کر بازار تشریف لے جایا کرتے اور جو تاجر متعلقہ مسائل سے بے خبر ہوتا تھا ، اس کو سزا دیتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں یہی حکم دیا تھا کہ جن لوگوں کو خرید و فروخت سے متعلق شرعی مسائل کا علم نہیں ان کو بازار میں نہ بیٹھنے دیا جائے۔

بعد کے زمانے میں بھی جب تک ایوان اقتدار میں شریعت کی بالادستی رہی، حکام و سلاطین جب تک دین کی خدمت وحفاظت کو اپنا فرض منصبی سمجھتے رہے ،تو اُنہوں نے ان باتوں کا خصوصی انتظام کیا تھا۔

علامہ ابن الحاج المالک رحمۃ اللہ علیہ نے لکھاہے کہ دیار مغرب میں بعض اوقات محتسب لوگ بازاروں پر خفیہ چھاپہ مارتے تھے اور ایک ایک دوکاندار سے باقاعدہ مسائل پوچھتے، جو شخص جس کاروبار سے متعلق تھا اس کے متعلق بنیادی مسائل دریافت

کرتے، جو جو دوکاندار اس کو درست جواب دیتے ان ہی کو بازار میں باقی رکھا جاتا تھا، جس دوکاندار کو اپنے کاروبار کے متعلق دینی مسائل کا علم نہ ہوتا اس کو بازار سے نکال دیتے تھے کہ جب تک آپ ان مسائل کو نہیں سمجھتے اس وقت تک آپ کو تجارت کرنے کی اجازت نہیں۔[1]

مولانا عبدالحہ کتانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) نے لکھا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ بسا اوقات امراء وسلاطین کی وساطت سے تجارت کرنے والوں کو اپنے پاس جمع کرتے تھے ، ان میں سے جس تاجر کو جائز وناجائز کا علم نہ ہوتا، کاروبار سے متعلق حلال و حرام کا پتہ نہ ہوتا یا اپنے کاروبار سے متعلق شرعی مسائل سے جو ناواقف ہوتا تھا اس کو محدود مدت کیلئے بازار سے اُٹھوا دیتے تھے اور اس کو یہ تاکید کرتے کہ پہلے جاکر خرید و فروخت کے مسائل سیکھو اس کے بعد ہی تجارت کرو، اگر مسائل سیکھے بغیر تجارت کرو گے تو خطرہ ہے کہ سود (اور اس کے علاوہ اور ناجائز معاملات) میں مبتلا نہ ہو جائیں۔[2]

لٰہذا کوئی بھی کاروبار کرنے سے پہلے اس کے بنیادی نوعیت کے مسائل سیکھنا

---

[1] المدخل لابن الحاج،فصل في القيام للناس في المحافل والمجالس،1/ 157

[2] التراتيب الإدارية، القسم التاسع في ذكر حرف وصناعات كانت في عهد رسول الله ص وذكر من عملها من الصحابة،باب كون الناس كانوا أول الإسلام لا يتعاطون البيع والشراء حتى يتعلموا أحكامه وآدابه وما ينجي من الربا، 2/ 17

ضروری ہے اور اگر کوئی ایسی صورتِ حال پیش آجائے جس کا شرعی حکم پہلے سے معلوم نہ ہو تو مستند علماء اور مفتیانِ کرام سے اس کے متعلق رہنمائی لینی ضروری ہے، تاکہ ناجائز کاروبار کا ارتکاب نہ ہو۔

حرام کمائی کے نقصانات

جو کمائی ناجائز طریقہ سے حاصل کی جائے اس سے غلط جذبات ہی جنم لیتے ہے جو ناجائز اور محرمات کے ارتکاب کا باعث بن جاتے ہیں، اور پوری زندگی نافرمانیوں کے آہنی زنجیر میں جکڑا دیتے ہیں جو ایک طرف تو غم ومصیبت، دُکھ ودرد کا سامان پیدا کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کا اخروی انجام انتہائی خطرناک اور عبرتناک بن جاتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے بالکل سچ فرمایا:

"إنه لا يربو لحم نبت من سحت إلا كانت النار أولى به.
"

" بے شک جو گوشت حرام مال سے بڑھے جہنم ہی اس کیلئے زیادہ موزون ہے۔"[1]

شام کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض صوفیاء کرام

[1] سنن الترمذي، كتاب الصلاة، أبواب السفر، باب ما ذكر في فضل الصلاة، رقم الحديث: 614، وذكره الحاكم في المستدرك وجعله علي شرط البخاري ومسلم ووافقه الذهبي عليه، انظر المستدرك: كتاب الفتن والملاحم، رقم الحديث: 8302

کا ایک مفید ملفوظ نقل فرمایا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"إذا أكلت الحلال أطعت الله شئت أو أبيت، و إذا أكلت الحرام عصيت الله شئت أو أبيت، وكان بعض نساء السلف يقلن لأزواجهن قبل خروجهم في طلب الرزق: اتقوا الله فينا ولاتطعمونا الحرام فإنّا نصبر علي الجوع ولانصبر علي النار۔"

"جب آپ حلال مال کھائیں گے تو آپ چاہے یا نہ چاہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت والے کام ہی صادر ہوں گے اور اگر (خدانخواستہ) آپ حرام مال کھائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے اعمال ہی نمودار ہوں گے چاہے آپ کی مرضی ہو یا نہیں، (اسی لئے) بعض اسلاف کی بیویاں اپنے شوہروں کو رزق کی تلاش میں نکلنے سے پہلے کہا کرتی تھی کہ: اللہ تعالیٰ سے ہمارے بارے میں ڈرنا اور ہمیں حرام مال نہ کھلانا، کیونکہ ہم بھوک پیاس تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن جہنم کی آگ نہیں سہہ سکتے۔"[1]

سچ بولنے کی تاکید اور جھوٹ بولنے کی مذمت

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک انسانی معاشرے میں بازار و مارکیٹ کی کیا حیثیت ہے؟ بازار انسانی معاشرے کا لازمی جزء ہے جس کے بغیر معاشرے کے ضروریات کی

[1] الحث علي التجارة والصناعة والعمل، بتحقيق الشيخ عبدالفتاح أبو غده رحمة الله عليه : ص39، مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب

تکمیل اور پر سکون زندگی گزارنے کا تصور کرنا شاید ناممکن ہے، ایک انسان کو مختلف اشیاء کے لینے دینے کی ضرورت پیش آتی ہے یوں ہی اگر کہیں ایک پورا معاشرہ آباد ہو تو وہاں یہ ضرورت اور زیادہ سخت ہو جاتی ہے، اور سہولت کی خاطر اسی تبادلے کیلئے کوئی جگہ مقرر کرنا لازم ہوتا ہے جہاں ہر وقت ضرورت مند شخص جا کر اپنی ضرورت کی تکمیل کر سکے، اسی کو بازار کہا جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان کو ضرورت ہی در پیش نہ ہو اور نہ ہی اسی پر زندگی گزاری جا سکتی ہے کہ اتفاقی طور پر کسی بھی جگہ ضرورت پوری کر لی جائے کسی خاص جگہ متعین کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو، خصوصاً جب بات صرف ایک انسان اور اس کی محدود ضروریات ہی تک منحصر نہ ہو بلکہ پورے معاشرے کو دیکھ کر بات کی جائے، اسلئے اس مقصد کی تکمیل کیلئے ہر معاشرہ بازار کو اپنا لازمی حصہ سمجھتی ہے اور ہر تندرست اور ترقی یافتہ معاشرے میں بازار کا وجود یقینی ہوتا ہے۔

بازار کے ساتھ چونکہ تجربہ کار، ناتجربہ دہندہ، ذہین وفطین، سادہ وغبی ہر قسم بنی نوع انسان کا واسطہ یقینی ہوتا ہے، اسلئے شریعت اسلام نے اس کے متعلق خصوصی ہدایات اور کچھ لازمی اُصول مقرر فرمائے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

بازار میں شریعت کا ایک زریں حکم

ان اُصول اور ہدایات میں سے ایک اہم اور زرین حکم یہ ہے کہ حتی الامکان سچ ہی بولا جائے، دھوکہ، مکروفریب اور جھوٹ وغلط بیانی سے ہر قیمت پر بچا جائے، احادیثِ مبارکہ میں اس سے بڑی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے، دھوکہ دینے کی دو صورتیں ہیں:

الف: خلاف واقعہ صفات کا زبان سے اظہار کر کے گاہک کو ورغلایا جائے۔

ب: زبانی کچھ خلافِ حقیقت بات کا صدور نہ ہو لیکن ایسا رویہ اپنایا جائے کہ خریدار یقین کرے کہ یہ جو چیز مجھے بیچ رہا ہے وہ اس معیار کی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ ہو۔

دھوکہ دہی کے یہ دونوں طریقے شریعت اسلام میں گناہ ہیں، گناہ ہونے میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ پہلی صورت میں دھوکہ اور جھوٹ دونوں کبیرہ گناہ جمع ہیں اور دوسرے میں بظاہر صرف دھوکہ نظر آتا ہے، کوئی اس کو جھوٹ نہیں سمجھتا، لیکن حضور ﷺ نے دونوں سے منع فرمایا، اور تجارت کے میدان میں سچ بولنے، حقیقت ظاہر کرنے اور اگر بیچی جانے والی چیز میں کوئی واقعی عیب ہو تو اس کو ظاہر کرنے کے تاکیدی ارشادات جاری فرمائے جس کا ایک مختصر نمونہ پیش خدمت ہے۔

امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ روایت نقل فرمائی کہ:

"تاجر قیامت کے دن فاجر (اور گنہگار لوگوں کے صف میں) کھڑے کئے جائیں گے مگر جو تاجر اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور نیکی کی اور سچ بولا۔"[1]

اس حدیثِ مبارکہ میں بتایا گیا کہ قیامت کے دن تاجر لوگ فاجر اور گناہ گار لوگوں کی صف میں اُٹھائے جائیں گے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کس گناہ کی پاداش میں ان کا یہ

---

[1] رواه الترمذي في سننه وقال: هذا حديث حسن صحيح، انظرسنن الترمذي ، باب ما جاء في التجار وتسمية النبي ﷺ إياهم أبواب البيوع، رقم الحديث:1210

انجام ہوا؟ ایک دوسری حدیث سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا:

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تجار ہی فاجر و گناہگار ہیں، ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول: کیا اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو جائز نہیں قرار دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "کیوں نہیں، لیکن یہ لوگ (بیچا) قسمیں کھاتے ہیں اور گناہگار ہوتے ہیں۔"[1]

اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرمایا کہ جو تاجر تجارت میں جھوٹ بولتا اور دھوکہ کرتا ہے اور اس پر قسم کھا کھا کر خریدار کو باور کراتا ہے، شریعت کے اُصولوں کے مطابق کاروبار نہیں کرتا، قیامت کے دن فجار اور گناہ گار لوگوں کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔

یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ کوئی شخص دو تین پیسوں کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرے، دنیا کے وقتی نفع کی خاطر اپنا انجام خراب کرنا بڑی نادانی اور انتہائی حماقت ہے، اس کے برعکس جو تاجر جھوٹ بولنے اور دھوکہ دہی سے اپنے آپ کو بچائے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی ہی قابل رشک بشارت سنائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"سچے امانت دار تاجر (کا حشر) انبیاء کرام، صدیقین اور شہداء کیساتھ ہوگا۔"[2]

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي، كتاب البيوع، باب كراهية اليمين في البيع 5 / 437

[2] رواه الترمذي في سننه وحسنه، انظرسنن الترمذي ، باب ما جاء في التجار وتسمية النبي ﷺ إياهم أبواب البيوع، رقم الحديث:1209

حضرات انبیاء کرام، صدیقین اور شہدائے عظام جنہوں نے اپنی پوری زندگی دین اور بندگی خداوندی میں نثار کردی، قیامت کے دن ان کا مقام و مرتبہ کتنا بلند و بالا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے! لیکن تاجر اپنے ایک آسان عمل کے ذریعے ان کا مقام پا سکتا ہے، ایک طرف ان حضرات کی پوری زندگی راہ حق میں طرح طرح کی قربانی دینے سے بھری پڑی ہے۔

دوسری طرف ایک تاجر ہے جو اپنے فائدے کے لئے کاروبار کرتا ہے، لیکن لوگوں کے ساتھ دھوکہ، فریب اور جھوٹ سے پیش نہیں آتا، بلکہ شرعی اُصول واحکام کے مطابق اپنا کاروبار جاری رکھتا ہے ان دونوں کا حشر ایک ساتھ ہوگا! اس بات سے کاروبار کے اندر سچائی کے قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا احادیث میں کاروبار کے اندر جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کی مذمت بیان ہوئی، یاد رہے کہ جھوٹ اور دھوکہ صرف یہ نہیں کہ زبان سے جھوٹ بولے بلکہ خریدار کو کسی بھی فنکاری سے ایسا یقین دلایا جائے جو خلاف حقیقت ہو، جس کے نتیجہ میں وہ دھوکہ کھائے اور جو خریدی جانے والی چیز کی واقعی صورت حال ہے، اس سے وہ بڑھ تر تصور کرے، یہ سارے طریقے اس مذمت کے اندر داخل ہے، اور یہ سب ہی طریقے ناجائز ہیں جس میں ایک مسلمان بھائی کو ناحق نقصان دیا جاتا ہے، اسی بنیاد پر شریعت میں ان جیسی تمام صورتوں سے منع فرمایا گیا۔ ایک حدیث شریف میں ہے:

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی پر کوئی عیب دار چیز بیچدے مگر یہ اسکو بتائے (کہ اس میں یہ عیب ہے)۔ "[1]

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب من باع عيبا فليبينه، رقم

اس صورت میں دوکاندار زبان کو جھوٹ کیلئے استعمال نہیں کرتا بلکہ خاموش رہتا ہے اور مبیع کے اندر موجودہ عیب خریدار کو واضح نہیں کرتا، لیکن حدیث مبارک میں پھر بھی اس کو منع فرمایا گیا، کیونکہ یہ خاموشی بھی در حقیقت جھوٹ اور دھوکہ ہی کی ایک شکل اور اسی کی ایک مہذب شاخ ہے۔

بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ وضاحت اور جامعیت کے ساتھ ان جیسے سارے چور دروازوں کو بند کیا گیا، چنانچہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ:

" عن سفيان بن أسيد الحضرمي، قال: سمعت رسول الله ﷺ، يقول: كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا هو لك به مصدق، وأنت له به كاذب"

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑی خیانت کی بات ہے کہ آپ اپنے (مسلمان) بھائی کو کوئی ایسی بات کرے جس میں وہ آپ کو سچا سمجھے، حالانکہ آپ جھوٹے ہو۔"[1]

یہ اس سلسلہ کا ایک بڑا ہی جامع اور واضح اُصول ہے جس سے تمام صورتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دوکاندار کا ہر وہ طرز عمل جس سے مخاطب کو غلط فہمی اور دھوکہ ہو، ناجائز اور خیانت ہے، جس سے ایک مسلمان کو بچنا ضروری ہے۔

الحديث:2246

[1] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في المعاريض 4 / 293

کاروبار سے برکت ختم ہو جانے کا ایک بنیادی سبب

تعلیماتِ اسلام کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خرید و فروخت کرنا مسلمان کا صرف ایک وقتی ضرورت اور دنیوی تقاضا ہی نہیں، بلکہ اگر شرعی اُصول کے تحت کیا جائے تو عبادت اور حصول اجر و ثواب کا ذریعہ اور رضا خداوندی ملنے کا ایک بہترین وسیلہ بھی ہے، اسی لئے جب شرعی احکامات کی روشنی میں حلال و حرام کی تمیز کرنے کے ساتھ کوئی کاروبار کیا جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص برکت نازل ہوتی ہے، جو اگرچہ ظاہری آنکھوں سے دیکھی نہیں جاسکتی، حسی آلات سے اس کا ناپنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن نگاہ بصیرت اس کا مشاہدہ کرتی ہے اور معمولی چیز اتنے کام میں آتی ہے کہ بصیرت سے محروم آنکھیں محو حیرت ہو جاتی ہیں، حقیقت سے ناآشنا قلب و جگر اس کے راز تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، مادیات سے خوفزدہ دماغ اس کی کھوج لگاتے لگاتے ہار قبول کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" البيعان بالخيار ما لم يتفرقا- أو قال: حتى يتفرقا - فإن صدقا وبينا بورك لهما في بيعهما، وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما۔ "

" خریدنے اور فروخت کرنے والے کو اختیار ہے جب تک دونوں جدا نہ ہو جائیں، اگر دونوں سچ سچ بولے اور (سودے میں کوئی عیب یا خرابی ہو تو وہ) بیان کریں تو ان کے اس سودے میں برکت رکھ دی جاتی ہے، اور اگر (عیب

کو) چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو سودے کی برکت ختم کردی جاتی ہے۔"[1]

سوچنے اور عبرت لینے کا مقام ہے کہ عام طور پر لوگ اپنے فائدہ کیلئے ہی دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں، لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیوی فائدہ بھی دھوکہ نہ دینے میں ہی ہے، دھوکہ دینے کی وجہ سے مال سے برکت ختم ہو جاتی ہے، اور پھر اس مال سے وہ کام بھی نہیں لیا جا سکتا جو کم مال سے لیا جا سکتا تھا۔

بلکہ قرآن وحدیث کے بعض نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ دھوکہ دہی کا انجام اور برائی و نقصان دھوکہ دینے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے، اور یہ صرف آخرت میں ہی نہیں، بلکہ دنیا میں بھی دھوکہ دینے والے کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔

اسی سلسلہ کے ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"قال الإمام: فأما المكر والخداع في غير أمر الجهاد، فحرام، ولا يأمن فاعله من أن يعود إليه وبال خداعه ومكره، قال الله تعالى: {وحاق بهم ما كانوا به يستهزئون}وقال جل ذكره: ولا يحيق المكر السيئ إلا بأهله} أي لا يرجع عاقبة مكرهم إلا عليهم، والحيق: ما يشتمل على الإنسان من مكروه فعله۔"

"جہاد کے علاوہ اُمور میں مکروفریب حرام ہے، اور کرنے والا اس کے انجام

---

[1] صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب إذا بين البيعان ولم يكتما ونصحا، رقم الحديث:2079

سے محفوظ نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔[1]

[1] شرح السنة للبغوي، باب المكر في الحرب والكذب والخديعة 11 / 46

المصادر والمراجع

1. إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، أبو العباس شهاب الدين أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل بن سليم بن قايماز بن عثمان البوصيري الكناني الشافعي (المتوفى: 840هـ) دار النشر: دار الوطن للنشر، الرياض، الطبعة: الأولى، 1420 هـ - 1999 م
2. أحسن الفتاوى، رشيد احمد لدهيانوى، أيچ أيم سعيد كراتشي باكستان
3. أحكام القرآن، أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (المتوفى: 370هـ)الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت تاريخ الطبع: 1405ه
4. إحياء علوم الدين، أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (المتوفى: 505هـ) الناشر: دار المعرفة – بيروت
5. الآداب الشرعية والمنح المرعية، المؤلف: محمد بن مفلح بن محمد بن مفرج، أبو عبد الله، شمس الدين المقدسي الرامينى ثم الصالحي الحنبلي (المتوفى: 763هـ) الناشر: عالم الكتب
6. الإسعاف فى أحكام الأوقاف، إبراهيم بن موسى بن أبي بكر ابن الشيخ علي الطرابلسي، الحنفي (المتوفى: 922هـ) الناشر: طبع بمطبعة هندية بشارع المهدى بالأزبكية بمصر المحمية، الطبعة: الثانية، 1320 هـ - 1902 م

7. أسنى المطالب في شرح روض الطالب، زكريا بن محمد بن زكريا الأنصاري، زين الدين أبو يحيى السنيكي (المتوفى: 926هـ) الناشر: دار الكتاب الإسلامي
8. إعلام الموقعين عن رب العالمين محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية (المتوفى: 751هـ)الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت الطبعة: الأولى، 1411هـ - 1991م
9. الاقتصاد في الاعتقاد، أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (المتوفى: 505هـ) الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان، الطبعة: الأولى، 1424 هـ - 2004 م
10. إمداد الفتاوى، أشرف على التهانوي، دارالعلوم كراتشي
11. البحر الرائق شرح كنز الدقائق، زين الدين بن إبراهيم، المعروف بابن نجيم المصري (المتوفى: 970هـ) الناشر: دار الكتاب الإسلامي الطبعة: الثانية - بدون تاريخ
12. البدع والنهي عنها، أبو عبد الله محمد بن وضاح بن بزيع المرواني القرطبي (المتوفى: 286هـ)، تحقيق ودراسة: عمرو عبد المنعم سليم، الناشر: مكتبة ابن تيمية، القاهرة- مصر، مكتبة العلم، جدة – السعودية، الطبعة: الأولى، 1416 ه
13. بذل المجهود شرح سنن أبي داؤد، خليل أحمد السهارنبوري، دار الكتب العلمية، بيروت
14. بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية، المؤلف: محمد بن محمد بن مصطفى بن عثمان، أبو سعيد الخادمى الحنفي (المتوفى: 1156هـ) الناشر: مطبعة الحلبي، الطبعة: بدون طبعة، 1348ه

15. تاج العروس من جواهر القاموس، المؤلف: محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقّب بمرتضى، الزَّبيدي (المتوفى: 1205هـ) الناشر: دار الهداية
16. تأليفات رشيدية، رشيد أحمد الجنجوهي، إداره إسلاميات، لاهور
17. تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشِّلْبِيِّ، عثمان بن علي الزيلعي الحنفي (المتوفى: 743 هـ) الناشر: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة الطبعة: الأولى، 1313 ه
18. التشريع الجنائي الإسلامي مقارناً بالقانون الوضع المؤلف: عبد القادر عودة لناشر: دار الكاتب العربي، بيروت
19. التشريع الجنائي الإسلامي مقارناً بالقانون الوضعي، المؤلف: عبد القادر عودة، الناشر: دار الكاتب العربي، بيروت
20. تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم، عبد الرحمن ابن أبي حاتم (المتوفى: 327هـ) الناشر: مكتبة نزار مصطفى الباز - المملكة العربية السعودية الطبعة: الثالثة - 1419 هـ
21. التفسير المظهري، المظهري، محمد ثناء الله الناشر: المكتبة الرشدية – الباكستان الطبعة: 1412 ه
22. التقرير والتحبير، محمد بن محمد بن محمد المعروف بابن أمير حاج الحنفي (المتوفى: 879هـ)الناشر: دار الكتب العلمية الطبعة: الثانية، 1403هـ - 1983م
23. تلبيس إبليس، جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفى: 597هـ) الناشر: دار الفكر للطباعة والنشر، بيرزت، لبنان، الطبعة: الطبعة الأولى، 1421هـ/ 2001م

24. التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد، يوسف بن عبد الله بن بن عبد البر القرطبي (المتوفى: 463هـ) الناشر: وزارة عموم الأوقاف والشؤون الإسلامية – المغرب عام النشر: 1387 ه

25. تنبيه الغافلين عن أعمال الجاهلين وتحذيرالسالكين من أفعال الهالكين، أحمد بن إبراهيم بن النحاس الدمشقي، أبو زكريا (المتوفي 814ه) دار الكتب العلمية، بيروت

26. جامع البيان في تأويل القرآن، محمد بن جرير الآملي، أبو جعفر الطبري (المتوفى: 310هـ) الناشر: مؤسسة الرسالة الطبعة: الأولى، 1420 هـ - 2000 م

27. جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثا من جوامع الكلم، زين الدين عبد الرحمن بن أحمد بن رجب بن الحسن، السَلامي، البغدادي، ثم الدمشقي، الحنبلي (المتوفى: 795هـ) المحقق: شعيب الأرناؤوط - إبراهيم باجس، الناشر: مؤسسة الرسالة – بيروت، الطبعة: السابعة، 1422هـ - 2001م

28. الجامع الكبير - سنن الترمذي ، محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى (المتوفى: 279هـ) المحقق: بشار عواد معروف الناشر: دار الغرب الإسلامي – بيروت سنة النشر: 1998 م

29. الجامع المسند الصحيح المختصر من أُمور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وأيامه = صحيح البخاري

30. حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، محمد بن أحمد بن عرفة الدسوقي المالكي (المتوفى: 1230هـ) الناشر: دار الفكر الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ

31. حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني (المتوفى: 430هـ) الناشر: السعادة - بجوار محافظة مصر، 1394هـ - 1974م
32. خلاصة الفتاوى، عبدالرشيد البخاري
33. الدر المنثور، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (المتوفى: 911هـ) الناشر: دار الفكر – بيروت
34. الذخيرة أحمد بن إدريس بن عبد الرحمن المالكي الشهير بالقرافي (المتوفى: 684هـ الناشر: دار الغرب الإسلامي- بيروت الطبعة: الأولى، 1994 م
35. الذريعة إلى مكارم الشريعة، أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانى (المتوفى: 502هـ) تحقيق: د. أبو اليزيد أبو زيد العجمي دار النشر: دار السلام – القاهرة، عام النشر: 1428 هـ - 2007 م
36. رد المحتار على الدر المختار محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (المتوفى: 1252هـ) الناشر: ايچ ايم سعيد، كراتشي
37. رسالة إلى أهل الثغر بباب الأبواب،أبو الحسن علي بن إسماعيل بن إسحاق بن سالم بن إسماعيل بن عبد الله بن موسى بن أبي بردة بن أبي موسى الأشعري (المتوفى: 324هـ)، المحقق: عبد الله شاكر محمد الجنيدي الناشر: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية، الطبعة: 1413هـ
38. روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (المتوفى: 1270هـ)

39. زاد المسير في علم التفسير، عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفى: 597هـ) الناشر: دار الكتاب العربي – بيروت، الطبعة: الأولى - 1422ه
40. الزواجر عن اقتراف الكبائر، المؤلف: أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي السعدي الأنصاري، شهاب الدين شيخ الإسلام، أبو العباس (المتوفى: 974هـ) الناشر: دار الفكر، الطبعة: الأولى، 1407هـ - 1987م
41. سنن أبي داود أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو (المتوفى: 275هـ) الناشر: المكتبة العصرية، صيدا – بيروت
42. شرح الأربعين النووية في الأحاديث الصحيحة النبوية ، أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي، الناشر: مؤسسة الريان الطبعة: السادسة 1424 هـ - 2003 م
43. شرح السنة ، الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوي الشافعي (المتوفى: 516هـ)الناشر: المكتب الإسلامي بيروت الطبعة: الثانية، 1403هـ - 1983م
44. شرح المجلة، محمدخالد الأتاسي، مكتبه رشيديه، كوئته باكستان
45. شرح المواقف في علم الكلام، ميرسيدشريف الجرجاني، دارالكتب العلمية، بيروت
46. شرح مشكل الآثار، أحمد بن محمد بن سلامة المعروف بالطحاوي (المتوفى: 321هـ) الناشر: مؤسسة الرسالة، الطبعة: الأولى - 1415 هـ، 1494 م

47. شعب الإيمان ، أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (المتوفى: 458هـ) الناشر: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض الطبعة: الأولى، 1423 هـ - 2003 م
48. صفة الصفوة، جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفى: 597هـ) المحقق: أحمد بن علي، الناشر: دار الحديث، القاهرة، مصر، الطبعة: 1421هـ/2000م
49. طرح التثريب في شرح التقريب (المقصود بالتقريب: تقريب الأسانيد وترتيب المسانيد)، المؤلف: أبو الفضل زين الدين عبد الرحيم بن الحسين بن عبد الرحمن بن أبي بكر بن إبراهيم العراقي (المتوفى: 806هـ)، أكمله ابنه: أحمد بن عبد الرحيم بن الحسين الكردي الرازياني ثم المصري، أبو زرعة ولي الدين، ابن العراقي (المتوفى: 826هـ) الناشر: الطبعة المصرية القديمة
50. الطريقة المحمدية والسيرة الأحمدية، محمد بن بير على البركوي (المتوفي981ه)، المكتبة الحقانية بشاور باكستان.
51. عمدة القاري شرح صحيح البخاري، محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى العينى (المتوفى: 855هـ) الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت
52. الفتاوى الهندية المؤلف: لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي الناشر: مكتبة حقانيه، بشاور
53. فتح الباري شرح صحيح البخاري، أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي الناشر: دار المعرفة - بيروت، 1379

54. فتح القدير،كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (المتوفى: 861هـ) الناشر: دار الفكر
55. الفردوس بمأثور الخطاب، شيرويه بن شهردار الديلميّ الهمذاني (المتوفى: 509هـ) الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت، الطبعة: الأولى، 1406 هـ - 1986م
56. الفرقان بين أولياء الرحمن وأولياء الشيطان،المؤلف: تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن عبد السلام بن عبد الله بن أبي القاسم بن محمد ابن تيمية الحراني الحنبلي الدمشقي (المتوفى: 728هـ) حققه وخرج أحاديثه: عبد القادر الأرناؤوط، الناشر: مكتبة دار البيان، دمشق، عام النشر: 1405 هـ - 1985 م
57. الفروع ومعه تصحيح الفروع لعلاء الدين علي بن سليمان المرداوي، محمد بن مفلح المقدسي (المتوفى: 763هـ) الناشر: مؤسسة الرسالة الطبعة: الأولى 1424 هـ - 2003 م
58. الفروق = أنوار البروق في أنواء الفروق، أحمد بن إدريس الشهير بالقرافي (المتوفى: 684هـ) الناشر: عالم الكتب الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ
59. الفصل في الملل والأهواء والنحل، المؤلف: أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي القرطبي الظاهري (المتوفى: 456هـ) الناشر: مكتبة الخانجي – القاهرة
60. فيض القدير شرح الجامع الصغير ،عبد الرؤوف بن تاج العارفين المناوي (المتوفى: 1031هـ) الناشر: المكتبة التجارية الكبرى – مصر الطبعة: الأولى، 1356

61. كتاب التعريفات، المؤلف: علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (المتوفى: 816هـ) الناشر: دار الكتب العلمية بيروت –لبنان، الطبعة: الأولى 1403هـ -1983م
62. كتاب العين، المؤلف:أبو عبد الرحمن الخليل بن أحمد بن عمرو الفراهيدي البصري(المتوفى: 170هـ) المحقق: د مهدي المخزومي، د إبراهيم السامرائي، الناشر: دار ومكتبة الهلال
63. الكليات معجم في المصطلحات والفروق اللغوية، أيوب بن موسى الحسيني القريمي الكفوي، أبو البقاء الحنفي (المتوفى: 1094هـ) المحقق: عدنان درويش - محمد المصري، الناشر: مؤسسة الرسالة – بيروت
64. كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، علي بن حسام الدين الشهير بالمتقي الهندي (المتوفى: 975هـ)الناشر: مؤسسة الرسالة، الطبعة: الطبعة الخامسة، 1401هـ/1981م
65. الكنز الأكبر من الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، عبدالرحمن بن أبي بكر الدمشقي الصالحي الحنبلي(856ه)، دارالكتب العلمية- بيروت
66. لسان العرب، المؤلف: محمد بن مكرم بن على، أبو الفضل، جمال الدين ابن منظور الأنصاري الرويفعى الإفريقى (المتوفى: 711هـ) الناشر: دار صادر – بيروت، الطبعة: الثالثة - 1414 هـ
67. لوامع الأنوار البهية وسواطع الأسرار الأثرية لشرح الدرة المضية في عقد الفرقة المرضية، محمد بن أحمد بن سالم السفاريني الحنبلي (المتوفى: 1188هـ) الناشر: مؤسسة

الخافقين ومكتبتها – دمشق الطبعة: الثانية - 1402 هـ - 1982 م

68. مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (المتوفى: 807هـ) الناشر: مكتبة القدسي، القاهرة عام النشر: 1414 هـ، 1994 م

69. محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي ، الناشر: دار طوق النجاة (مصورة عن السلطانية بإضافة ترقيم ترقيم محمد فؤاد عبد الباقي) الطبعة: الأولى، 1422هـ

70. المحيط البرهاني في الفقه النعماني فقه الإمام أبي حنيفة ، محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري (المتوفى: 616هـ) الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان الطبعة: الأولى، 1424 هـ - 2004 م

71. المدخل، أبو عبد الله محمد بن محمد بن محمد العبدري الفاسي المالكي الشهير بابن الحاج (المتوفى: 737هـ) الناشر: دار التراث

72. مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، علي بن (سلطان) محمد الملا الهروي القاري (المتوفى: 1014هـ) الناشر: دار الفكر، بيروت – لبنان الطبعة: الأولى، 1422هـ - 2002م

73. المستدرك على الصحيحين، محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع الحاكم (المتوفى: 405هـ) الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت الطبعة: الأولى، 1411 – 1990

74. مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار، أحمد بن عمرو المعروف بالبزار (المتوفى: 292 الناشر: مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة، الطبعة: الأولى، (بدأت 1988م، وانتهت 2009م

75. المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله ﷺ، مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت
76. معجم مقاييس اللغة، أحمد بن فارس بن زكرياء القزويني الرازي، أبو الحسين (المتوفى: 395هـ) المحقق: عبد السلام محمد هارون، الناشر: دار الفكر، عام النشر: 1399هـ - 1979م
77. المغني عن حمل الأسفار في الأسفار، في تخريج ما في الإحياء من الأخبار، عبد الرحيم بن الحسين العراقي (المتوفى: 806هـ) الناشر: دار ابن حزم، بيروت – لبنان الطبعة: الأولى، 1426 هـ - 2005 م
78. مفاتيح الغيب = التفسير الكبير، محمد بن عمر الملقب بفخر الدين الرازي خطيب الري (المتوفى: 606هـ) الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت الطبعة: الثالثة - 1420 هـ
79. منازل السائرين،المؤلف: أبو إسماعيل عبد الله بن محمد بن علي الأنصاري الهروي (المتوفى: 481هـ) الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت
80. النهاية في غريب الحديث والأثر، المبارك بن محمد ابن الأثير (المتوفى: 606هـ) الناشر: المكتبة العلمية - بيروت، 1399هـ - 1979م
81. النهاية في غريب الحديث والأثر، المؤلف: مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد بن محمد بن محمد الشيباني الجزري ابن الأثير (المتوفى: 606هـ) الناشر: المكتبة العلمية - بيروت، 1399هـ - 1979م

82. الهداية في شرح بداية المبتدي،علي بن أبي بكر المرغيناني، (المتوفى: 593هـ)الناشر: دار احياء التراث العربي - بيروت – لبنان

83. كتاب المصنف في الأحاديث والآثار، أبو بكر بن أبي شيبة، (المتوفى: 235هـ) الناشر: مكتبة الرشد – الرياض، الطبعة: الأولى، 1409

84. الإحكام في أُصول الأحكام علي بن أبي علي بن محمد الآمدي (المتوفى: 631هـ) الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- لبنان

85. مسند الإمام أحمد بن حنبل، أحمد بن محمد بن حنبل (المتوفى: 241هـ) الناشر: مؤسسة الرسالة الطبعة: الأولى، 1421 هـ - 2001 م

86. صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان،محمد بن حبان (المتوفى: 354هـ) الناشر: مؤسسة الرسالة – بيروت الطبعة: الثانية، 1414 – 1993

87. المعجم الأوسط، سليمان بن أحمد الطبراني (المتوفى: 360هـ) الناشر: دار الحرمين - القاهرة

88. المعجم الكبير، سليمان بن أحمد بن أيوب الطبراني (المتوفى: 360هـ) دار النشر: مكتبة ابن تيمية – القاهرة الطبعة: الثانية

89. المخصص، أبو الحسن علي بن إسماعيل بن سيده المرسي (المتوفى: 458هـ) المحقق: خليل إبراهم جفال، الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت، الطبعة: الأولى، 1417هـ 1996م

90. المبسوط، محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (المتوفى: 483هـ) الناشر: دار المعرفة – بيروت الطبعة: بدون طبعة تاريخ النشر: 1414هـ-1993م
91. الوسيط في المذهب ، محمد بن محمد الغزالي الطوسي (المتوفى: 505هـ) الناشر: دار السلام – القاهرة الطبعة: الأولى، 1417
92. أحكام القرآن، محمد بن عبد الله ابن العربي (المتوفى: 543هـ) الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان، الطبعة: الثالثة، 1424 هـ - 2003 م
93. روضة الطالبين وعمدة المفتين، يحيى بن شرف النووي (المتوفى: 676هـ) الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- عمان الطبعة: الثالثة، 1412هـ / 1991م
94. نصاب الاحتساب، عمر بن محمد بن عوض السَّنَامي الحنفي (المتوفى: 734هـ) مكتبة الطالب الجامعي
95. شرح الزركشي، محمد بن عبد الله الزركشي (المتوفى: 772هـ) الناشر: دار العبيكان الطبعة: الأولى، 1413 هـ - 1993 م
96. تفسير القرآن العظيم، إسماعيل بن عمر بن كثير (المتوفى: 774هـ) الناشر: دار طيبة للنشر والتوزيع الطبعة: الثانية 1420هـ - 1999 م
97. الموافقات، إبراهيم بن موسى بن محمد الشهير بالشاطبي (المتوفى: 790هـ) الناشر: دار ابن عفان، الطبعة الأولى 1417هـ/ 1997م
98. كشاف القناع عن متن الإقناع منصور بن يونس البهوتى(المتوفى: 1051هـ) الناشر: دار الكتب العلمية

99. الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت الطبعة: الأولى، 1415 ه

100. الكنز الأكبر فى الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر

101. دينى مدارس كانظام تعليم وتربيت(افادات: حضرت مولانا يوسف بنورى صاحب رحمۃ الله عليہ

102. تذكره عاشق رسول حاجى محمد امين صاحب (تاليف: جناب تحسين الله صاحب)